ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار:

ریحانہ شاہین

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۰ء

ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کا تقابلی مطالعہ

مقالہ نگار:

ریحانہ شاہین

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالے کو پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کا تقابلی مطالعہ

پیش کار : ریحانہ شاہین **رجسٹریشن نمبر:**1326/M/U/S17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اُردو

ڈاکٹر محمود الحسن

_____

نگران مقالہ

ڈاکٹر ارشاد بیگم

_____

شریک نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود

_____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈئر محمد بدر ملک

_____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ

_____

اقرارنامہ

میں، ریحانہ شاہین حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن رانا اور ڈاکٹر ارشاد بیگم کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

ریحانہ شاہین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۰ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرستِ ابواب	v
مقالے کا دائرہ کار	ix
Abstract	x
اظہارِ تشکر	xi
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۱
iii۔ مقاصد تحقیق	۲
iv۔ تحقیقی سوالات	۲
v۔ نظری دائرہ کار	۲
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۳
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۳
viii۔ تحدید	۳
ix۔ پس منظری مطالعہ	۴

x۔ تحقیق کی اہمیت ۴

ب۔ عصری شعور: بنیادی مباحث ۴

ج۔ اردو آپ بیتی میں عصری شعور کی روایت ۷

د۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی ادبی خدمات: مختصر تعارف ۶۴

حوالہ جات ۷۴

باب دوم: ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور: سماجی تناظرات ۷۸

الف۔ ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" میں عصری شعور کے سماجی تناظرات ۸۰

i۔ سماجی روایت و اقدار کا تناظر ۸۱

ii۔ نجی و عائلی تناظرات ۹۶

iii۔ مذہبی و معاشی تناظرات ۹۸

ب۔ کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں عصری شعور کے سماجی تناظرات ۱۰۰

i۔ سماجی روایت و اقدار کا تناظر ۱۰۰

ii۔ نجی و عائلی تناظرات ۱۰۸

iii۔ مذہبی و معاشی تناظرات ۱۱۰

ج۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے سماجی تناظرات کا تقابل ۱۱۴

i۔ اشتراکات ۱۱۴

ii۔ افتراقات ۱۱۹

حوالہ جات ۱۲۵

باب سوم: ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور: سیاسی تناظرات ۱۲۸

الف۔ ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" میں عصری شعور کے سیاسی تناظرات ۱۳۰

i۔ سیاسی نظریات و افکار ۱۳۰

ii۔ مفاہمت و مزاحمت کے رویے ۱۳۲

iii۔ سیاسی حالات و ماحول پر اظہارات ۱۳۴

ب۔ کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں عصری شعور کے سیاسی تناظرات ۱۴۹

i۔ سیاسی نظریات و افکار ۱۴۹

ii۔ مفاہمت و مزاحمت کے رویے ۱۵۰

iii۔ سیاسی حالات و ماحول پر اظہارات ۱۵۱

ج۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور سیاسی تناظرات کا تقابل ۱۵۶

i۔ اشتراکات ۱۵۶

ii۔ افتراقات ۱۵۹

حوالہ جات ۱۶۲

باب چہارم: ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور: ادبی تناظرات ۱۶۵

الف۔ ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" میں عصری شعور کے ادبی تناظرات ۱۶۶

i۔ قیام پاکستان سے پہلے کا ادبی منظر نامہ ۱۶۶

ii۔ قیام پاکستان کے بعد کا ادبی منظر نامہ ۱۷۴

iii۔ بین الاقوامی ادبی منظر نامہ ۱۷۹

ب۔ کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں عصری شعور کے ادبی تناظرات ۱۸۲

i۔ قیام پاکستان سے قبل کا ادبی منظر نامہ ۱۸۳

ii۔ قیام پاکستان کے بعد کا ادبی منظر نامہ ۱۸۸

iii۔ بین الاقوامی ادبی منظر نامہ ۱۹۱

ج۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے ادبی تناظرات کا تقابل ۱۹۳

i۔ اشتراکات ۱۹۳

ii۔ افتراقات ۱۹۵

حوالہ جات ۱۹۹

باب پنجم: مجموعی جائزہ ۲۰۲

i۔ نتائج ۲۱۰

ii۔ سفارشات ۲۱۲

کتابیات ۲۱۴

مقالے کا دائرہ کار

آپ بیتی ایک نہایت اہم صنف نثر ہے جسے آپ بیتی نگار کے عصری شعور کی بدولت اکثر جگ بیتی میں بدلتا دیکھا گیا ہے۔ اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیاں "جو رہی سو بے خبری رہی" اور "بری عورت کی کتھا" بھی ایسی ہی دو آپ بیتیاں ہیں جو آپ بیتی نگار کے عصری شعور کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور ادبی صورتحال کا پتہ دیتی یہ آپ بیتیاں اپنے عہد کے عصری شعور کی مکمل آئینہ دار ہیں۔

یہ مقالہ اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے تقابل پر مشتمل ہے جسے پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب "موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث" ہے۔ اس باب میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آپ بیتی کسے کہتے ہیں؟ عصر اور عصری شعور سے کیا مراد ہے؟ اس کے علاوہ اس باب میں اداجعفری اور کشور ناہید کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا باب اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے سماجی تناظرات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ سماج سے کیا مراد ہے؟ سماجی شعور کسے کہتے ہیں؟ اس کے علاوہ اس باب میں اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں سماجی شعور کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے مابین اشتراکات وافتراقات کا تعین کیا گیا ہے۔

تیسرا باب اداجعفری اور کشور ناہید کی سیاست میں گہری دلچسپی اور ان کے سیاسی شعور سے بحث کرتا ہے۔ اس باب میں اداجعفری اور کشور ناہید کے سیاسی شعور کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے مابین اشتراکات وافتراقات کا تعین کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں دونوں مصنفات کی آپ بیتیوں میں ادبی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا تعین کیا گیا ہے کہ ان دونوں کے مابین کیا اشتراکات وافتراقات پائے جاتے ہیں؟ پانچواں اور آخری باب مجموعی جائزے، نتائج اور سفارشات پر مشتمل ہے اس باب میں ابتدائی چار ابواب کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔

Abstract

Autobiography is very important genre of prose and sometimes contemporary wisdom of the autobiographer transforms it into the biography of the masses. Ada Jafri and Kishwar Naheed's autobiographies " jo rahi so bekhabri rahi" and " buri aurat ki katha" are two examples of such autobiographies that prove contemporary wisdom of the autobiographer. Finding out the social, political and literary situation of era, these autobiographies are a complete mirror of the contemporary wisdom of their era.

This study is a comparison of contemporary wisdom of in the autobiographies of Ada Jafri and Kishwar Naheed, and it is divided into five chapters.The first chapter is "Introduction to the Subject and Basic Discussions".This chapter sheds light on, what is an autobiography? what is meant by modern and contemporary consciousness? In addition, a brief introduction of Adaj Jafri and Kishwar Naheed is given in this chapter.

The second chapter contains the social perspectives of contemporary consciousness in the autobiographies of Ada jafri and Kishwar Naheed. This chapter sheds light on what is meant by society and what is social consciousness?In addition, this chapter examines the social consciousness of Ada Jafri and Kishwar Naheed in their autobiographies and determines the commonalities and differences between them.

Third chapter discusses Ada jafri and Kishwar Naheed's deep interest in politics and their political consciousness. In this chapter, while reviewing the political consciousness of Adaj Jafri and Kishwar Naheed, the commonalities and differences between them have been determined. Fourth chapter examines the literary situation in the autobiographies of the two authors and determines the commonalities and differences between the two. The fifth and final chapter contains an overview, findings and recommendations. First four chapters are summarized in this chapter.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے مجھے اس مقام تک پہنچایا اور اتنی ہمت عطا کی کہ میں کئی مشکلات کے باوجود اپنا کام نمٹانے میں کامیاب رہی۔ میں اپنے والدین کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے خود مشقت برداشت کی اور مجھے یہ مقام دلایا خصوصاً اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے پر سکون ماحول فراہم کیا۔ کامیابی کے اس موقعہ پر میں اپنی ایف۔ اے کی اردو کلاس ٹیچر میم میمونہ زینب اور اپنی بڑی بہن کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے مجھے اُردو زبان و ادب میں خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ بالخصوص اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر محمود الحسن اور معاون نگران ڈاکٹر ارشاد بیگم کی انتہائی شکر گزار ہوں جن کے دستِ شفقت کے زیرِ سایہ یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

ریحانہ شاہین

اسکالر ایم۔ فل اردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

مجوزہ مقالہ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں "جو رہی سو بے خبری رہی" اور "بری عورت کی کتھا" میں عصری شعور کے تقابلی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ادا جعفری اور کشور ناہید کو عصری حالات و واقعات سے کس حد تک واقفیت تھی؟ ان دونوں شخصیات نے اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور ادبی صورتحال کو کس انداز سے دیکھا، محسوس کیا اور معاصر صورتحال کی عکاسی کے حوالے سے ان کی آپ بیتیوں میں کیا اشتراکات و افتراقات پائے جاتے ہیں۔ اس مقالے میں دونوں آپ بیتیوں پر معاصر میلانات و رجحانات کے اثرات دیکھتے ہوئے ان کے مابین اشتراکات و افتراقات کا تعین کیا گیا ہے۔

ii۔ بیانِ مسئلہ

ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" اور کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" کو اُردو آپ بیتی کی روایت میں نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ ادا جعفری اور کشور ناہید نے ان آپ بیتیوں میں عصری مسائل پر اپنے اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی۔ مجوزہ مقالہ میں ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی اور ادبی شعور کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں عصری پس منظر میں پرکھا گیا اور اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ ان دونوں آپ بیتیوں میں عصری زندگی کو کس حد تک اور کس انداز میں پیش کیا گیا؟ دونوں آپ بیتی نگار اپنے عہد کے سیاسی و سماجی امور کا کتنا ادراک رکھتی تھیں؟ دونوں آپ بیتی نگاروں نے حقیقی زندگی کے کن مسائل کو اجاگر کیا؟ ہم عصر ادب کے متعلق ان کا نظریہ یا موقف کیا تھا؟ اس کے علاوہ اس مقالے میں اس بات کا جائزہ لیا

گیاہے کہ معاصر زندگی کی پیشکش کے حوالے سے دونوں آپ بیتیوں کے مابین کون سی قدریں مشترک اور کون سی قدریں مختلف ہیں؟

iii۔ مقاصد تحقیق

اس مقالے کے مقاصد تحقیق درج ذیل ہیں:

۱۔ عصر اور عصری شعور کا جائزہ لینا

۲۔ اُردو آپ بیتی میں عصری شعور کی روایت بیان کرنا

۳۔ کشور ناہید کی آپ بیتی میں ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کی صورتحال کا جائزہ لینا

۴۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے حوالے سے اشتراکات وافتراقات کا تعین کرنا

iv۔ تحقیقی سوالات

اس تحقیق کے دوران درج ذیل سوالات میرے پیش نظر رہے:

۱۔ عصر اور عصری شعور کا جائزہ لینا

۲۔ اُردو آپ بیتی میں عصری شعور کی کیا روایت ہے؟

۳۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کی کیا صورتحال ہے؟

۴۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے حوالے سے کیا اشتراکات وافتراقات پائے جاتے ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار

آپ بیتی صرف فردِ واحد کی کہانی نہیں بلکہ آپ بیتی میں سیاسی، سماجی اور معاشی و معاشرتی منظر نامہ، پس منظر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ان تمام ہستیوں کا ذکر بھی ہوتا ہے جن سے آپ بیتی نگار کا واسطہ تعلق رہا ہو۔ ادا جعفری اور کشور ناہید آپ بیتی کی روایت میں دو اہم نام ہیں۔ اس مقالے میں ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا تعین کیا گیا ہے کہ ان کے عہد کی سماجی صورتحال کیا تھی؟ ادبی رویے کیا تھے؟ سیاسی حالات و واقعات کیسے تھے؟ نجی و عائلی زندگی میں دونوں آپ بیتی نگاروں کو کن حالات و واقعات کا

سامنا کرنا پڑا؟ معاصر سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی کو دونوں آپ بیتی نگاروں نے کس حد تک اور کس انداز میں اپنی اپنی آپ بیتی میں سمویا؟ یہ مقالہ اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے تقابلی جائزے پر مشتمل ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

اس تحقیق کے لیے دستاویزی اور تجزیاتی طریقہ کار اختیار کیا گیا جس کے لیے بنیادی ماخذات کے طور پر آپ بیتیوں کے ذخیرے سے رجوع کیا گیا جبکہ ثانوی ماخذات کے طور پر تحقیقی و تنقیدی کتب، مختلف مضامین، رسائل و جرائد اور ویب سائٹس وغیرہ سے مدد لی گئی ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

اس موضوع پر فی الحال اس سے قبل کوئی تحقیق نہیں ہوئی تاہم اداجعفری اور کشور ناہید پر درج ذیل عنوانات کے تحت کام ہو چکا ہے۔

۱۔ اداجعفری: شخصیت اور شاعری، بشریٰ باسط، ایم اے اُردو، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۱ء

۲۔ کشور ناہید: شخصیت اور فن، محمد افضل، ایم اے اُردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۸ء

۳۔ اُردو کی آپ بیتیوں "بُری عورت کی کتھا" (کشور ناہید) اور "ہم سفر" (حمید اختر رائے پوری) کا تجزیاتی مطالعہ، نادیہ فریال، ایم اے اُردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۰ء

۴۔ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر کی شاعری میں عورت کا شعورِ ذات، شہناز پروین، ایم فل اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۴ء

۵۔ اُردو ادب کی آپ بیتیاں: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، اطہر قسیم، پی ایچ ڈی، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

viii۔ تحدید

اداجعفری اور کشور ناہید نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں بھی اہم خدمات انجام دیں لیکن زیرِ نظر مقالے کا دائرہ تحقیق صرف ان کی دو آپ بیتیوں "جو رہی سو بے خبری رہی" اور "بری عورت کی کتھا"

میں عصری شعور کے تقابلی جائزے تک محدود ہے۔اس مقالے میں آپ بیتی کے فن وروایت پر بات کرتے ہوئے ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کی عکاسی کے حوالے سے ان کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر ادا جعفری اور کشور ناہید پر پہلے سے تحریر کی گئی تحقیقی و تنقیدی کتب سے استفادہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس سلسلے میں لکھے گئے مضامین، تبصرے اور تجزیے بھی پیش نظر رکھے گئے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت

اس مقالے میں دونوں خواتین آپ بیتی نگاروں کی نجی و عائلی زندگی سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے ان کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس طرح نہ صرف ادا جعفری اور کشور ناہید کی زندگی اور ادب سے تعارف ممکن ہوا بلکہ ایک خاص عہد کو سمجھنے میں بھی مدد ملی۔اس مقالہ سے اُردو ادب میں ان کے صحیح مقام و مرتبے کا تعین ہوا اور ان کی تخلیقی شخصیت کی بازیافت ممکن ہوئی۔اس مقالے کی اہمیت اس طرح بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں آپ بیتی میں عصری شعور کی روایت بیان کرتے ہوئے مختلف آپ بیتیوں پر ان کے ہم عصر سیاسی، سماجی اور ادبی صورتحال کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔اس کے علاوہ تہذیبی رجحانات و میلانات، اہم تحریکات، مذہبی صورتحال اور ادبی روایت جیسے موضوعات اس مقالے کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔

ب۔ عصری شعور: بنیادی مباحث

عصری شعور (Contemporary Consciousness) کی اصطلاح جس کے لیے "عصری آگہی" اور "عصری حسیت" کا لفظ بھی مستعمل ہے دو مختلف الفاظ "عصر" اور "شعور" سے مل کر وجود میں آئی ہے۔ "عصر" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی وقت، عہد، زمانہ یا دور کے ہیں انگریزی میں اس کے لیے Contemporary کا لفظ مستعمل ہے جس سے مراد وقت یا زمانے کا ایک مخصوص دورانیہ لیا جاتا ہے جبکہ "شعور" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لیے انگریزی زبان میں Consciousness کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے لغوی معنی معلومات،

شناخت، ہوشیاری، دانائی، عقل، سمجھ بوجھ، پرکھ کے ہیں۔ اصطلاح میں شعور سے مراد کسی چیز کے بارے میں عقل و فہم رکھنا اور کسی کام کو انجام دینے کا سلیقہ مراد لیا جاتا ہے۔ عصر اور شعور کے ملنے سے عصری شعور کی ایک نئی اصطلاح سامنے آئی جس سے مراد یہ ہے کہ کوئی فرد اپنے دور کے بارے میں کتنی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ المختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی اپنے گردوپیش کے حالات وواقعات سے واقفیت اس کا عصری شعور کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد امجد عابد لکھتے ہیں: ''عصری شعور سے مراد کسی بھی عہد، زمانے یا وقت کی مختلف حالتوں کے بارے میں مکمل آگاہی اور علم رکھنا ہے۔''(۱) شعور ایک بہت بڑا اور بہت سنجیدہ عالمگیر موضوع ہے اور جب ہم اسے کسی عصر پر پھیلا کر دیکھنا یا سمجھنا چاہتے ہیں تو ان دونوں کی وسعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہر انسان کسی نہ کسی حد تک عصری شعور ضرور رکھتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان ہی کا عصری شعور وسیع اور ہمہ گیر ہو۔ یہ عصری شعور وسیع اور ہمہ گیر بھی ہو سکتا ہے اور محدود بھی۔

ادب اور عصر کا تعلق

اس بات سے تو خیر انکار ممکن ہی نہیں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ ادب اور عصر کے مابین ایک گہرا تعلق استوار ہے یہ تعلق نہایت مضبوط اور صدیوں پرانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان بیک وقت دو دنیاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جس دنیا میں رہتا ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے داخلی دنیا اور خارجی دنیا۔ داخلی دنیا سے مراد انسان کے اندر کی دنیا ہے انسان کی نفسیات، خواہشات اور تجربات ومشاہدات وغیرہ۔ نفرت، محبت، خوشی، غم، خوف، امید اور رشک جیسے تمام جذبات کا تعلق انسان کی داخلی دنیا سے ہے۔ جبکہ خارجی دنیا سے مراد انسان کے باہر کی دنیا، اس کے آس پاس پھیلی اردگرد کی دنیا۔ انسان کی داخلی دنیا کی طرح خارجی دنیا بھی نہایت رنگارنگ اور بے شمار مظاہر کی حامل ہے۔ ہر وہ چیز جس کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور جسے انسانی آنکھ دیکھ اور محسوس کر سکتی ہے اس زمرے میں آتی ہے۔ انسان ایک ایسا معاشرتی حیوان ہے جو اپنے اردگرد سے کسی نہ کسی حد تک واقفیت ضرور رکھتا ہے۔ اس کی طرف سے ہر عمل پر ایک اچھا یا برا ردعمل دیکھنے کو ضرور ملتا ہے، ردعمل کا یہ اظہار کسی بھی صورت ہو سکتا ہے۔ ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد کے ہاں یہ ردعمل تحریری شکل میں شعوری اور لاشعوری طور پر ادب کا حصہ بنتا چلا آیا ہے۔ ادب میں قلم سے داخلی احساسات کے ساتھ ساتھ خارجی حالات وواقعات کی عکاسی کی روایت بہت پرانی ہے۔ انسان کی اپنے اردگرد کے حالات واقعات سے یہی آگاہی اس کا عصری شعور کہلاتا ہے۔

ادب اور عصر میں تعلق اس لیے بھی مضبوط ہو جاتا ہے کہ ادب کے لیے موضوع کے تعین کے سلسلے میں ہم عصر رجحانات اور رویوں کو ضرور مد نظر رکھا جاتا ہے اور یہ تعلق اس لیے بھی پائیدار ہے کہ عصری مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کے لیے ادب ایک نہایت اہم اور موثر ذریعہ اظہار ہے۔ عصری شعور تخلیق کار شتہ عہد سے جوڑتے ہوئے ادب اور زندگی کے تصور کو گہرا اور واضح کرتا ہے۔ ادب میں عصری شعور کا ظہور ایک ایسی طاقت ہے جس سے ادب میں قارئین کی دلچسپی کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ یا دور کے ادب ہی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کے رہنے والے کیسے تھے، ان کی روایت و اقدار کیا تھیں؟ ان کی سماجی زندگی کیسی تھی اور ان کے مذہبی رجحانات کیا تھے؟ مغربی ادب کے زیرِ اثر اُردو ادب میں عصری حالات کی عکاسی کا آغاز تو خیر بہت پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن ۱۹۳۵ء میں وجود میں آنے والی ترقی پسند تحریک نے "ادب برائے ادب" کے بجائے "ادب برائے زندگی" کا نعرہ لگا کر ادب اور عصر کے اس تعلق کو اور بھی مضبوط کیا یوں منظر عام پہ آنے والا ادب عصری شعور کا بہترین مظہر بن کے ابھرا۔

آپ بیتی / خود نوشت سوانح

آپ بیتی کے لیے انگریزی میں "Autobiography" کا لفظ مستعمل ہے جبکہ اُردو میں اسے آپ بیتی کے علاوہ خود نوشت سوانح عمری کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح دراصل دو الفاظ "آپ" اور "بیتی" سے مل کر سامنے آئی ہے۔ آپ بیتی یعنی جو خود اپنی ذات پر بیتی ہو اپنی ذات پہ گزری ہو۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں آپ بیتی کی تعریف کچھ یوں درج ہے: "The story of one's life, written by himself" ترجمہ: "کسی شخص کی زندگی کی کہانی خود اس کی لکھی ہوئی ہو۔" [۲] بذریعہ تحریر ماضی میں جھانکنے اور ذاتی زندگی کی یادیں تازہ کر کے اپنے عہد کو دوبارہ زندہ کرنے کا نام آپ بیتی ہے۔ آپ بیتی فرد واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر مشتمل ایک ایسی صنفِ ادب ہے جو خود اسی کے قلم سے وجود میں آئی ہو۔ کسی شخص کا خود اپنی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات کو عصری تناظر میں تحریر کی شکل دینا آپ بیتی کہلاتا ہے۔ محمد طفیل کے مطابق:

> مختصر لفظوں میں آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات مشاہدات محسوسات و نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم و کاست قلم بند کر دی ہو۔ جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاخانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں۔ [۳]

آپ بیتی ایک بیانیہ اور نیم تخلیقی صنفِ ادب ہے جس کا موضوع انسان اور انسانی زندگی ہے اس میں فرد واحد کی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ اس فرد سے وابستہ دیگر افراد کا ذکر ہوتا ضرور ہے تاہم یہ ذکر معروضی اور ضمنی نوعیت کا ہوتا ہے۔ آپ بیتی کا شمار یوں تو سوانحی ادب میں ہی ہوتا ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو ان دونوں میں حدِ امتیاز قائم کرتی ہیں۔ اگر کوئی کسی دوسرے شخص کی زندگی کی کہانی لکھے تو یہ سوانح کہلاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص خود اپنی زندگی کی کہانی رقم کرے تو اسے آپ بیتی کہتے ہیں۔ سوانح عمری کا دائرہ کار پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے، اس میں زندگی کو لہد سے مہد تک بیان کیا جاتا ہے جبکہ آپ بیتی زندگی کے اہم ادوار کے خاص واقعات پر مشتمل ہوتی ہے، یہ زندگی کے ایک خاص حصے کے متعلق بھی ہو سکتی ہے اور پوری زندگی کی داستان بھی۔ سوانح عمری خارجی و عملی زندگی کا منظر نامہ پیش کرتی ہے جبکہ آپ بیتی ان دونوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے اور اس میں زیادہ دخل جذبات و کیفیات کو ہوتا ہے۔ ان میں ایک فرق یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سوانح نگار، صاحبِ سوانح کی زندگی کے بارے میں مختلف ذرائع سے دستیاب معلومات کو ایک گلدستہ عقیدت میں پرو کر پیش کرتا ہے چنانچہ سوانح میں وہ بے باک انداز دیکھنے کو نہیں ملتا جو آپ بیتی کا خاصہ ہے۔ آپ بیتی میں شباب کی نادانیوں، حرکتوں پشیمانیوں، کامیابیوں ناکامیوں، دیگر شخصیات اور ان سے تعلق کی نوعیت، زندگی کے نشیب و فراز، تجربات کا نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے اپنی ذات کے محاسبے اور تزکیہ نفس یا کتھارسس کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے آپ بیتی کو ایک بتِ ہزار شیوہ قرار دیا ہے جس کے ہر رنگ میں سو رنگ پنہاں ہیں۔ ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے آپ بیتی متنوع اوصاف کی حامل ایک ایسی صنف ہے جو بیک وقت کئی پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بیک وقت تاریخی و ادبی حیثیت کی حامل یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں داخلی دنیا کے سوتے خارجی دنیا سے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔

ج۔ اردو آپ بیتی میں عصری شعور کی روایت

آپ بیتی دراصل جگ بیتی ہی کا دوسرا نام ہے جس میں آپ بیتی نگار کا عہد اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ آپ بیتی نہ صرف آپ بیتی نگار کی نفسیات کی آئینہ دار ہوتی ہے بلکہ اس میں اس کا عہد بھی جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی لکھتے ہیں:

خود نوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فردِ واحد کی زندگی کے ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اس کے قلم کی رہنِ منت ہوتی ہے جس کے آئینے میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ (۴)

آپ بیتی صرف ذاتی زندگی کی کہانی ہی کا نام نہیں کوئی بھی شخص اپنے عصر سے کٹ کے نہیں رہ سکتا۔ فرد کا تعلق خواہ کسی بھی معاشرے یا کسی بھی طبقے سے ہو وہ اپنے عہد کے اہم واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فرد سماج ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے، اس کی تربیت اور ذہنی و فکری رجحانات کی تشکیل میں سماج اہم کردار ادا کرتا ہے اور سماجی پس منظر کے بغیر فرد کو سمجھنے کی کوشش بے کار ہے۔ ایک انسان جس ماحول میں اٹھتا بیٹھتا ہے، اسے جن افراد، اداروں اور تحریکوں سے واسطہ پڑتا ہے یا جن سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی اور تہذیبی حالات کا سامنا ہوتا ہے وہ سب اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ہر آپ بیتی نگار نے اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر کے اپنے بہترین عصری شعور کا ثبوت دیا۔

عبدالمجید قریشی کے مطابق: "آپ بیتی کے روپ میں ایک دور کی ہماہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔"(۵) آپ بیتی دراصل تاریخ، تہذیب، سیاست، نفسیات اور عمرانیات جیسے متنوع رنگوں سے مزین ایک ایسی دلچسپ اور رنگارنگ صنفِ ادب ہے جس میں آپ بیتی نگار ذاتی زندگی کے کوائف تو بیان کرتا ہی ہے ساتھ خارجی حالات و واقعات بھی آپ بیتی کا جزو بنتے چلے جاتے ہیں۔ یوں آپ بیتی اپنے زمانے کے معاشی و معاشرتی، ادبی، سیاسی اور سماجی عناصر کا بہترین مرقع ثابت ہوتی ہے۔ بقول علیم الدین سالکؔ:

ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے، اس کے بنیادی خدوخال تو صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی چیزیں ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نشاندہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں۔ ہمیں ان کے لیے آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا ہو گا کیونکہ ان کی مدد سے ہم ایک قوم ایک ملت اور ملک کی تہذیب کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ (۶)

آپ بیتی محض آپ بیتی نگار کے بچپن، جوانی یا بڑھاپے کی داستان نہیں بلکہ یہ ہر دور کا پتہ دیتی چلی آئی

ہے۔ یہ تاریخ کے لیے مہیا کردہ عہد کی جھلکیاں ہی ہیں جو آپ بیتی کو تقویت دیتے ہوئے اسے دوام بخشتی ہیں۔ اردو آپ بیتی میں عصری شعور کی پیشکش کا سلسلہ ابتدا ہی سے چلا آرہا ہے دراصل اردو آپ بیتی کی ابتدا ہی ایسے پر آشوب دور میں ہوئی کہ آپ بیتی نگار گردوپیش کے حالات وواقعات سے دامن نہ بچا سکا۔ اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا تقریباً ہر دور کے آپ بیتی نگار نے ہم عصر سماجی حقائق اور معاشرہ کے کرب کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو آپ بیتی کی روایت پر نظر دوڑائیں تو یہ اپنے انسانی تاریخ و تہذیب کے تمام ادوار سمیٹے دکھائی دیتی ہے۔ ملک کے سیاسی حالات وواقعات اور سماجی نوعیت کے خالص عوامی مسائل کی ایک طویل فہرست ہے جو ان آپ بیتیوں میں پیش کی گئی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی آپ بیتیوں میں مغلوں کے عروج وزوال، دو عظیم جنگوں اور انقلابِ روس سے معاشی سطح پر رونما ہونے والی تمام تبدیلیوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جہاں مغلیہ نظام کی جگہ برطانوی راج لے چکا تھا اور سانحہ غدر عوام کے دل ودماغ پر گہرے نقوش مرتب کر چکا تھا۔ اس دور کی آپ بیتیوں میں مغلیہ نظام کے خاتمے کو پیش کرتے ہوئے دلی کی تباہی وبربادی کی داستان رقم کی گئی ہے۔ ان آپ بیتیوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں اور اس جنگ کے اثرات بھی۔ خصوصاً جنگ کے بعد انگریز کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم اور عوام کی بے بسی کی نہایت مفصل انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ مغلیہ نظام کے عروج وزوال، ایسٹ انڈیا کمپنی، برطانوی راج، گائے اور سور کی چربی چڑھے کارتوسوں، کالے پانی کی سزا اور پھانسی گھروں کا بیان اس دور کی تمام آپ بیتیوں کا حصہ ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیمِ ہند، ہندوستان کے لیے ایک ایسا بھیانک خواب ثابت ہوئی جس کی تعبیر بعد میں اپنے اپنے طور پیش کی جاتی رہی۔ تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ سیاسی وسماجی زندگی کی یہ ریشہ دوانیاں اور انتشار ادب بالخصوص آپ بیتی پر گہرے اثر انداز ہوئے۔ اس دور میں جو آپ بیتیاں لکھی گئیں ان میں فسادات پھوٹنے سے پہلے کا ہندو مسلم مشترکہ امن وامان کا ماحول پیش کیا گیا۔ اس دور کی ہندو خواتین کا مسلمان عورتوں کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا لہذا ان کے مذہبی عقائد و نظریات کے عین مطابق ان کی مہمان نوازی کی جاتی۔ اس دور میں ہندو مسلمان گھرانوں کا آپس میں میل جول اور انہیں اکٹھے ہولی، دیوالی، دسہرا، عید، شب برات مناتے دکھایا گیا۔ اس کے علاوہ اس دور کی آپ بیتیاں قحطِ بنگال، طوائف الملوکی، ہندوستانیوں کے دل ودماغ میں آنے والے فتور، طبقاتی

کشمکش، مذہبی ولسانی تعصبات، ہندو مسلم فسادات، ہندوستان کی سیاسی فضا، جنگ کے اثرات، تقسیم ہند، اپنوں سے بچھڑنے کے کرب، مہاجرین کی بدحالی اور فسادات میں ہونے والی آبروریزی جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس دور کی آپ بیتی میں اس دردناک حقیقت سے پردہ چاک کیا گیا کہ علاقائی تعصب کی آڑ میں کس طرح لاکھوں جانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ان آپ بیتیوں میں دورِ غلامی کی سختیوں اورآزمائشوں بھرے دور کا ذکر بھی ہے اور عوام کے ولولے، جوش خروش، آزادی کے لیے لڑی گئی جنگوں اوران کے اثرات کا مفصل بیان بھی۔

تقسیم ہند ایک ایسا سانحہ تھا جس کے اثرات بہت گہرے تھے۔ ایک طویل عرصہ تک آپ بیتی میں بھی اس سانحے کی دردناک یادوں کا بسیرا رہا۔ ابھی یہ غم ہلکورے لے رہا تھا کہ اک اور سانحہ ہو گیا جسے سقوطِ ڈھاکہ کا نام دیا جاتا ہے۔ پاکستان کے دوسرے بازو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے موضوع پر بھی آپ بیتی نگاروں نے لکھا اور خوب لکھا۔اس دور کی آپ بیتیوں میں اردو بنگالی تنازعہ، ۱۹۶۵ءاور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ، بنگلہ دیش کے قیام، دوسری ہجرت، پاکستان کے تینوں مارشل لاء، بھٹو دوراور پاکستان کے سماجی، معاشی واقتصادی حالات پر لکھا گیا۔ چنانچہ فلسطین، کشمیر، برما اور بوسنیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار کو لے کے جہاں دنیا بھر میں احتجاج کیا گیا وہیں آپ بیتی میں بھی اس مسئلے کو خوب اٹھایا گیا۔ افغان مہاجرین کی پاکستان میں آبادکاری اور کراچی کے نقصِ امن کی جس طرح عکاسی کی گئی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔اس دور کی آپ بیتیوں میں حکمرانوں کی سیاسی، معاشی، اقتصادی پالیسیوں کی جھلک بھی ہے اور عوام کی بے بسی وکسمپرسی کی تصویریں بھی۔اس کے علاوہ ان آپ بیتیوں میں جان لیوا بم دھماکوں اور ان کے اثرات پر بھی کافی مواد ملتا ہے آپ بیتی نگاروں نے گردوپیش کے حالات کو آپ بیتی میں سموتے ہوئے معاشرتی مسائل پر لکھا اور خوب لکھا۔کم وبیش ہر آپ بیتی میں کسی نہ کسی حد تک عصری شعور ضرور دیکھنے کو ملتا ہے۔ زیادہ تر آپ بیتیوں میں عہد کو پس منظر کے طور پر پیش کرتے ہوئے نجی زندگی کے ساتھ ساتھ معاصر حالات وواقعات کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ان آپ بیتیوں میں عصری شعور کا عکس صاف نظر آتا ہے۔یوں عصری رجحانات اور ہم عصر مسائل کے جگہ پانے سے یہ صنف بیک وقت اجتماعی و انفرادی خصوصیات کی حامل اور عصری شعور کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ اگرچہ وقت وحالات پہ لکھنے والوں کو سخت تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن یہ تنقید بھی اس مقصد کے آڑے نہ آسکی۔

ا۔ قیامِ پاکستان سے قبل کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کی روایت

۱۸۵۷ء کا خون آشام انقلابی ہنگامہ جسے عام طور پر غدر کا نام دیا جاتا ہے، ہندوستان کی سیاسی وادبی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ حادثہ ادب کے میدان میں نہایت اہم کڑی خیال کیا جاتا ہے۔ اس حادثے نے سیاسی وسماجی زندگی کو تو متاثر کیا ہی ادب کے لیے بھی نئے موضوعات کا تعین کیا یوں ادب میں پہلی بار بڑی سطح پہ عصری شعور بیدار ہوا۔ اس دور کے ادیبوں نے دلی کو آگ میں لپٹے دیکھا تو اس آگ کی تپش ادب میں بھی محسوس کی جانے لگی ۔ اس طرح جو ادب سامنے آیا وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے والے ادب سے بہت مختلف تھا۔ اس میں وہ لاپرواہی، سرمستی اور گل وبلبل کے فسانے نہ تھے بلکہ حقیقت پر مبنی عصری زندگی کی جاندار تصویروں سے بھرپور یہ ایسا ادب تھا جس میں درد کی لہر صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس دور میں تحریر کردہ آپ بیتیوں میں "کالا پانی"، "بیتی کہانی"، "حیاتِ نساخ" اور "داستانِ غدر" خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں ۔ ۱۸۸۴ء میں مولانا جعفر تھانیسری کی منظر عام پر آنے والی آپ بیتی "کالا پانی" ایک ایسی آپ بیتی ہے جو اپنے عہد کا بہترین پرتو دکھائی دیتی ہے۔ اس میں مولانا جعفر تھانیسری ایک ایسے قیدی کے طور پر سامنے آتے ہیں جس نے بغاوت کے عائد کردہ جرم میں جزائر انڈمان پر پورے بیس سال (۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۶ء) کالے پانی کی سزا کاٹی۔ مولانا جعفر تھانیسری نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا مکمل تاریخی و سیاسی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے انگریز قوم کے ظلم و ستم کی داستاں ،پھانسی گھروں کا حال، جزائر انڈمان المعروف کالا پانی کی سزا کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں اس دور کی تہذیبی جھلکیاں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے جذائر انڈمان میں رائج رسم ورواج، عقائد و توہمات اور تہواروں کو بیان کرتے ہوئے ایک مکمل ثقافتی منظر نامہ تشکیل دیا ہے جو اس عہد کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ "سماجی زندگی" کے عنوان کے تحت جزائر انڈیمان پر آباد مختلف قوموں کے رہن سہن پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک وحشی قوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ وحشی قوم جنگلات میں مادرزاد آباد چلی آرہی تھی جن کے مرد عورتیں بالکل ننگ دھڑنگ رہتے، کپڑا انہیں میسر تھا اور نہ ہی وہ پہنتے تھے۔ مزید لکھتے ہیں کہ یہ جنگلی آدم خور نہیں تھے لیکن ان کے جسموں پہ بال تھے۔ ان کا بسیرا ابھی درختوں پر تھا یا پھر یہ چار بانس کھڑے کرکے ان پہ

پتے ڈال کر ایک چند روزہ آسرا بنا لیتے تھے۔ تیر کمان ہی ان کی اصل جان اور کل جائیداد تھی اس کے سوا ان کے پاس کسی دوسری چیز کا وجود نہیں تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ان کے شادی بیاہ بھی نہایت سیدھے سادے طریقے پر ہوتے تھے۔ شادی کے وقت دولہا اور دلہن دونوں کو گیرو رنگ کی چربی سے رنگ دیا جاتا تھا۔۔۔ اجتماع میں ایک آدمی بطور قاضی نظر آتا تھا وہی دولہا کو اٹھا کر دلہن کے پاس لے جاتا ہے اور دولہا کے سامنے بہت سے تیر و کمان رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان سے شکار کر کے اپنی عورت کی پرورش کرنا۔ اور پھر وہی شخص بلند آواز کے ساتھ کہتا ہے "اَب اِک" یعنی لے جاؤ یہ تمہاری بیوی ہے۔ یہ کہنے کے بعد عقد پختہ ہو جاتا ہے اور پھر تاحیات دونوں کے ہاں طلاق ہے نہ جدائی۔ (۷)

ان کے ہاں جب کسی دوسرے جزیرہ سے کوئی مہمان آتا تو پہلے اسے گھر سے تھوڑے فاصلے پہ بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا۔ گھر والے اسے وہیں کھانا پہنچاتے کھانا کھانے کے بعد وہ قبیلے کے جس گھر جانا چاہتا چلا جاتا۔ ان لوگوں کی ایک خاص روایت تھی کہ اپنے مردوں کی ہڈیاں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

> جب کوئی مر جاتا ہے تو اسے ایک ٹوکری میں رکھ کر اس کے گھٹنوں کو مروڑ کر اس کی چھاتی پر لا کر باندھ دیتے ہیں۔ سارے اعضاء کو درخت کے چھلکوں سے کس دیتے ہیں اور پھر قبر کھود کر اس میں گاڑ دیتے ہیں۔ قبر کے نزدیک آگ جلاتے رہتے ہیں ایک دو ماہ کے بعد اس کی قبر کو کھود کر اس کا ماتم کیا جاتا ہے اور اس کی ہڈیوں کو سب عزیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور پھر انہیں حرزِ جاں سمجھ کر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی لاشوں کو گاڑھنے کے بجائے مچان پر رکھ دیا جاتا ہے یا درختوں کی شاخوں پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ (۸)

جعفر تھانیسری نے جزائر انڈمان کے رقبہ، پیداوار، غلوں کے نرخ، بحری آفات، کالے گورے میں برتے جانے والے نسلی امتیاز، ہندوؤں کے تعصب اور چھوت چھات کو موضوع بنایا۔ جیل خانوں کے مروجہ دستور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جیل کے دستور کے مطابق کس طرح قینچی سے سر داڑھی اور مونچھ کے بال تراش کے ایک منڈھی ہوئی بھیڑ بنا دیا جاتا تھا۔ جیل کے قیدیوں کو ایک مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد آپس میں شادیاں

کر کے باقی سزا میاں بیوی کے طور پر پوری کرنے کا اختیار دیا جاتا تھا۔ ان کے مطابق قید کے پانچ سال گزرنے کے بعد ہر عورت کو اختیار تھا کہ جس مرد سے چاہے شادی کر لے لیکن مرد حضرات میں سے صرف وہی شادی کر سکتے تھے جو ٹکٹ کے مالک بن چکے ہوں۔ جعفر تھانیسری کی آپ بیتی اس دور کی مذہبی صورتحال کی بھی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ مذہبی تعصبات اور چھوت چھات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ضلع الموڑہ کی برہمن قوم سے تعلق رکھنے والی ایک ہندو عورت ان دنوں نئی نئی قید ہو کر کالا پانی آئی۔۔۔ وہ نہایت خوش چلن اور حیادار عورت تھی مگر ہندو دھرم میں نہایت متعصب، کسی مسلمان عورت کے نزدیک کھڑا ہونا یا اس کے کپڑوں کو چھونا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ بارک کی مسلمان عورتیں تو اس کے تعصب کی وجہ سے تنگ آ گئی تھیں۔ (۹)

"مذہبی خیالات" کے عنوان کے تحت جزائر انڈمان کی وحشی قوم کے مذہبی خیالات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں یہ لوگ شیطان کے تو قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ سب برے کام شیطان کراتا ہے۔ لیکن ان کے مطابق شیطان دو طرح کے ہیں ایک زمین کا شیطان، دوسرا سمندر کا شیطان۔ ان کے مطابق زمین کے شیطان کا نام ارم چوگلا اور سمندر کے شیطان کا نام جوروونڈا ہے۔ جب زمین پر کوئی ناگہانی موت مر جاتا ہے، تو یہ سمجھتے ہیں کہ ارم چوگلا نے مار ڈالا اور جب کوئی ڈوب کر مر جاتا تو یہ کہتے کہ اس کو جوروونڈا نے مار ڈالا۔

> یہ جنگلی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا آسمان میں رہتا ہے۔ وہی ہر چیز کا خالق ہے اور سب سے بڑا ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔۔۔ ان جنگلیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ چانا پالک اس کی بیوی ہے اور اسے بھی فنا نہیں اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا کام ہے کہ سمندر میں مچھلیاں پیدا کرے، وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔ (۱۰)

مولانا جعفر تھانیسری کو مذہب سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کی آپ بیتی میں جابجا آیاتِ کریمہ کا ترجمہ و تفسیر شامل کیے گئے ہیں۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے جہاں مذہبی منظر نامہ سامنے آتا ہے وہیں سیاسی صورتحال کی بھی مکمل عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے ہندوؤں کی گائے سے عقیدت اور قربانی کی صورت میں ہندو مسلم فسادات پر

روشنی ڈالتے ہوئے اس وقت کی مشہور زمانہ تحریک وہابی تحریک کی مقبولیت کے اسباب و مقاصد، نمایاں کارناموں، انگریزوں کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات اوراس کے رہنماؤں پر انگریز حکمرانوں کی سختی کو بھی عیاں کیا۔ اس آپ بیتی میں تحریکِ آزادی، معرکہ امبیلا، حریت پسند رہنماوں اور فرنگیوں کے ظلم و ستم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جعفر تھانیسری اپنے عصر کا سیاسی شعور بھی رکھتے تھے۔

پہلی خاتون آپ بیتی نگار شہر بانو بیگم کے قلم سے وجود میں آنے والی آپ بیتی "بیتی کہانی" ان کے عصری شعور سے بھرپور ایسی آپ بیتی ہے جس میں پاٹو دی کی مختصر تاریخ، ۱۸۵۷ء کے غدر، دہلی کے فسادات، پاٹو دی کی تباہی، باغیوں کے قتل، ہاتھی بانوں، رتھوں، ساچق اور چالوں کی مروجہ رسموں کی تفصیل ملتی ہے۔ ریاست پاٹو دی کی تباہی کے بعد عورتوں کی ہجرت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> صرف تین تور تھیں تھیں اور دو سو عورتیں۔ الٰہی اب کیا کریں کس کو چھوڑیں کس کو ساتھ لے چلیں؟ آخر ناچار جتنی سواریاں رتھوں میں سمائیں وہ تو کھچ پھچ ہو کر سوار ہوئیں باقی ماما، اصیلیں اور بیبیاں بھی پیادہ پا چلیں۔ بال بچوں کو گودیوں میں اٹھائے ہوئے، گٹھڑی بگچی بغل میں دبائے ہوئے، حیراں سرگرداں۔ مرد کوئی ساتھ نہیں۔۔۔ پاؤں پر چھالے، لبوں پر نالے۔ چشم گریاں، آنسو رواں۔ کسی کا پانچہ جھاڑ میں الجھا تو کسی کا دوپٹہ کھیت کی باڑ میں الجھا۔ (۱۱)

اس آپ بیتی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر بانو محض ابھی نو سال کی تھیں کہ انہیں سانحہ غدر کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ شہر بانو بیگم نے اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات وواقعات کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے۔ بالخصوص ریاست جھجھر کی ضبطی، اپنے سسر اور ریاست جھجھر کے رئیس کی پھانسی اور وہاں کے لوگوں کی ہجرت کے مناظر اس دور کی سیاسی کشاکش سے پیدا ہونے والی سماجی گہما گہمی کو نہایت تفصیل سے آشکار کیا۔ اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست جھجھر کو ضبط کر کے کس طرح وہاں کے لوگوں کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ ریاست چھوڑنے کے فوری حکم پر لوگوں کو قافلوں کی صورت ہجرت کرنا پڑی۔ بیس روز کے مسلسل سفر میں پر خطر دشوار گزار مقامات سے ہوتے ان لوگوں کو جن معاشی حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی ایک الگ داستان

ہے۔ بحیثیت مجموعی شہر بانو بیگم اپنے عہد کے تہذیبی اور سیاسی حالات کا پورا پورا شعور وادراک رکھتی تھیں جس کی جھلک ان کی آپ بیتی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ بنگال کی سرزمین پر اُردو شاعری کا باوا آدم کہلانے والے معروف شاعر و نقاد عبدالغفور نساخ کی آپ بیتی "حیاتِ نساخ" بھی ان کے عصری شعور کی جھلک پیش کرتی ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے غدر اور کلکتہ کے عنوان سے غدر کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ پروفیسر وہاج الدین علوی لکھتے ہیں:

> نساخ کی خود نوشت اپنے مواد کے لحاظ سے اُردو کی ابتدائی خود نوشتوں میں بہت ممتاز ہے۔ اس میں اس عہد کی معاشرت، ادبی معرکے، لکھنو اور دہلی کی ادبی مجلسوں کا حال، کلکتہ ،باوڑہ اور بنگال کے عوام کی تصویر، وہاں کے تہوار، پیداوار اور لوگوں کے رجحانات کا ذکر ملتا ہے۔۔۔ اس کے اوراق میں نساخ کی زندگی کے چون پچپن برسوں کے وہ حالات ہیں جن کی روشنی میں ان کی سیرت اور عہد کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے۔ (۱۲)

تاریخی صداقت کی حامل اس آپ بیتی میں ۱۸۸۶ء تک کے جغرافیائی، سماجی، ادبی، تاریخی، تہذیبی و ثقافتی حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ اہم شخصیات کا بیان ملتا ہے۔ اس آپ بیتی میں ہر خطے کا ماحول اور روایات بیان کرتے ہوئے وہاں کے علوم وفنون اور اجناس کو بھی خصوصی اہمیت دی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مرد حضرات اپنی کسی تحریر میں اپنے گھر کی پردہ دار خواتین کا نام لکھنا بھی معیوب سمجھتے تھے لیکن باہر کی عورتوں سے ملنے ملانے، ناچ گانے اور ہر طرح کے تعلقات روا رکھنے میں کوئی برائی نہ تھی۔ دہلی، لکھنو، کلکتہ، ڈھاکہ باریسال غرض ہر خطے کی تہذیب ومعاشرت، چوری ڈکیتی، جعل سازی کے واقعات، جھوٹے مقدمے، طوائف کلچر، جوے، شراب اور فرقہ وارانہ فسادات کے بیان سے اس آپ بیتی میں ان کا عہد مکمل سماجی و معاشرتی پس منظر کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ عبدالغفار نے اپنے دور کے تعلیمی نظام، اساتذہ کے حال، ادبی مباحثوں اور مقابلے کی فضا کی خوب عکاسی کی ہے۔ عبدالغفور نساخ کا عصری شعور نہایت ہمہ گیر اور وسیع ہے جو کسی ایک شعبہ زندگی تک محدود نہیں بلکہ یہ اپنے دور کی تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور تمام تر سماجی رنگا رنگیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ عصری شعور کی یہ عکاسی ظہیر الدین دہلوی کی "داستانِ غدر" میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر کے بعد منظر عام پر آئی۔ ظہیر الدین دہلوی بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے، راقم الدولہ کا خطاب بھی بہادر شاہ

ظفر کا عطا کردہ تھا۔ یہ آپ بیتی مغلیہ دور کی تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ غم والم کی یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں اس دور کی تاریخ، اُردو زبان کی ابتدائی حالت اور لب ولہجہ بھی شامل ہے بذاتِ خود یہ آپ بیتی بھی زبان وبیاں کے لحاظ سے دہلی کے لب ولہجہ اور اسلوب کا بہترین نمونہ ہے اس میں دہلی کے روزمرہ محاورہ اور عام ٹکسالی زبان کا استعمال کیا گیا۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے شرفا وامراء کو مختلف علوم فنون سے کس قدر شغف اور لگاؤ تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی مغلوں کے زوال اور دہلی کی بربادی کی داستان ہے اسی بنا پر اسے "داستانِ غدر" کا نام دیا گیا۔ غدر بپا ہونے پر دہلی کے حصے میں جو تباہی و بربادی آئی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہی یہ ایک ایسا المیہ تھا جس نے ہر خاص وعام کو متاثر کیا۔ وہاج الدین علوی انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ظہیر الدین دہلوی نے اس خود نوشت میں اپنی زندگی کی داستان اور دہلی کی تہذیبی وثقافتی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ لیکن ہنگامہ غدر اور اس کے مظالم ومصائب کا اثر ان کی زندگی پر اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنی تحریر میں اس کے اثرات سے دامن نہ بچا سکے۔ ان کی خود نوشت میں ہنگامہ غدر کے دلخراش واقعات اپنی پوری تفصیل کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس طور پر داستانِ غدر ان کی داستانِ حیات میں ایک اہم سرخی کی حیثیت رکھتی ہے۔ (۱۳)

ڈاکٹر ندیم احمد نے بھی اس آپ بیتی کی ادبی و تاریخی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں تہذیبی و تمدنی عناصر کی موجودگی کی تائید کی اور اسے اُردو کی چند سرفہرست ابتدائی آپ بیتیوں میں سے ایک قرار دیا۔ یہ آپ بیتی کل دس ابواب پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی کا پہلا باب ان کی ذاتی زندگی سے متعلق ہے تاہم اس میں بھی دہلی کے گلی کوچوں، بازاروں، میلوں ٹھیلوں سے لے کر دہلی کے محلوں، شرفا وامراء تک کا حال ملتا ہے۔ اسی باب میں دلی کی بربادی کی پیشین گوئی منظر عام پر آنے اور اس پر لوگوں کے رد عمل کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ دوسرے باب میں تہذیب وثقافت کو اجاگر کرتے ہوئے شاہی دربار کے آداب، تقریبات، دہلی کی تہواروں، رسم ورواج کا ذکر کیا گیا جبکہ اگلے آٹھ ابواب سیاسی موضوعات کے حامل ہیں۔ ان میں مغل بادشاہوں کی رعایا پروری اور رحم دلی کا ذکر کرتے ہوتے مغلیہ سلطنت کے زوال، ہنگامہ غدر، میرٹھ چھاؤنی، قیدیوں کی رہائی کی کوشش، قیدیوں کے قتل

،باغیوں کے حال، تیموری شہزادوں کے قتل، ہجرت، ریاست الور، ریاست جے پور کے خون آشام حالات کی مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے۔ "کشت وخون" کے عنوان کے تحت قتل وغارت گری کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آدھی رات کے وقت سپاہ انگریزی نے یکایک کشت وخون کرنا شروع کیا اور سوتے آدمیوں کو گھروں میں گھس کر اور سیڑھیوں کے ذریعے کوٹھوں پر چڑھ کر ہلاک کرنے لگے۔"(۱۴) ان کی آپ بیتی سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ غدر کے دوران مخبروں نے مخبری کر کے کس طرح دو روپے کی خاطر اپنے ہی لوگوں کی جانیں گنوائیں۔ اور تلاشی کے بہانے لوٹ مار کر کے کس طرح گھر کے گھر صاف کر دیئے گئے۔ غدر کی کیفیت، سامانِ خورد ونوش کی قلت، بھوک پیاس اور ہجرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اب شہر کی یہ کیفیت ہے کہ دکانیں سب بند اور رسد آنی بند، دانا پانی خلقت پر حرام، لگے بھوکے پیاسے مرنے۔ تین روز یہی کیفیت رہی، آخر تیسرے روز شام کے وقت بادشاہ کے قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے پہنچے اور رعیت بھی سراسیمہ حیران پریشان ہو کر شب کے وقت سب گھر بار جوں کا توں چھوڑ کر اپنے بال بچوں اور عورتوں وغیرہ کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر شہر سے نکلنی شروع ہو گئی۔ غرض کہ اس وقت وہ قیامتِ عظیم برپا ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔(۱۵)

آپ بیتی میں دہلی کی معاشرتی زندگی کے خوبصورت نقشے کھینچتے ہوئے مجلسی روابط اور سیاسی وسماجی صورتحال کی پیشکش ملتی ہے جو ان کے بہترین عصری شعور کا واضح ثبوت ہے۔ عصری شعور کی یہ عکاسی رئیس المتغزلین حسرتؔ موہانی کی "قیدِ فرنگ" میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہد وجہدِ آزادی کے لیے کتنی کتنی جانیں قربان کرنا پڑیں اور قید وبند جیسی کیسی کیسی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وطن کے لیے محبت میں پھر بھی کوئی کمی نہ آئی۔ حسرتؔ موہانی نہ صرف ادبی دنیا کے سرگرم رکن تھے بلکہ سیاست سے بھی عملی طور پر وابستہ تھے۔ اوائل عمری میں ہی سیاست میں حصہ لینے کی بنا پر انگریز حکومت کی جانب سے کالج سے بھی تین بار بے دخل کیے گئے۔ "قیدِ فرنگ" نہ صرف ان کی ادبی، سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کی داستان ہے بلکہ اس میں زندانی معاشرت کی بھی بہترین تصویر کشی کی گئی۔ حسرتؔ موہانی نے "اردوئے معلیٰ"

کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں حکومتِ وقت کے خلاف ایک مضمون شائع ہونے پر قید کی سزا کے مستحق ٹھہرے۔ قید کے دوران ایک من غلہ پیسنے کے لیے چکی کی مشقت بھی برداشت کرنا پڑی۔ حسرتؔ موہانی کو تین بار چھ سالہ قید کی مشقت اٹھانا پڑی۔ "قیدِ فرنگ" میں حسرتؔ نے اپنی پہلی جیل یاترا کے پر آشوب دور کے تجربات و تاثرات قلم بند کیے۔ اس آپ بیتی میں اس دور کے جیل خانوں کا ماحول، قیدیوں کی حالتِ زار، قیدیوں کی اصلاح، قیدیوں کے مخصوص لباس، قیدیوں سے لی جانے والی مشقت و بیگار کو نہایت تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے اپنے دور کی سیاسی انقلاب پسندی، معاشی ناہمواریوں اور معاشرتی صورتحال کی بہترین عکاسی کی ہے۔ مشہور زمانہ شخصیت ابوالکلام آزادؔ جو فیروز بخت کے نام سے جانے جاتے تھے، ہندوستان کی سیاسی و ادبی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے جدی پشتی پیری مریدی کا سلسلہ مسترد کرتے ہوئے اپنی زندگی ادب اور سیاست کے لیے وقف کر دی۔ انقلابی خیالات رکھنے اور آزادی اظہار کا حق استعمال کرنے کے باعث آپ کو نظر بندی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان کی آپ بیتی "تذکرہ" بھی نظر بندی کے دوران ہی پانچ ماہ کی قلیل مدت میں تحریر کی گئی۔ محکمہ تعلیم، آل انڈیا خلافت کمیٹی، دہلی اتحاد کانفرنس اور انڈین نیشنل کانگریس سے وابستگی کی بنا پر ابو الکلام آزادؔ ہندوستان کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھے۔ ابوالکلام آزادؔ نے ادب و صحافت سے تعلق کی بنا پر آپ بیتی میں ہندوستان کی نہ صرف سیاسی و صحافتی زندگی کی عکاسی کی بلکہ اس میں مذہبی نظریات و عقائد، اخلاقی مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ڈاکٹر ندیم احمد لکھتے ہیں: "اس آپ بیتی کا زیادہ تر حصہ سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی مسائل پر مبنی ہے آزادؔ خاندانی حالات کا بہت کم ذکر کرتے ہیں۔"[۱۶] پانچ ماہ کی قلیل مدت میں تخلیق کی گئی اس آپ بیتی میں اگرچہ فنی طور پر کافی خامیاں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود بلاشبہ یہ ایک اچھی آپ بیتی ہے۔ یہ آپ بیتی اس وقت کے مذہب، سماج اور سیاست کے بارے میں تفصیلی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ آپ بیتی کی روایت میں ایک اہم نام خواجہ حسن نظامی کا ہے جن کی آپ بیتی "آپ بیتی" کے نام سے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔ مصنف کا تعلق سلسلہ پیری مریدی سے تھا اور ایک عمر خانقاہوں میں گزری۔ مصنف نے "آپ بیتی" کے نام سے بچپن، جوانی وغیرہ کا حال بیان کرتے ہوئے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت اور سماجی رویوں کی بھی بہترین عکاسی کی۔ ان کی آپ بیتی میں کہیں بازار میں بکتے دلی کی عمارتوں کے نقشے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں مزاروں پہ مریدوں کا

جمگھٹا نظر آتا ہے۔ یہ دور پیروں فقیروں پر حد سے بڑھے اعتقاد کا دور تھا۔ لوگ کسی بھی پیر کے ہاتھ مرید ہونا لازم خیال کرتے۔ اکثر لوگوں نے پیر کو دیکھا ہی نہ ہوتا کہ اگلا بندہ کس طرح کا اور کیسے کردار کا مالک ہے لیکن خط کے ذریعے یا کسی کے ہاتھ پیغام بھیج کر مرید ہو جاتے۔ اسی طرح ایک عام سماجی رویے کی عکاسی کرتے ہیں کہ لوگ کس طرح غبن کرتے ہوئے کسی کام کے لیے اکٹھی کی گئی خیرات کی رقم سے اپنا حصہ بھی وصول کر لیتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے مزاروں پر نذر نیاز کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جن کی زندگی صرف اسی نذر نیاز پہ بسر ہوتی چلی آئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اسے گداگری پیشہ کے مترادف قرار دیتے ہوئے اس سے شدید اکتاہٹ کا اظہار کیا۔ ان کے خیال میں یہ لوگوں کو سستی و کاہلی کی طرف راغب کرنے اور معیشت کو مفلوج کرنے کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح فقیر ملنگ حضرات کے کردار کا ایک رخ پیش کرتے ہیں کہ بچوں کے پاس کوئی چیز ہونے کی صورت میں انہیں نہتا پا کر محض لالچ میں آ کر ان کے قتل پر بھی آمادہ ہوتے۔ بحیثیت مجموعی اپنے دور کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی پہلو پیش کرتے ہوئے آپ بیتی نگار نے اپنے ہمہ گیر اور وسیع عصری شعور کا ثبوت دیا ہے۔ آپ بیتی کی دنیا میں "نیرنگی بخت" ایک ایسی آپ بیتی ہے جو وزیر اعظم ریاست کپورتھلہ کی دخترِ نیک اختر بیگم وزیر سلطان جالندھری کی زندگی کی داستان ہے۔ ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والی یہ آپ بیتی ان کی نجی زندگی اور ذاتی افکار و خیالات کے علاوہ اس عہد کی تہذیبی و تمدنی زندگی، سماجی روایات و اقدار اور مذہبی عقائد و نظریات کا پتہ دیتی ہے۔

خود مصنفہ کو بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا لہذا بیگم وزیر سلطان نے اس عہد کی حد سے بڑھی ہوئی پردہ داری اور اس کے خواتین کی زندگی و نفسیات پر مرتب ہونے والے اثرات پر روشنی ڈالی۔ نجی حالات و واقعات رقم کرتے ہوئے اپنے عہد کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس دور میں شرم و حیا اور پردے کا یہ عالم تھا کہ گھر کے مرد حضرات باہر سے اندر آتے ہوئے احتیاطاً اپنی آمد کا کسی طور احساس دلاتے تھے اور گھر کی بہو بیٹیاں سب پردے میں چلی جاتیں۔ نو سال کی عمر میں بیٹی کا باپ سے پردہ شروع کرا دیا جاتا۔ اور اگر کوئی آٹھ نو سالہ لڑکی باپ کے پاس بیٹھی دیکھ لی جاتی تو شور مچ جاتا کہ لڑکی جوان ہو رہی ہے باپ کے پاس مت بیٹھنے دیا کرو۔ اکثر ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے کہ باپ اٹھارہ سالہ لڑکی سے اچانک مد بھیڑ ہونے پہ سراپا سوال ہوتا

کہ یہ کون ہے؟اس زمانے کی تہذیب وثقافت کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ اس زمانے میں پردہ دار بیگمات کے لیے پالکی یا بیل گاڑی یعنی رتھ سواری ہوتی تھی جس پر گہرے رنگ کا خوبصورت قیمتی کپڑا پڑا ہوتا تھا۔ بیگم وزیر سلطان نے زمین کی وراثت سے جنم لینے والے جھگڑوں اور قطع کلامی کی صورتحال، اس دور کے تعلیمی نظام، ذرائع نقل وحمل، خواتین کے ازدواجی مسائل، شادی بیاہ کے رسم ورواج، گہنے پہنے اور ملبوسات وغیرہ کا نہایت معروضی اور مدلل انداز میں تجزیہ پیش کرتے ہوئے اپنے دور کی جیتی جاگتی لازوال تصویریں کھینچی ہیں جو ان کے عصری شعور کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ۵۲۷ صفحات اور ۱۴ ابواب پر مشتمل "اعمال نامہ" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہونے والی آپ بیتی مشہور وکیل وسیاستدان سر رضا علی کی تحریر کردہ ہے۔ اس آپ بیتی میں سماجی صورتحال کے تناظر میں ہندوستانیوں کی انگریزوں سے تعلقات کی نوعیت اجاگر کرتے ہوئے سیاسی ریشہ دوانیوں سے پردہ چاک کیا گیا ہے۔ سر رضا علی نے جس بہترین انداز میں ایرانیوں کی امر دپرستی، ہندوستانیوں کی مردہ پرستی، مسلمان عورتوں کے پردے کے حال، ساس بہو کے جھگڑے، پولیس کی رشوت ستانی، بھانڈ اور نقالوں کی نقلوں کی تصویر کشی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ اس آپ بیتی میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال کے تناظر میں کلکتہ، بہار، بنگال، یو۔پی کے حالات، اودھ ہندو مسلم تنازعات، مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی قیادت کے لیے اٹھائی گئی آواز، کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس، سانحہ مسجد کانپور، اردو ہندی تنازعہ، جنوبی افریقہ کی لڑائی، تقسیمِ بنگال جیسے تمام اہم معاملات پر تفصیلاً روشنی ڈالتے ہوئے اپنے عصری شعور کا پتہ دیا ہے۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی لکھتے ہیں: "اردو میں سر رضا علی کا اعمال نامہ ہو یا چودھری افضل حق کا میرا افسانہ، اپنے دور کی سیاسی سرگرمیوں کی اچھی دستاویز ہے۔ ان سب کا محور اس زمانے کی تحریکیں ہیں جن سے وہ لوگ وابستہ رہے۔"(۱۷) مصنف کی سماجی بصیرت اور مختلف سیاسی جماعتوں اور سیاسی پارٹیوں سے عملی وابستگی کی بنا پر آپ بیتی میں اس عہد کا خاص سیاسی وسماجی رنگ تو شامل ہے ہی اس پر مستزاد یہ کہ خاص سیاسی شخصیت ہونے کے باوجود مصنف ادب سے بھی خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آپ بیتی اس دور کی ادبی روایت کا بھی پتہ دیتی ہے۔ اس آپ بیتی کے بارھویں باب "اردو شاعری اور ادب" کے تحت مومن خان مومن، مولانا حالی، آزاد، مرزا غالب، میر حسن اور نواب مرزا شوق کے شخصیت وفن پر بات کی گئی۔

سر رضا علی یہ جانتے تھے کہ مولانا محمد حسین آزادؔ نے اپنی کتاب "آبِ حیات" میں مومن خاں مومنؔ کا ذکر نہیں کیا۔ وہ نہ صرف اسے مومنؔ سے زیادتی قرار دیتے ہوئے اس پر احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ اس غلطی کی اصلاح پر بھی مُصر دکھائی دیتے ہیں۔ مومنؔ کے ساتھ کی جانے اس ادبی نوعیت کی زیادتی کے بعد سر رضا علی نے ان کے بہترین اشعار آپ بیتی میں شامل کر کے اس زیادتی کا اثر زائل کرنے کی اپنی سی ایک کوشش ضرور کی ہے۔ اسی طرح مولانا شبلی کی طرف سے میر انیسؔ کے مرزا دبیرؔ پر فوقیت دیئے جانے پر بھی کافی سیخ پا نظر آتے ہیں یہاں ان کا یہ موقف سامنے آتا ہے کہ مولانا شبلی نے موازنے کے سلسلے میں مرزا دبیرؔ کے معیار میں کم اور پست اشعار کا انتخاب کیا جبکہ میر انیسؔ کے تمام تر اشعار انتہائی بہترین منتخب کیے۔ یوں یہ آپ بیتی اپنے دور کے ادبی، سماجی اور سیاسی منظر نامے کا بہترین مرقع بن کے سامنے آئی۔ "خون بہا" عصری شعور کی عکاسی کرنے والی ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں حکیم احمد شجاع نے اپنی ذات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ان کے عہد کے علمی ادبی اور خانقاہی زندگی سے واقفیت کا ایک ذریعہ ہے۔ حکیم احمد شجاع نے ایک خاص علمی و ادبی اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی جس کے واضح اثرات ان کی آپ بیتی پر بھی مرتب ہوئے۔ ان کے یہاں مذہب اور روحانیت سے خاص لگاؤ ملتا ہے۔ ان کے ہاں ہندوستان کی اسلامی تہذیب اور اہم مراکز کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ آپ بیتی نگار اپنے دور کے مسلمانوں کی تفرقہ پسندی، آئے دن کی ہنگامہ آرائیوں، خصوصاً طلبا کے آپس کے اختلافات پر نہایت خائف محسوس ہوتے ہیں۔ مصنف کو سماج پر مغربی تہذیب کے اثرات کا بھی اندازہ تھا۔ ایک جگہ علی گڑھ کالج کے طلباء کے حوالے سے نئی و پرانی تہذیب کے ٹکراؤ اور ملک کی سماجی صورتحال پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مختلف نظریات کی اس تمام کشاکش میں علی گڑھ کالج کے طلبا کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ نئی تہذیب کی چکاچوند سے ان کی آنکھیں خیرہ، مادیت کی افادیت سے ان کے قلب مسحور اور مذہب کے تصنع اور عبادت کے تکلف سے ان کی روح بیزار تھی۔ (۱۸)

اپنے دور کی ادبی نشستوں، اہم تحریکوں اور ان سے وابستہ سیاسی و سماجی شخصیات کے کردار پر روشنی ڈالتی یہ آپ بیتی اس دور کے حالات و واقعات سے واقفیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ چودہ کتابوں کے مصنف صاحبِ طرز،

انشا پرداز، مفکر اور سیاست دان چودھری افضل حق سیاست کی دنیا میں بھی مجلسِ احرار کے رہنما کی حیثیت سے ایک اہم و سرگرم رکن گردانے جاتے تھے "میرا افسانہ "میں ملکی و قومی حالات، جماعت الاحرار کی جہد وجہد بیان کرتے ہوئے ہندوستانی سیاسیات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ پولیس انسپکٹر کی نوکری چھوڑ کے تحریکِ خلافت کی رکنیت اختیار کرنے، مجلسِ احرارِ اسلام کی بنیاد رکھنے، ڈوگرہ راج کے خلاف تحریکِ کشمیر کا آغاز کر کے کشمیریوں کے حق میں آواز اٹھانے تک ہر کام میں پیش پیش رہے۔ چودھری افضل حق سیاست دان ہونے کے ناتے انتخابات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ اور انہیں تحریکِ ترکِ موالات اور سول نافرمانی جیسی انگریز پالیسیوں کے تحت چار بار گرفتاری کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ "میرا افسانہ "میں انہی حالات و واقعات کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ اس آپ بیتی میں پہلی جنگ عظیم میں مذہبی علما کے کردار، ہندو مسلم تعلقات، تعلیمی نظام، تحریک آزادی، تحریکِ ترکِ موالات، حریت رہنماؤں کے جزبہ آزادی، تحریک آزادی کے سلسلے میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے حریت رہنماؤں کی تقریروں اور رد عمل کے طور پر انگریز حکمراں کی ہراساں ہو کر کی جانے والی پکڑ دھکڑ کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ اس کے علاوہ قید و بند کی صعوبتوں، قیدیوں سے روا رکھے گئے سلوک اور جیل خانوں میں پائی جانے والی خامیوں سے بھی پردہ اٹھایا گیا۔ ہندوستانی مدرسوں کی فضا کو بے جان اور اداس قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دور میں مدرسین حوصلہ مندیوں کا سبق کیا دیتے؟ بات بات پر کان اینٹھنا اور بلا عذر ڈنڈے برسانا ہی اس زمانے کی اصل استادی تھی۔ مسلمانوں کی بد اعتقادی اور فضول رسموں میں پڑے رہنے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا تمام تر کاروبار ہی مناجات اور تعویزوں پہ منحصر تھا۔ مشکلات کے حل کے لیے عملی جہد وجہد کے بجائے لوگ زیادہ تر مستجاب الدعوات کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے۔ مسلمانوں کی بے عملی، تن آسانی و عیش کوشی، فضولیات میں پڑے رہنے، مادیت پرستی اور دولت کی خاطر ہر ممکنہ درمیانی راستہ اختیار کرنے کے عام سماجی رویئے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ یا تو نقشِ سلیمانی کی تلاش میں رہتے یا کسی مالدار بیوہ سے نکاح کے خوشگوار خواب دیکھتے۔ جس سے عیش و آرام کی زندگی میسر آجائے۔ ہمزاد اور جن کو قابو میں کرنے کا جتن کرتے مگر خود ہاتھ ہلانے کی نوبت نہ آتی۔ حکیم احمد شجاع کو ہم عصر سماج کی نفسیات اور رجحانات کا علم تھا وہ سماجی کج رویوں اور مسائل سے بھی بخوبی واقف تھے۔

۲۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ بیتی میں عصری شعور کی روایت

قیامِ پاکستان کے بعد منظر عام پہ آنے والی آپ بیتیوں میں بھی عصری شعور کی کمی نہیں۔ ان آپ بیتیوں میں تقسیمِ ہند، ہجرت، فسادات اور اپنوں سے دوری نے عصری شعور کو پروان چڑھایا۔ قیامِ پاکستان کے بعد عصری شعور سب سے پہلے ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آنے والی آپ بیتی "سرگزشت" میں دیکھنے کو ملتا ہے جو کثیر الجہت شخصیت کے مالک عبدالمجید سالکؔ کے قلم سے وجود میں آئی۔ ابتدا میں ان کی یہ آپ بیتی روزنامہ "امروز" اور "نوائے وقت" میں شائع ہوتی رہی بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس آپ بیتی میں بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر تقسیمِ ہند کے زمانے، خاص طور پر پنجاب کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات و واقعات کو نہایت دلکش و جاندار انداز میں ایک لڑی میں پرو کر پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر حسن وقار گل لکھتے ہیں:

> اس خود نوشت میں مولانا سالکؔ نے اپنے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا ہے گویا وہ ان کی زندگی سے جدا حقائق نہ ہوں ان کا علم اور مشاہدہ ان کی ذات کا حصہ بن گئے ہیں۔ (۱۹)

اہم سیاسی شخصیات کے خاکے پیش کرتے ہوئے ادب، سیاست، صحافت، سماج اور قید و بند کے حالات و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ تین حصوں پر مشتمل یہ آپ بیتی عبدالمجید سالکؔ کی شخصیت سے بھی کہیں زیادہ اس عہد کی آئینہ داری کرتی دکھائی دیتی ہے۔ غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

> قیامِ پاکستان کے بعد اردو کی پہلی قابلِ ذکر آپ بیتی عبدالمجید سالکؔ کی "سرگزشت" یہ ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر ادیب کی خود نوشت ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے زمانے کی سیاست، صحافت، ادب اور معاشرت کی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔ یہ خود نوشت تاریخ اور سوانح کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں اپنے عہد کے نامور لکھنے والوں سے ہمیں متعارف کروایا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر غیر جانبداریت اور معروضیت پر مبنی ہے۔ اس خود نوشت میں ہمیں ان کا عہد سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ (۲۰)

یہ آپ بیتی کیا ہے عبدالمجید سالکؔ کے عہد کی ادبی، سیاسی، مجلسی اور صحافتی زندگی کی ایک مکمل روداد ہے۔ رشید احمد صدیقی کا شمار بھی ان افراد میں ہوتا ہے جنہیں عصری تغیرات کا سامنا رہا۔ حساس طبیعت کے مالک رشید احمد صدیقی نے اپنی آپ بیتی "آشفتہ بیانی میری" میں اپنے دور کی سیاسی و سماجی زندگی کی روداد بیان کرتے ہوئے عصری تغیرات کی نشاندہی کی اور عصرِ حاضر کے مسائل و خصائص پر رائے کا اظہار کیا۔ معاشرتی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جنگِ طرابلس کے زمانے میں بھی جلسے جلوس ہوتے تھے لیکن انداز جداگانہ تھا۔ یہ جلوس نہایت شریفانہ اور پر وقار انداز میں ہوتے، نہ کوئی انتقامی کاروائی ہوتی نہ کوئی اژدھام۔ ہزار پانچ سو آدمیوں کا مجمع ہوتا جو چند میل سفر طے کر کے پر امن انداز میں منتشر ہو جاتا۔ ہر قسم کی نعرہ بازی، آبروریزی، لوٹ مار اور آتش زنی سے گریز کیا جاتا۔ مصنف طلبا کو سیاست سے دور رکھنے کے حق میں ہیں، موجودہ دور میں نعرے کی طاقت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں پچھلے دور میں کالجوں میں نعرے بازی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ان کے مطابق پچھلے دور میں طلبا مذہبی و سیاسی لیڈروں کے ہاتھ تھے لیکن اتنے نہیں جتنے آج کل ہیں۔ اس وقت طلبا تنظیموں کی بھی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ طلبا کو موجودہ دور میں جس نوعیت کے مسائل درپیش ہیں ان کا اس وقت وجود ہی نہ تھا۔ ادبی ذوق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس دور میں معمولی درجے کے غریب سے غریب گھرانے میں بھی مذہب و تصوف، شعر و شاعری اور وظائف کے حوالے سے سو پچاس کتابیں لازماً موجود ہوتیں۔ رشید احمد صدیقی نے زمانہ طالب عملی کی یادوں کو سمیٹتے ہوئے عصری پہلوؤں کی جس خوبصورتی سے عکاسی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے بعد آغا جان کاشمیری نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ "سحر ہونے تک" آغا جان کاشمیری کی زندگی کی داستان ہے یہ آپ بیتی ۱۹۶۴ء میں منظرِ عام پہ آئی جس کا عنوان مرزا غالب کے درج بالا شعر سے اخذ کیا گیا ہے:

؎ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگِ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (۲۱)

آغا جان کاشمیری نے اپنے دور کی سماجی و تہذیبی زندگی کی نہایت خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے لکھنؤ کے مشاعروں، مباحثوں اور گلی کوچوں کی نہایت جاندار تصویریں پیش کی ہیں۔ ہندوستانی عورت کی حیثیت اور سماجی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں: "ہندوستان میں تو عورت مرد کی ملکیت ہوتی ہے بلکہ اسی لیے شادی کی

جاتی ہے کہ روز ہی کوئی حرکت ہو اور سال میں ایک بچہ ضرور پیدا کیا جائے، خواہ جوان ہو کر بھیک ہی کیوں نہ مانگے۔" (۲۲) ہندوستان کے لسانی جھگڑوں، اُردو ہندی تنازعہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کس طرح ملک تقسیم ہو رہا تھا، خیالات بدل رہے تھے۔ اور اُردو کو ہندی سے بدلا جا رہا تھا یا بدلنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کتاب میں شامل اس دور کی اہم شخصیات کے خاکے اس کا رتبہ اور بڑھا دیتے ہیں۔ آغا جان کاشمیری نے آغا حشر کاشمیری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ہندوستان کا شیکسپیئر قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسا ڈرامہ نویس دنیا آج تک نہیں پیدا کر سکی۔ مزید لکھتے ہیں ایک بار کسی نے کہہ دیا کہ حشر صاحب صرف اُردو جانتے ہیں، ہندی اور سنسکرت نہیں۔ اس پر انہیں غصہ آ گیا اور انھوں نے فوراً "بھیشم پرتگیا" کے نام سے نادر و نایاب ڈرامہ لکھ دکھایا۔ پھر شراب کے خلاف ایک اور ڈرامہ لکھا جو بہت مقبول ہوا اور اس کے زیرِ اثر سینکڑوں شراب پینے والوں نے شراب ترک کر کے سچی توبہ کر لی۔ ایک دن آغا حشر خود شراب کے نشے میں جھومتے جا رہے تھے کہ دیکھنے والے کہہ اٹھے، حضور! قسم لے لیجیے ہم نے صرف آپ کی بدولت شراب چھوڑی اور آپ خود پیئے ہوئے ہیں۔ آغا جان نے گہرے مشاہدے اور قوی یادداشت سے کام لیتے ہوئے مخصوص بیباک اور رنگین انداز میں ہندوستان خصوصاً لکھنؤ کی تہذیبی و سماجی زندگی کا عکس پیش کیا۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> دلی کے کوچے میر کو "اوراقِ مصور" نظر آئے تھے اور لکھنؤ کے گلی کوچوں کو آغا صاحب نے مرقعوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ لکھنؤ کی ادبی محفلیں، گھریلو صحبتیں، مشاعرے، چہل پہل، محبتیں اور رقابتیں، مذہبی رواداری کا ماحول اور وضعداریاں سب جیتی جاگتی شکل میں ان صفحات میں موجود ہیں۔ (۲۳)

۱۹۲۷ء میں انگریز حکومت کی طرف سے ہندوستان ایک آئینی کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس کا نام چیئرمین سر جان سائمن کے نام پہ سائمن کمیشن رکھا گیا عوام اور سیاسی حلقوں میں احتجاج کی ایک لہر دوڑ گئی۔ عوامی احتجاج اور بائیکاٹ کے باوجود ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جہاں ہر جگہ ہندوستانی مظاہرین نے کالی جھنڈیوں اور احتجاجی نعروں سے اس کا استقبال کیا۔ جگہ جگہ "سائمن واپس چلے جاؤ"، "ہم سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرتے ہیں" کے نعرے اور بینر آویزاں کر دیئے گئے۔ بعض جگہوں پر عوام نے احتجاجی جلسے جلوس کیے اور عوام

اور پولیس کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئیں۔ اس صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سائمن کمیشن لکھنؤ آیا تو قیصر باغ میں بہت بڑی دعوت ہوئی۔ چونکہ کئی مقامات پر سائمن واپس جاؤ کے نعروں سے ہندوستانی ان کا استقبال کر چکے تھے۔ لہذا اب لکھنؤ میں اس بات کا پورا انتظام کیا گیا کہ کوئی ان کے قریب نہ پہنچ سکے۔ اس پر امراؤ صاحب نے آئیڈیا دیا بڑے بڑے کنکوؤں پر 'سائمن گو بیک' لکھ کر اس طرح پیچ لڑاؤ کہ کنکوے کٹ کٹ کر ٹھیک اسی جگہ گریں۔ پھر کچھ ہی دیر بعد دور دور تک پولیس اور ملٹری کا سخت پہرہ ہونے کے باوجود 'سائمن گو بیک' لکھے سینکڑوں کنکوے کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ ان کے خیال میں آزادی کی یہ جنگ چند لوگوں کی نہیں بلکہ دیس کے بیالیس کروڑ عوام کی جیتی ہوئی جنگ ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کی آپ بیتی "میری دنیا" ۱۹۶۵ء میں منظر عام پہ آئی۔ اس آپ بیتی میں الہ آباد شہر اور یونیورسٹی کے علمی، ادبی، سماجی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی آپ بیتی میں ہندوستان کے سیاسی ماحول اور ادبی و اصلاحی تحریکوں کا حال تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں دیہی و شہری زندگی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے مطابق راجا پور کی تہذیب بیک وقت شہری و دیہی تہذیب کے ملاپ سے وجود میں آئی تھی اور سماج پر بھی اس تہذیب کے نمایاں اثرات ہوئے۔ خود ڈاکٹر اعجاز حسین کو کھیلوں میں ہاکی، فٹ بال، اور کرکٹ کے ساتھ ساتھ گلی ڈنڈا، کبڈی، اور پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ طوطا، مینا، لال، مُنیا، تیتر، بٹیر اور کبوتر ان کی تفریح کا اہم ذریعہ تھے حقہ، پان، افیون کا استعمال عام تھا حتی کہ خواتین بھی اس سے شغل کرتی دکھائی دیتیں۔ بچے روتے یا تنگ کرتے تو انہیں افیون کھلا کر سلا دیا جاتا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں افیون سے دلچسپی لینا عام بات تھی۔ چنانچہ میرے خاندان میں بھی اس نشہ سے تفریح حاصل کی جاتی۔۔۔ بوڑھے اور جوان سب ہی کسی نہ کسی شکل میں افیون سے شغل کرتے۔ بچے بھی اس سیاہ رو سے نہ بچتے ان کو بھی خفیف سی یہ دوا دی جاتی۔ چنانچہ مجھے اب تک یاد ہے میری والدہ یا خالہ زبردستی مجھے افیون کھلاتیں۔[۲۴]

شام کے وقت روز محفل ہوا کرتی خصوصاً حقے تازہ کرتے ہوئے قصے کہانیاں سنائے جاتے۔ اس وقت بھی غدر کے واقعات زبانِ زدعام تھے۔ لوگ اپنے بزرگوں سے سنے واقعات اپنے بچوں اور ساتھیوں کو دلچسپی لے

کرسنایا کرتے۔لوگوں کی اپنے مذہب سے محبت کے باوجود مذہبی تنگ نظری نہ ہونے کے برابر تھی۔ہندو مسلمان بھی ایک دوسرے کے تہواروں میں شامل ہوتے تھے۔خود ڈاکٹر اعجاز حسین بھی باقاعدگی سے ہولی دیوالی، کمبھ کے نہان جیسے تہواروں اور میلے ٹھیلوں میں شرکت کرتے رہے۔مصنف نے ریاست جے پور کی تہذیب پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے گاؤں راجاپور کے رسم ورواج، رہن سہن کا تفصیلی ذکر کیا ہے ان کے مطابق دیہات کی طرز معاشرت شہر سے اور شہر کی طرزِ معاشرت یورپ سے متاثر تھی۔تہذیبی و سماجی سطح پہ تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی تھیں۔لوگوں میں تعلیم کا ذوق پیدا ہورہا تھا خصوصاً انگریزی تعلیم کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا۔ان کے مطابق انگریزی پڑھنے والے احساسِ برتری کا شکار ہو جاتے اور دوسروں کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔اس آپ بیتی میں ہم عصر ادبی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے علی اصغر، گاندھی جی، شیخ مہدی حسن ناصری، راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، ڈاکٹر عالی جعفری، آہ سیتاپوری، مرزا وجاہت، دلیپ کمار، عصمت چغتائی، وغیرہ جیسی اہم شخصیات کے خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر اعجاز حسین نے ذاتی تجربات وواقعات پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ عام رائے یہی پائی جاتی ہے کہ طوائف کو صرف روپے پیسے سے غرض ہے لیکن دراصل اس طبقے کو بھی محبت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسی دوسرے انسان کو۔طوائف کو عام طور پر سراسر شر قرار دیا جاتا تھا لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔"طوائف بالکلیہ ہمہ شر کہلانے کی مستحق نہیں اور طبقوں کی طرح اس طبقے میں بھی اچھی بری ہستیاں ہوتی ہیں۔"[۲۵] اپنے ایک پٹھان دوست محفوظ علی خان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کس طرح وہ انتہائی غریب اور مفلس تھا خواہشات کے غلبے نے اسے خالی ہاتھ طوائف کے در تک تو پہنچا دیا لیکن اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا اور یوں محفوظ علی خان کا ایک طوائف سے بہن بھائی کا ایک ایسا مضبوط رشتہ وجود میں آیا جو مرتے دم تک برقرار رہا۔ محفوظ علی خان کی منہ بولی بہن بے روزگاری کے زمانے میں ان کا خرچ برداشت کرتی رہی اور شدید علالت کی حالت میں جب محفوظ علی خان نقل وحرکت سے بھی محروم ہو گئے تو ان کی تیمارداری کا فریضہ سرانجام دیا۔بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی ایک نہایت بہترین اور اپنے عصر سے قریب ترین آپ بیتی ہے۔

"بجنگ آمد" پاکستان کے ضلع چکوال سے تعلق رکھنے والے ایک فوجی جوان کرنل محمد خان کی ایک ایسی آپ بیتی ہے جو عصری شعور سے بھرپور ہے۔ عسکری زندگی کے ۷ برس پر محیط اس آپ بیتی میں جنگ کے دوران پیش آنے والے حالات وواقعات کو دلکش اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ آپ بیتی دراصل ایک جگ بیتی ہے جس میں معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے جنگ وجدل کے قصے نہایت دلچسپ انداز میں عیش وسروراور ناؤنوش کے بیان کے ہمراہ رقم کیے گئے ہیں۔ برما کی سرزمین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہی سرزمین جو گدگدانے پہ کبھی موتی بکھیرتی تھی، کئی سالوں کی جنگ سے کس قدر سنسان وویران ہو چکی ہے۔ بستیاں اجڑنے کے ساتھ ہی لوگوں کے دل بھی ویران ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی افواج کے بارے میں تفصیل فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس وقت چونکہ ہندو مسلم تعصب عروج پر تھا تو ہندو مسلم جھڑپیں ہونا ایک عام بات تھی۔ لکھتے ہیں کہ فوج میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی اور انگریز بھی۔ لیکن یہاں ہندو مسلمان آپس کا تعصب بھلا کر انگریز کے خلاف ایک تھے۔ معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کالے گورے کی تخصیص یہاں بھی کارفرما تھی۔ فوجیوں کو ان کی کارکردگی کی بنا پر نہیں بلکہ رنگ ونسل کی بنیاد پر نوازا جاتا تھا۔ یہاں تک کے گوروں اور عام ہندوستانی فوجیوں کے کیمپس بھی الگ الگ تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اس وسیع کیمپ کے دو حصے تھے جنہیں ونگ (WING) کہتے تھے یعنی برٹش ونگ اور انڈین ونگ۔ برٹش ونگ میں فقط گورا افواج تھیں اوران کے افسر یہ ونگ کیمپ غربی سرے پر تھا۔ شرقی حصہ انڈین ونگ تھا اس میں ہمارے ہندوستانی سپاہی اوران کے افسر رہتے تھے۔[۲۶]

اس آپ بیتی میں مصر کے بازار، رقص گاہوں، رقاصاؤں، برما کی بربادی اور بحالی، ۱۹۶۵ء ۱۹۷۱ء کی جنگ کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ انگریز کی تنگ نظری، انگریزوں اور امریکیوں کی معاصرانہ چشمک اور اس کی وجوہات پر روشنی ڈالی۔ انگریز فوج کی انگلستان میں بڑھتی ہوئی مداخلت پر امریکی افواج کے رد عمل کو نہایت مدلل اور معروضی انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امریکی سپاہیوں کو یہ بے جا مداخلت زیادہ پسند نہ آئی کیونکہ ایک طرف تو فوجی فوجی کی گردان کرتی ان کی اپنی خواتین ان فوجیوں کے عشق میں مبتلا ہو رہی تھیں

اور برطانوی اخبار ان عشق محبت کے قصوں کو دھڑا دھڑ با تصاویر شائع کر رہے تھے۔ دوسری طرف ڈالر اور چیونگم نے مصری معشوقاؤں کو ان سے چھین لیا تھا۔ قاہرہ میں مصری خواتین انگریزوں کو چھوڑ کر امریکی فوجیوں کی طرف مائل ہو رہی تھیں اس بات کا انہیں حد درجہ قلق تھا۔ امریکن فوج کے بارے میں کرنل محمد خان لکھتے ہیں:

> انگریزوں اور امریکیوں کی چشمک نے بے شمار لطیفے پیدا کیے۔ انگریز امریکیوں کو جنگی نقطہ نظر سے اناڑی سمجھتے تھے۔ اور انکے لیے اکثر YELLOW یعنی بزدل کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ امریکی اس پر ہنس دیتے اور اپنی چھاتیوں پر تمغوں کی طرف اشارہ کرتے۔ لیکن تمغوں کی عنایت کے معاملے میں خداوندان امریکہ بہت فیاض واقع ہوئے ہیں۔ ایک امریکی سپاہی اگر دو سال نوکری کر لے تو اس کی چھاتی پر قوس قزح اتر آتی ہے۔ چنانچہ انہی دنوں جب قاہرہ میں جنرل منٹگمری کی فتح لیبیا کے متعلق فلم دکھائی جانے لگی تو انگریزوں نے ازراہ تفنن مشہور کر دیا کہ امریکی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو امریکی سپاہی فلم DESERT VICTORY دیکھ لے گا اسے تمغہ دیا جائے گا۔[۲۷]

عصری تناظرات کو منفرد اور مزاحیہ انداز میں پیش کرتی یہ آپ بیتی اپنے دور کو ہر پہلو سے اجاگر کرتی دکھائی دیتی ہے عصری تناظرات کی پیشکش کے سلسلے میں کرنل محمد خان کا انداز نہایت دلچسپ ہے۔ عصری شعور کی عکاسی کرتی ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آپ بیتی "اپنی آپ بیتی" ایک ایسی آپ بیتی ہے جو ان کے شعور کی بیداری کا مکمل ثبوت ہے۔ ڈاکٹر حسن وقار گل کا کہنا بالکل بجا ہے یہ کتاب ان کے عہد کی تمدنی تاریخ ہی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ہندوستان، فرانس اور آسٹریلیا کی سیاسی، سماجی اور تمدنی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے دیارِ فرنگ کے عنوان کے تحت سوربون کی تاریخ بھی بیان کی۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے نہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام، مقاصد، دائرہ عمل، گول میز کانفرنس، فرقہ وارانہ فسادات، ملک کے سیاسی حالات اور شدھی، سنگھٹن، تحریکِ ترکِ موالات، اینی بیسنٹ ہوم رول جیسی تحریکوں پر روشنی ڈالی بلکہ اس دور کی اہم تاریخی شخصیات مسز سروجنی نائیڈو، علامہ محمد اقبال، مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی کی شخصیت و کردار کو بھی اجاگر کیا۔ پروفیسر وہاج الدین علوی لکھتے ہیں:

یوسف حسین خان نے اپنی خود نوشت کا آغاز مغل بادشاہوں کی ملکی سیاست سے کیا ہے۔ان کے سیاسی شعور کو پیش کرنے کے ساتھ عام ملکی حالات بھی تحریر کیے ہیں۔جس سے روہیل کھنڈ کی تاریخ اوروہاں کے جغرافیائی حالات اور نو آبادیات کا حال معلوم ہوتا ہے۔پٹھانوں کے خاندان کا تعارف ہوتا ہے اور ان کو وہاں بسانے کے اسباب کا پتہ چلتا ہے، جس پر تاریخی حوالوں سے بحث کی گئی ہے۔اس تمہید میں وہ حصہ زیادہ جاندار ہے جہاں انہوں نے مغلوں کے دورِ انحطاط اور طوائف الملوکی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ (۲۸)

اس آپ بیتی میں ایک مکمل تہذیب اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ڈاکٹر ندیم احمد لکھتے ہیں:"اس میں تاریخ،ادب،نفسیات اور عمرانیات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔یہ خود نوشت اپنی معلومات اور ندرتِ اسلوب کی وجہ سے بھی اردوادب میں ایک گراں قدراضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔" (۲۹) دراصل ۴۷۲ صفحات اور ۸ ابواب پر مشتمل یہ آپ بیتی ادب اور تاریخ کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو مغل نظامِ حکومت ،مغلوں کے انحطاط،طوائف الملوکی،عام ملکی حالات،روہیل کھنڈ کی تاریخ اور جغرافیائی حالات،پٹھانوں کی نو آبادی قائم کرنے اورانہیں وہاں بسانے کی وجوہات سے بھی بحث کرتی دکھائی دیتی ہے اور اس میں جنگِ بلقان اور ہندوستانی مسلمانوں پر اس کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔"یادوں کی بارات"میں جوش ملیح آبادی کا دور تمام تر رعنائیوں سمیت جلوہ گر ہوتا ہے۔اس میں تہذیب کی رنگارنگی بھی ہے اور ادب کی چاشنی بھی۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

ہر طرف روشنی تھی،رنگینی تھی،چہل پہل تھی۔لونڈیاں،باندیاں،مامائیں،اصیلیں، مغلانیاں،انائیں،ردائیں،کھلائیاں،استانیاں،پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں،چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔خدمت گاروں، رکاب داروں،فراشوں،سپاہیوں،مولویوں،ماسٹروں،مصاحبوں،داستان گویوں،منشیوں ،ضلع داروں اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔ (۳۰)

اچھی تنقید ہمیشہ وہی ہوتی ہے جو کسی تخلیق کو ہمیشہ اس کے عصری تناظر میں جانچے پرکھے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جوش صاحب کے ساتھ انصاف سے کام لیا جاتا۔لیکن زیادہ تر ناقدین نے جوش کی آپ بیتی کو صرف

رومانیت کی آنکھ سے دیکھااور جوش صاحب کے معاشقوں کو لے کے انہیں محض یک رخی تنقید کی کسوٹی پر رکھا۔ حالانکہ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان کا فن عصری تناظر میں پرکھا جائے تو یہ ایک خاص دور کی نہایت جاندار تصویر پیش کرتا ہے۔ دراصل جوش ملیح آبادی کا دور جاگیر دارانہ نظام پر مبنی ایک ایسادور تھاجب کہارنیوں، مغلانیوں، نائنوں، ماماؤں، اصیلاؤں وغیرہ کی صورت میں ہر طرف عورتوں کا جمگھٹا تھا۔ جاگیر دار کے بچوں کو سوتے وقت کہانی سنانے کے لیے بھی الگ سے ایک ملازم عورت میسر ہوتی۔ مرد کی جائز و قانونی بیویوں کی کوئی مقررہ تعداد نہ تھی۔ کسی کے ہاں دس بیویاں تھیں تو کسی کے ہاں چالیس۔ حویلی کی کسی بھی ملازمہ سے تعلق قائم کیا جاسکتا تھا۔ ایسے ماحول میں اٹھارہ معاشقے کوئی ایسی انہونی بات بھی نہ تھی کہ جس پہ یقین نہ کیا جاسکتا۔ جوش ملیح آبادی نے حقیقی اور نجی حالات وواقعات کے علاوہ آپ بیتی میں ہندوستان کے جاگیر دارانہ تہذیب و تمدن، جدید انگریزی تہذیب اور طوائف کلچر کی رنگین دنیا کے حقیقی مرقعے پیش کیے۔ سعید خان لکھتے ہیں:

> یادوں کی بارات ایک عظیم شاعر کی آپ بیتی اور ایک تاریخ ساز عہد کی تہذیبی زندگی کا دلکش مرقع ہے۔ اس مرقعے میں آپ کو وادیِ گنگ و جمن اور سرزمینِ دکن کے قدیم و جدید معاشرے کی خوشنما جھلکیاں نظر آئیں گی۔ مصنف نے اپنے ایامِ طفلی وجوانی کے خوشحال طبقوں کی سماجی قدروں پر، ان طبقوں کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، ان کے عقیدوں اور وہموں پر، ان کے شوق اور مشغلوں پر، ان کے تیوہاروں اور تقریبوں پر، ان کے رہن سہن اور رسوم ورواج پر روزمرہ کے واقعات کے حوالے سے بڑے دلچسپ تبصرے کیے ہیں۔[۳۱]

جوش ملیح آبادی نے اپنے دور کی مذہبی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے مذہب کو اوہام پرستی کی ایک شاخ قرار دیا۔ اور اس کی عقلی تعبیر کرکے اسے ایک مفید شے بنانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے ہاں مذہبی شدت پسندی اور مذہب سے وابستہ بے سروپا باتوں کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ہمعصر سیاسی صورتحال پر قلم فرسائی کرتے ہوئے جنرل ایوب خان کے دور حکومت کا نقشہ کھینچااور گاندھی کے قتل، تقسیمِ برصغیر، ہجرت، فسادات اور مہاجر شعرا و ادبا کے ساتھ مقامی مصنفین کے رویوں پر بھی روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ انہوں

نے پاکستانی سیاست کا منظر نامہ بھی پیش کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی عصری صورتحال کی ایک مکمل داستاں ہے۔

گوپال متل کی داستانِ زندگی پر مشتمل تخلیق "لاہور کا جو ذکر کیا" ۱۹۷۱ء میں منظرِ عام پہ آئی۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی میں نجی وعائلی حالات کے ساتھ ساتھ تقسیمِ ہندوستان اور لاہور کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں یہ آپ بیتی، آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے۔ گوپال متل نے ذاتی حالات وواقعات کے بیان میں نہایت اختصار سے کام لیا۔ آپ بیتی پر ان کے اردگرد کے ماحول اورادب کا گہرا اثر ہے۔ گوپال متل "پارس"، "صبحِ امید"، "بھارت ماتا" اور "ملاپ" جیسے اخباروں کے دفاتر میں کام کرتے رہے اور خود بھی ان کے لیے لکھتے رہے۔ آپ بیتی میں اسپین کی خانہ جنگی، یمنی باغیوں، ہندو مسلم تضاد، مذہبی تعصبات، ہندوستان کی ادبی وصحافتی زندگی جیسے عصری تناظرات پہ قلم فرسائی کی گئی۔ مصنف ادب کے دلدادہ تھے اور سیاست سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے دور کی ادبی نشستوں کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نامور ادیبوں کے خاکے بھی پیش کیے۔ جن میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، میراجی، مولانا صلاح الدین احمد، کنہیالال کپور، ایم حسن لطیفی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی فضا پیش کرتے ہوئے انہوں نے اہم سیاسی تحریکوں کا ذکر جس طرح مدلل اور معروضی انداز سے کیا، وہ انہی کا حصہ ہے۔ کانگریس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مرد حضرات کے ساتھ جب خواتین نے بھی سیاست کا رخ کرتے ہوئے اس تحریک میں حصہ ڈالا تو کچھ لوگوں نے فوراً ان کے کردار پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں اور پھر یہ روایت بن گئی۔ ایک صحافی پرمانند رام کے متعلق لکھتے ہیں: "ان دنوں بھائی پرمانند رام نے کانگریس تحریک میں حصہ لینے والی لڑکیوں کے کریکٹر پر حملہ کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ہندوستان بھر میں ان کے خلاف احتجاج ہوا۔" [۳۲] مزید آگے لکھتے ہیں یہ بحث کافی عرصہ جاری رہی کوئی ان لڑکیوں کی محض سیاسی اختلاف پر کردار کشی کو غلط قرار دیتا تو کوئی کردار کشی کرنے والے حضرات کو حق بجانب سمجھتا۔ اسی بحث میں کئی جھگڑے بھی ہوئے۔ خود گوپال تامل کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ کچھ ہفت روزہ اخباروں میں مذہبی منافرت کا پرچار بڑے ہی قابلِ نفرت انداز میں کیا جاتا تھا۔ ان میں ایک کا نام "گرو گھنٹال" تھا ایک کا نام "شیطان" تیسرے کا صحیح نام مجھے یاد نہیں رہا، غالباً "لاحول" تھا۔ جب ان کی

دریدہ دہنی حد سے زیادہ بڑھی تو حکومت نے دو ایڈیٹروں کو جن میں سے ایک ہندو تھا اور ایک مسلمان، جیل میں بند کر دیا۔ اتفاق سے وہ دونوں ایک ہی جیل میں تھے رہا ہو کر ان میں سے ایک نے بڑے طمطراق سے لکھا کہ حکومت نے ہمیں مذہبی منافرت پھیلانے کے الزام میں سزا دی تھی لیکن ہم دونوں جیل میں بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ اس آپ بیتی میں گوپال متل کا عصری شعور پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ ہر ہر سطر ان کی عصری شعور اور سماجی بیداری کا پتہ دیتی ہے۔ "بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغِ محفل "شورش کاشمیری کے عصری شعور پر مشتمل آپ بیتی ہے جس کا عنوان مرزا غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

؎ بوئے گل نالہ دل دودِ چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (۳۳)

۴۳ ابواب اور ۵۳۴ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی ۱۹۷۲ میں منظر عام پر آئی۔ جس میں تخلیق کار نے اپنے بچپن سے قیامِ پاکستان تک کی مکمل روداد نہایت مفصل انداز میں بیان کی ہے۔ "بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل" کی اشاعت کے بعد یہ سلسلہ رکا نہیں۔ اور "پس دیوار زنداں"، "موت سے واپسی" اور "تمغہ جرات" کے نام سے شورش کاشمیری کی یکے بعد دیگرے مزید تین کتابیں شائع ہوئیں جو ان کی آپ بیتی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان کی آپ بیتی سے اس دور کے سیاسی سماجی اور مذہبی صورتحال کا پتہ ملتا ہے۔ مصنف نے اپنے ایامِ اسیری، قید و بند کی صعوبتوں جیل خانے کی اندرونی حالات، برطانوی سامراج، کانگرس، مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی، برصغیر کی جنگِ آزادی، ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات، تقسیمِ ہند سے قبل اور بعد کے حالات و واقعات تحریر کیے ہیں۔ آپ بیتی میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی سیاست و صحافت کا بھرپور جائزہ پیش کرتے ہوئے سیاسی قائدین کی کاوشوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا جائزہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کا منظر نامہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ شورش کاشمیری خود بھی ایک سیاسی رہنما تھے۔ انہوں نے اپنی نجی و سیاسی زندگی کی کہانی بیان کی اور ہندوستان و پاکستان کے سیاسی حقائق کا پردہ چاک کیا۔ خاص کر صدر محمد ایوب خان کے مارشل لاء پر تفصیل سے لکھا۔ اس آپ بیتی سے کسی بھی سیاسی ڈھانچے کے کھوکھلے پن کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ آپ بیتی اس دور کی ادبی و سیاسی زندگی کا حسین امتزاج ہے۔ "جہانِ دانش "ضلع میرٹھ سے تعلق رکھنے والے مزدور شاعر احسان

دانش کی ایک ایسی آپ بیتی ہے ،جو آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ آپ بیتی میں احسان دانش نے اپنے آبائی وطن کاندھلہ کی تہذیبی روایت واقدار اور جغرافیائی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی۔اس آپ بیتی میں کہیں سلگتی چتا اوربسنت کی دیوی دکھائی دیتی ہے تو کہیں مہاتما بدھ کا سونے کا اسٹوپا جھلک دکھائی دیتا ہے۔اس آپ بیتی میں مزدوروں کے مسائل اور جزبات واحساسات کی بھرپور عکاسی کی۔ حکمران طبقے سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ظلم واستحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے۔ محنت کش ومزدور طبقے کے مسائل، غربت وافلاس کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل پر طبع آزمائی کی۔احسان دانش نے معاشرے میں پائی جانے والی بے حسی، سود خوری، بددیانتی، اعلی عہدیداروں کی گھٹیا ذہنیت اوراوچھے ہتھکنڈوں، عورت کے مقام اور عورت کو درپیش مسائل کی نہایت جاندار تصویر کھینچی ہے۔اپنے دور کا سیاسی وادبی ماحول پیش کرتے ہوئے سیاسی پالیسیوں، حلقہ ارباب ذوق، ترقی پسند تحریک، خاکسار تحریک، دہلی، لکھنو، شملہ اور میرٹھ کے مشاعروں کا احوال رقم کیااور میراجی، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، مصطفی زیدی اور فیض احمد فیض کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

> مزدوراور کسان سے ناانصافی ہورہی ہے۔اور کوئی مذہب یا قانون اس بے دردی کی اجازت نہیں دیتا۔اس پر طرہ یہ کہ ہمارے لیڈر سیاسی پارٹیاں بناکر حکومت کو بتارہے ہیں کہ صرف یہی لوگ حکومت کے لیے خطرناک اور بغاوت کے دلدادہ ہیں چنانچہ قید خانوں میں جاتاہے تو پس ماندہ طبقہ اور پھانسیوں پہ چڑھتا ہے تو غریب طبقہ۔ہمارے لیڈر تو دولت مندوں کا حصار کیے رکھتے ہیں اور ان کے جلو میں حکومت کا قانون اور پولیس کا تشدد ہر وقت کمربستہ رہتاہے۔ (۳۴)

بحیثیت مجموعی یہ صرف احسان دانش کی زندگی ہی کی کہانی نہیں، بلکہ یہ افلاس کے مارے ہر اس مزدور بچے کی کہانی ہے، جسے غربت کی وجہ سے اس کے والدین تعلیم نہ دلا سکے اور بچپن میں ہی اس کے نازک کندھوں کو مزدوری کی مشقت اٹھانا پڑی۔۱۹۷۵ء میں اشاعت پذیر ہونے والی "اپنی تلاش میں" کے تخلیق کار نامور نقاداور ادیب کلیم الدین احمد ہیں۔ان کا اصل نام رحیم الدین احمد تھا۔اس آپ بیتی میں کلیم الدین احمد نے ہندوستان کے تعلیمی وسماجی مسائل، تعلیم نسواں اور تعلیم کے لیے دی گئی قربانیوں، فرقہ وارانہ تعصبات، ہندوستانی کھیل

تماشوں (گلی ڈنڈا، کبڈی، فٹ بال، کشتی، پتنگ بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی اور شرنج وغیرہ) کا ذکر کیا۔ نیز ملک میں نشو نما پانے والی تنظیموں اور تحریکوں خصوصاً صوبہ بہار کی ۱۹۴۲ء کی جہد وجہدِ آزادی، مسلم لیگ، مجلس قانون ساز، وہابی تحریک، اس کے مقاصد اور ہمہ گیر اثرات دکھائے ہیں۔ ان کی آپ بیتی سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اُردو زبان کی ترویج واشاعت اور اُردو نثر کو صحیح معنوں میں نثر کا درجہ دینے میں وہابی تحریک کا کیا کردار رہا۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

> وہابی تحریک کا ایک کارنامہ جس پر کسی نے دھیان نہیں دیا وہ اردو نثر کو نثر بنانا اور اسے ترقی دینا اور ترویج کرنا ہے۔ وہابیوں کا ایک اہم کام تھا وعظ و تبلیغ۔۔۔ وہ دین اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ دین واحادیث کی باتیں کرتے تھے۔ شرک سے ڈراتے دھمکاتے، اور بدعتوں کی مذمت کرتے تھے اور ان کے مخاطب عوام ہوتے، اس لیے زبان عام فہم استعمال کرتے ۔ مثالوں سے باتوں کو واضح کرتے کہ جلد ذہن نشین ہو جائے۔ یہ لوگ عالم فاضل تھے لیکن اپنی قابلیت کا اظہار منظور نہ تھا۔ (۳۵)

عام ہندوستانیوں کے جذبات و تاثرات اور تعصبات پر مبنی یہ آپ بیتی بجا طور پر ہندوستان کا تہذیبی مرقع قرار دی جاسکتی ہے۔ اس آپ بیتی میں کلیم الدین احمد نے مذہب، ادب، سیاست، سماج پر بات کی اور ملک کی مجموعی صورتحال کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے عصری شعور کا ثبوت دیا۔ ۳۳۲ صفحات اور ۱۱ ابواب پر مشتمل "زرگزشت" ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پہ آئی۔ زرگزشت مشتاق احمد یوسفی کے ۲۴ سالہ دورِ زندگی کی کہانی ہے۔ جس میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۴ء تک کے حالات وواقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح مزاح اور سماج کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بنیادی طور پر مزاح کی بنیاد بھی عصری شعور پر ہے۔ اطہر حسین لکھتے ہیں:

> طنز و مزاح کی بنیاد ہی عصری آگہی پر ہوتی ہے۔ طنز و مزاح نگار اپنے وقت کے حالات اور حقیقتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور معاشرے کی ناہمواریوں اور خرابیوں پر ہنستا ہے اور نشتر کاری کرتا ہے۔ عصری آگہی ہر طنز و مزاح نگار کا تقاضا ہوتا ہے۔ (۳۶)

"زرگزشت" آپ بیتی کی روایت میں نیا موڑ ثابت ہوئی۔ انفرادیت کی حامل یہ آپ بیتی دیگر آپ بیتیوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں زندگی کے گوناگوں پہلوؤں، سماجی ناہمواریوں، سیاسی و معاشی حالات کو مزاحیہ انداز میں کیا۔ نیز سماج و معاشرت میں پائی جانے والی کجی کو تاہیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے ان کی اصلاح کی کوشش کی گئی۔ گویا ایک تیر سے دو شکار کے ذریعے لوگوں کے لیے تفریح کا سامان بھی مہیا کیا اور عصری حالات کی عکاسی کر کے ادب سے اصلاح کا کام بھی لیتے رہے۔ مصنف نے اپنی زندگی، ماحول اور بینک جاب کے دوران پیش آنے والے حالات وواقعات طنزیہ و مزاحیہ پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم کہیں کہیں اسلوب میں سنجیدگی کا عنصر بھی شامل ہے۔ دراصل مشتاق احمد یوسفی کا شمار بھی ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں میں ہوتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے تقسیمِ ہند، ہجرت اور پاکستان پہنچنے والے مہاجرین کی کیفیت نہایت تفصیل سے سنجیدہ اسلوب میں پیش کی۔ بینک سے پہلا پاکستانی نوٹ شائع ہونے اور اس پر حکومتِ پاکستان کے الفاظ چھپنے پر لوگوں کے جذبات کی عکاسی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ تصویر کشی اس قدر جاندار ہے کہ قاری خود کو اسی دور میں محسوس کرتا ہے۔ سماجی و معاشی تغیرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا جب کمیشن ایجنٹس لوگوں سے منہ چھپاتے اور بچتے پھرتے تھے، پھر وقت اور حالات نے پلٹا کھایا۔ اوراب لوگ کمیشن ایجنٹس سے دامن بچاتے دکھائی دیتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی بنیادی طور پر ایک مزاح نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ ایک تخلیق کار اپنے دور اور سماج سے کسی طور چشم پوشی نہیں برت سکتا۔ مشتاق احمد یوسفی بھی مزاح کے پیرائے میں بہت سے اہم عصری حقائق سے پردہ اٹھاتے چلے آئے ہیں۔ خود مشتاق احمد یوسفی کو بھی اس بات کا ادراک تھا کہ عصری شعور کے بغیر کبھی بھی کوئی بڑا فن پارہ تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے قبل وہ اپنی کئی تصانیف میں اس بات کا برملا اظہار کر چکے تھے۔ مثلاً اپنی کتاب "آبِ گم" میں عصری شعور کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوئی بھی ادیب ہم عصر ادبی روایت، ملکی حالات، لوک روایت یا ثقافت سے کٹ کے کوئی زندہ تخلیق یا جیتا جاگتا فن پارہ نہیں تحریر کر سکتا۔ خود مشتاق احمد یوسفی کی آپ بیتی میں عصری شعور کی غیر معمولی کارفرمائی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

۴۰۲صفحات اور ۵۰ابواب میں منقسم عبدالماجد دریابادی کی تحریر کردہ داستانِ زندگی کو۱۹۷۹میں کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔اس آپ بیتی میں ذاتی حالات وواقعات کے علاوہ اجتماعی زندگی کے بھی آثار ملتے ہیں۔ ذاتی زندگی کے حالات وواقعات کے پس منظر میں بھی مذہبی، معاشی، سماجی، تہذیبی عوامل کی کارفرمائی کی نشاندہی کرتے ہوئے ہم عصر اقدار وروایات کے نقوش مرتب کیے گئے۔ جس سے ان کے زمانے اور سماج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ایک طرف وہ تہذیبی بحران، پرانی اقدار کی پامالی کے خلاف احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں، دوسری طرف وہ بے جاقدامت پرستی سے بھی منحرف دکھائی دیتے ہیں۔ مولاناسید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

> یہ کتاب عبدالماجد دریابادی کی زندگی کا مرقع ہے ہی،اس دور اور معاشرت کا بھی آئینہ ہے جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کا سفر طے کیا،کسی زمانہ میں بلکہ قریبی زمانہ میں بھی ان اہلِ قلم اور مورخوں کو بھی اس سے بڑی مدد ملے گی جو اس دور کے تمدن و معاشرت پر کچھ لکھنا چاہیں گے۔۔۔ادب کے طالب علموں بلکہ ادب کے استادوں اور معلموں کو بھی اس میں ادب و زباں کی خوبیاں، لکھنو اور اودھ کے محاورے، اساتذہ کے آبدار اشعار اور جاندار مصرعے اردو ادب وزبان کے گزشتہ دور اور لکھنو کے شاعروں اور ادیبوں سے تعارف ہو گا۔ (۳۷)

مولاناعبدالماجد دریابادی نے اس آپ بیتی میں جدید تعلیم، مذہبی مسائل، بچپن کے ذرائع نقل و حمل، پردے کے رواج، عقائد وتوہمات، ملک کی معاشی حالت، ہندوستان میں مسلمانوں کی سماجی وتہذیبی حیثیت، تقسیم کے بعد کے حالات، چھوٹوں پر سختی اور عورتوں پر بے جاپابندیوں، زمیندار گھرانے کے رہن سہن، غلام اور کنیز رکھنے کے رواج اوران پر بے جا تشدد کا احوال بیان کیا ہے۔ یہ آپ بیتی اس لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذاتی زندگی کے احوال کے ساتھ ساتھ علمی وادبی موضوعات سے لے کر مذہبی، عمرانی، تاریخی اور تہذیبی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس پر عقدہ کشائی نہ کی گئی ہو۔

۳۹۸صفحات اور ۶۲ابواب پر مشتمل ”مٹی کا دیا“ مرزاادیب کی آپ بیتی ہے ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والی یہ آپ بیتی مرزاادیب کے ستر سالہ دورِ زندگی پر محیط ہے۔ابتدا میں یہ آپ بیتی قومی ”اردو ڈائجسٹ“ اور ”ماہِ نو“

میں شائع ہوتی رہی، بعد میں اسے کتاب کی شکل دی گئی۔ میرزاادیب جن کا اصل نام دلاور علی خان تھا اور ادیب تخلص کرتے تھے۔ مٹی کے دیے کی اس روشنی میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیا گیا ہے۔ اس دور کی ادبی روایت، اہم شخصیات، مذہبی تہواوں، ثقافتی دلچسپیوں، ادبی تحریکوں خصوصاً ترقی پسند تحریک پر روشنی ڈالی۔ کشتی پہلوانی کے حوالے سے لاہور میں ہونے والے دنگلوں، دیوالی، دسہرا اور تیوہار، میرزاادیب کی سیاست سے کوئی دلچسپی یا ذاتی وابستگی نہ ہونے کے باوجود اس آپ بیتی پر سیاست کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> مٹی کا دیا ایک فرد کی داستانِ حیات بھی ہے اور ایک عہد کی ثقافتی دستاویز بھی۔ ہماری تہذیب و معاشرت کے بہت سے ایسے پہلو اس میں نظر آتے ہیں، جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ یہ آپ بیتی کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے اور مرزا ادیب نے اپنی ذات کے حوالے سے ایک دور کی مرقع نگاری کی ہے۔ (۳۸)

"مٹی کا دیا" نامی اس آپ بیتی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرزاادیب نے نہایت حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے زندہ و جاوید حقیقتیں پیش کیں اور اس آپ بیتی سے عہدِ رفتہ کی از سرِ نو تخلیق کا کام لیا۔ ۱۹۸۳ء میں "یادوں کا جشن" کے نام سے شائع ہونے والی کنور مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی صرف آپ بیتی نہیں، بلکہ جگ بیتی بن کے سامنے آئی۔ سکھ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے کنور مہندر سنگھ بیدی نے اس آپ بیتی میں ملک کی مذہبی و سماجی صورتحال، معاشرتی و اقتصادی بدحالی تفصیل کرتے ہوئے ذاتی عقائد اور افکار و خیالات کا اظہار کیا۔ ادبی، تہذیبی، ثقافتی اہمیت کی حامل یہ آپ بیتی ہم عصر سماجی و معاشرتی زندگی کا مکمل احاطہ کرتی ہے ۔ملک کی مذہبی صورتحال، ثقافتی رنگ، طبقاتی کشمکش، فرقہ وارانہ فسادات، عدم مساوات، ادبی روایات و اہم شخصیات غرض کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔ اس سلسلے میں انہوں نے حق و انصاف سے کام لیتے ہوئے بے تعصبی، غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا مظاہرہ کیا۔ ان کی آپ بیتی میں ہندو گیتا کے فلسفے، گرو گرنتھ کے اقوال، رسول کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ، حضرت مسیح علیہ السلام کے اعمال سبھی کا ذکر ملتا ہے۔ مہندر سنگھ ہمیشہ قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ جس کے واضح اثرات ان کی آپ بیتی پر بھی مرتب ہوئے۔ مہندر سنگھ نے

نہایت کمالِ مہارت سے زندگی کے تلخ حقائق سے پردہ اٹھایا۔ ادب سے لگاؤ رکھنے کی بناپر یہ آپ بیتی مختلف ادبی شخصیات کے خاکوں سے مزین ہے۔ جن میں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، بسمل شاہ جہانپوری، سید محمد جعفری، شکیل بدایونی، خواجہ حسن نظامی، سمیع اللہ قاسمی، سر شنکر لال اور شیوراج نرائن وغیرہ کے خاکے شامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی اس دور کی ادبی و تاریخی دستاویز ہے جس میں ان کا بہترین عصری شعور کار فرما ہے۔

نامور افسانہ نگار اور نقاد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی لکھی گئی آپ بیتی "گردِ راہ" ۱۹۸۳ء میں منظر عام پہ آئی۔ یہ آپ بیتی صہبا لکھنوی کی فرمائش پہ تحریر کی گئی۔ یہ اشاعت سے پہلے "رسالہ افکار" میں شائع ہوتی رہی جسے ۳۶۰ صفحات اور ۲۰ ابواب میں تقسیم کیا گیا۔ یہ ۳۶۰ صفحات کیا ہیں گویا مختلف تہذیبوں کے اتصال اور عروج و زوال کی ایک مکمل داستان ہے۔ جس میں ان کا عہد جیتا جاگتا قاری کے تخیل میں آن موجود ہوتا ہے۔ صہبا لکھنوی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے:

> گزشتہ نصف صدی پہ محیط ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت سوانح عمری، علم وادب، تہذیب و فکر، سیاست و تمدن، سیر و سیاحت، مشاہدہ و مطالعہ اور عصری آگہی کی ایک ایسی جامع دستاویز ہے جس کی نظیر سوانح عمریوں کے سرمائے میں شاید ہی دستیاب ہو۔ (۳۹)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی زندگی میں مختلف نامور شخصیتوں سے ملاقات کی، ملک ملک گھومے اور مختلف تہذیبوں کا جائزہ لیا۔ یہ آپ بیتی ان کے مختلف ممالک کے اسفار سے حاصل ہونے والے تجزیات و تجربات کا مجموعہ ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے اس آپ بیتی میں ہندوستان، ایران، فرانس، امریکہ، صومالیہ، افریقہ، ایتھوپیا، سپین، جاپان، پاکستان کی تہذیب و ثقافت پر روشنی ڈالی۔ مصنف چونکہ خود ہندوستان میں پلے بڑھے تھے لہذا انہوں نے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی و معاشرتی حالات، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں، تیوہاروں، اہم شخصیات اور رجحانات و میلانات پر قدرے تفصیل سے لکھا۔ خالدہ ادیب، جگر مرادآبادی، سجاد ظہیر، علامہ اقبال، پطرس بخاری، ن۔م۔راشد، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور، ہٹلر، کارل مارکس وغیرہ کو بھی آپ

بیتی کا حصہ بنایا۔ اردو ہندی تنازعے پر روشنی ڈالتے ہوئے اس میں گاندھی کے کردار کی وضاحت کی گئی۔ "پاکستان ناگزیر تھا" کے عنوان کے تحت قیام پاکستان کے پس پردہ وجوہات پر روشنی ڈالی گئی کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں اور وہ کیسے حالات یا کون سے مسائل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو الگ وطن کے مطالبے پر مجبور کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت، قتل وغارت گری اور مہاجروں کے حالات وواقعات پر مشتمل یہ آپ بیتی مشرقی پاکستان اور دہلی کے مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کے بیان پر مشتمل ایک مربوط داستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں رائے پور کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے سیلاب کی تباہ کاریوں اور اس کے اثرات کا آنکھوں دیکھا حال نہایت موثر انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر خالد اختر:

> یہ محض آپ بیتی نہیں جگ بیتی ہے۔ یاداشتوں کی کتاب بھی، نصف صدی کی ادبی سیاسی، تہذیبی داستان بھی، اور نابغہ روزگار ہستیوں کے چلتے پھرتے مرقعوں کا رنگ محل بھی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ایک نادر انسان ہیں اور انہوں نے ایک نادر کتاب لکھی ہے۔[۴۰]

اختر حسین رائے پوری خود اس آپ بیتی کے بارے میں رقمطراز ہیں: "اس کتاب میں، میں نے اپنے ماحول، مشاہدے اور مطالعے کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے صحیح معنوں میں یہ سوانح حیات نہیں بلکہ ایسی تحریر ہے جس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔"[۴۱] یہ آپ بیتی دراصل ساٹھ سال کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کی ایک زندہ دستاویز ہے۔ اس آپ بیتی میں معاصر حالات وواقعات پس منظر کے طور پر اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ اس آپ بیتی ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ "شام کی منڈیر سے" مشہور زمانہ شاعر، نقاد اور انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریر کردہ ہے جو ۱۹۸۶ء میں منظر عام پہ آئی۔ سرگودھا کے گاوں وزیر کوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک کسان کی پچاس سالہ زندگی پر مشتمل یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں جاگیر دارانہ نظام کی عکاسی کرتے ہوئے دیہی و شہری تہذیب و تمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔ دیہی و شہری زندگی کے تضاد کو نمایاں کر کے شہری و صنعتی زندگی کے منفی پہلو سامنے لائے اور شہری زندگی کو اجنبی قرار دیا گیا۔ مشتاق قمر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

شام کی منڈیر سے ایک فرد کی داستانِ حیات ہی نہیں انسان کے سفر حیات کی آرکی ٹائپ بھی ہے۔ یہ ایک ایسی تخلیقی دستاویز ہے۔ جس میں انسانی تاریخ کے سارے ادوار اپنی مکمل فکری شبیہ کے ساتھ منعکس ہوئے ہیں۔ (۴۲)

اس آپ بیتی میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۸۰ء تک کے مکمل سیاسی، سماجی، تہذیبی و تمدنی کوائف فراہم کیے ہیں۔ تقسیم ہند، ہجرت کے وقت قافلوں کے لٹنے اور قتلِ عام کی منظر کشی، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ، ۱۹۲۹ء کے عالمی بحران کے بعد ملک کی معاشی و اقتصادی زبوں حالی اور سماج خصوصا سفید پوش طبقے پر ہونے والے اثرات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انجمن ترقی اُردو، ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی اور محکمہ اطلاعات سے تعلق رکھنے والے جلیل قدوائی نے جہاں شاعری، افسانہ نگاری، اور تحقیق و تنقید میں اپنی قابلیت کا سکہ جمایا وہیں "حیاتِ مستعار" کے نام سے اپنی زندگی کی کہانی کو بھی دوام بخشا۔ جلیل قدوائی کے عصری شعور کے بارے میں مشفق خواجہ لکھتے ہیں: "قدوائی صاحب نے جس خوش اسلوبی اور تفصیل کے ساتھ اپنے عہد کی معاشرت کو بیان کیا ہے اس کی اُردو میں دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔"(۴۳) ڈاکٹر حسن وقار گل لکھتے ہیں:

حیاتِ مستعار کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ بیتی ہونے کے ساتھ جگ بیتی بھی ہے۔ اس میں اس زمانے کی معاشرت، شہروں کا حال اور اشخاص کے کردار کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ رسوم ورواج، مذہبی وثقافتی پہلوؤں کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ گویا کتاب کیا ہے موجودہ صدی کے ربع اوّل کے اودھ کا بھرپور مرقع ہے۔ (۴۴)

قدیم وجدید تہذیب کے حسین امتزاج سے مزین یہ آپ بیتی صرف آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی بن کر سامنے آئی۔ جس میں جلیل قدوائی نے اپنے دور کے رسم ورواج، قدیم وجدید تہذیب کے سنگم اور زمانے کے بدلتے تیور نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیے۔ "وادی جمنا سے وادی ہاکڑہ تک" شہاب دہلوی کی آپ بیتی ہے جو ۱۹۸۷ء میں منظر عام پہ آئی۔ اس آپ بیتی میں دلی اور بہاولپور کی دو مختلف تہذیبوں کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد کے بہاولپور کا موازنہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے دور کو تاریخی، مذہبی، معاشی، سیاسی ہر پہلو سے بیان کیا۔ اس آپ بیتی میں دلی اور بہاولپور کی طرز بود وباش، سیاسی، ثقافتی اور ادبی تنظیموں، مذہبی رجحانات اور دہلی سے بہاولپور تک کے تمام مشہور و معروف شعرا و ادباء کا ذکر ملتا ہے۔

"کھوئے ہوؤں کی جستجو" شہرت بخاری کی آپ بیتی ہے جس میں عصری شعور کی جھلک صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔اس آپ بیتی میں سیاسی تحریکوں، سماجی تغیرات، مارشل لاء اور اس کے نتیجے میں در آنے والی معاشرتی بے حسی کا بیان ملتا ہے۔شہرت بخاری عملی طور پر پاکستان پیپلز پارٹی سے وابستہ تھے اس سلسلے میں انہیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اس آپ بیتی میں قید و بند کی صعوبتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ قائد اعظم کی وفات، مسجد شہید گنج، غازی علم الدین کی شہادت، ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی جیسے اہم واقعات پر اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔اسی طرح محرم کے حوالے سے جلسے جلوس، ماتم و عزاداری، واقعاتِ کربلا اور ذوالجناح وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اس عہد کی سماجی حالتِ زار، روایت و اقدار، اہم شخصیات، ادبی روایت اور شاعروں کی معاصرانہ چشمک پر بھی روشنی ڈالی ہے۔"شہاب نامہ" گلگت سے تعلق رکھنے والے مشہور زمانہ مصنف قدرت اللہ شہاب کی آپ بیتی ہے۔جو ان کی وصیت کے عین مطابق ان کی وفات کے ایک سال بعد ۱۹۸۷ء میں منظر عام پہ آئی۔قدرت اللہ شہاب انڈین سول سروس کا امتحان پاس کر کے اہم ترین سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

انہیں صدر کے پرسنل سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہنے کی بدولت تین اہم سیاسی شخصیات جنرل غلام محمد، صدر سکندر مرزا اور صدر ایوب خان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا یہی وجہ ہے ان کے ہاں سیاسی شعور نہایت گہرا اور وسیع ہے۔اس آپ بیتی میں تحریک آزادی، بیوروکریسی، قحطِ بنگال، مذہبی رجحانات، سیاسی جماعتوں کے خفیہ منصوبوں، مسلمانوں کے قتل عام، پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام اور نیل کے کاروبار پر روشنی ڈالتے ہوئے مذہبی، معاشی معاشرتی، سیاسی زندگی کے ہر پہلو کی نشاندہی کی گئی۔ہندوؤں کے مقبول سیاسی نعرے (انقلاب زندہ باد، مورکھ سیٹھ ناش ہو، ہندوستان چھوڑ دو، نیتا جی۔جے ہند) سکھوں کے نعرے (راج کروں گا خالصہ۔ باقی رہے نہ کو)

"راج کروں گا خالصہ" کے عنوان کے تحت سکھوں اور مسلمانوں کی مخاصمت، سکھوں کے مروجہ رسوم و رواج، گیتوں، نعروں اور تہواروں پہ روشنی ڈالی ہے سکھوں کی تہذیب و ثقافت اور مذہبی رسومات سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے سکھوں کے سالانہ تہوار سنگھ سبھا کے تہوار، پانچ ککوں (کنگھا، کیس، کچھ، کڑا، کرپان) کے نام، جپ جی، ارداس، اساوری، گرو گرنتھ، نمسکار وغیرہ جیسے مذہبی وثقافتی عناصر، تقسیمِ ہند کے بعد

مہاجرین کی صورتحال، اشیائے ضروریات کی قلت، صابن کی جگہ مٹی سے ہاتھ دھونے، "جموں میں پلیگ" کے عنوان کے تحت جموں میں طاعون کی وبا پھیلنے پر دھڑا دھڑ ہونے والی اموات، ہجرت اور سماجی رویوں میں در آنے والی تبدیلی کی نہایت جاندار عکاسی کی گئی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ان دنوں جموں شہر میں ہر روز دس دس پندرہ پندرہ لوگ طاعون سے مرتے تھے، گلی کوچوں میں چاروں طرف خوف ہی خوف چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ گاہک دکانوں کا کن اکھیوں سے جائزہ لیتے تھے کہ کہیں بوریوں اور ڈبوں اور کنستروں کے آس پاس چُوہے تو نہیں گھوم رہے۔ دکاندار گاہکوں کو شک و شبہ سے گھورتے تھے کہ ان کے ہاں پلیگ کا کیس تو نہیں ہوا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا اور ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ سڑک پر راہگیر ایک دوسرے سے دامن بچا بچا کر چلتے تھے (۴۵)

اس باب میں بتایا گیا کہ اس مشترکہ تہذیب میں مسلمانوں کو طنزیہ و استزائیہ انداز میں مسلے کہنا اور ان کے جذبہ جہاد کا مذاق، اذان سنتے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا اور چھوت چھات کی بیماری کس قدر عام تھی۔ کسی کام کے لیے روانگی کے وقت کسی کے چھینکنے کو بدشگونی کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ لکھتے ہیں:

> مکسود ن پادھا چمکور صاحب کے ہندوؤں کا پروہت تھا سکھ اور مسلمان بھی اس سے اپنے بچوں کی جنم پتریاں بنواتے تھے۔ نجوم اور رمل میں مہارت کے باعث سارے گاؤں میں شادی بیاہ کی تاریخ، سفر پر روانہ ہونے کی ساعت اور مرگ وحیات کی جملہ رسومات کا پروگرام وہی طے پاتا تھا۔۔۔ اذان کی آواز پر وہ خالی ٹین بجانا شروع کر دیتا تھا تاکہ بول سنائی نہ دیں۔ درود شریف سُن کر وہ دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا تھا جب کبھی وہ ہمارے محلے سے گزرتا تھا تو مسلمان بچے زور زور سے درود شریف پڑھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے تھے۔ یہ سن کر مکسود ھن پادھا کانوں میں انگلیاں دیئے اتنی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیتا تھا کہ ہم لوگ بھی اس کے تعاقب میں بری طرح ہانپنے لگتے تھے۔ (۴۶)

اس آپ بیتی سے اس دور کی مذہبی صورتحال اور منافرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کی تہذیب کیا تھی اور سیاسی سماجی اور مذہبی حالات کیا تھے۔ بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی جگ بیتی کی حیثیت رکھتی ہے۔

سو سے زائد تصانیف کے خالق معروف محقق، خاکہ نگار اور نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تخلیق کردہ آپ بیتی "یادِ عہدِ رفتہ" ۱۹۸۸ء میں ایک تاریخی و سیاسی آپ بیتی کے طور پہ سامنے آئی۔ جس میں ملک کے مذہبی، سیاسی ، معاشرتی حالات بیان کرتے ہوئے دیہی ماحول کی بھی عکاسی کی گئی اور پٹھان قوم کی تہذیب و ثقافت پر روشنی ڈالی گئی۔ خود ڈاکٹر عبادت بریلوی اس تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میں اپنے بارے میں کم، اپنے زمانے اور ماحول کے بارے میں زیادہ لکھوں گا۔ تاکہ جو کچھ میں نے گذشتہ نصف صدی میں دیکھا ہے جو حالات مجھے نظر آئے ہیں، جو واقعات میری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں، جن بزرگوں اور دوستوں سے میں نے اثر قبول کیا ہے ان سب کی ان گنت تصویروں کا ایک مرقع تیار کر سکوں۔ (۴۷)

یہ آپ بیتی خاص طور پر تحریکِ آزادی، تقسیم ہند، ۱۹۴۷ء کی ہجرت و فسادات کو موضوع بنا کر تحریر کی گئی۔ اس آپ بیتی میں مختلف رسم و رواج اور تہواروں بالخصوص عید، بقر عید، شب برات، محرم کے جلسے جلوس، تعزیے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ براڈ کاسٹنگ کی دنیا سے تعلق رکھنے والے نامور شاعر، نقاد، ادیب اور محقق حمید نسیم نے زندگی کے نشیب و فراز کو "ناممکن کی جستجو" کا عنوان دیا۔ ریڈیو کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے والے حمید نسیم خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ حمید نسیم نے ۱۹۶۵ء کے سیاسی ماحول اور پاک بھارت جنگ میں ریڈیو کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے، ملکہ ترنم نور جہاں اور مہدی حسن کی خدمات کو بھی سراہا۔ لکھتے ہیں کہ ریڈیو اسٹیشن محاذ جنگ سے صرف آٹھ میل دور تھا۔ میڈم نور جہاں ایک بہادر خاتون تھیں جو جنگ سے ذرا بھی خائف نہ ہوئیں۔ امانت علی خان، فتح علی خان اور میڈم نور جہاں نے ایسے نغمے گائے کہ ساری قوم کے حوصلے بلند ہو گئے یہ نغمے ہر پاکستانی کے دل کی آواز تھے۔ میڈم نور جہاں نے ریڈیو پاکستان پر ایک اور ڈیفنس لائن بنادی۔ جناب اعجاز بٹالوی بھی قوم کے دل کی آواز تھے۔ جو روزانہ بھارتی پروپیگنڈہ کے جواب میں بڑی زوردار تقریریں نشر فرما رہے تھے۔ ضیا جالندھری، حامد مدنی، اعجاز حسین بٹالوی، الطاف گوہر، محمود ایاز، محمود نظامی، مختار بیگم، فریدہ خانم، ملکہ پکھراج، پریم راہی، استاد اسد علی خان جیسی ملک کی نامور شخصیات کے خاکہ جات آپ بیتی میں ایک خوبصورت اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

حمید نسیم کی یہ سوانح ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں ہماری گزشتہ ساٹھ برس کی تہذیبی زندگی کی بیانیہ تصویریں موجود ہیں۔ یہ نہ صرف واقعات کا تذکرہ ہے بلکہ سیاسی سماجی اور ادبی شخصیات اپنی پوری توانائی اور تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ (۴۸)

ضلع گورداسپور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ گورداسپور ایک چھوٹا صاف ستھرا شہر تھا۔ روزانہ ایک بیل گاڑی آتی اور صبح شام پانی کا چھڑکاؤ کر جاتی۔ میونسپل کمیٹی کی طرف سے ایک آدمی کی ڈیوٹی بھی لگی تھی جو روزانہ شام سڑک کنارے لگی لالٹین روشن کرنے آتا۔ لالٹین کے شیشے چمکانا، تیل ڈالنا، رات کو لالٹین جلانا اور صبح بند کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ حمید نسیم نے آپ بیتی میں مسلم تہذیب کی نمائندگی کے سلسلے میں تہذیب کے مثبت و منفی ہر دو پہلوؤں کی نشاندہی کی اور لسانی فضا پیش کرتے ہوئے زبان و بیان کے روابط کا اضافہ کیا۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس آپ بیتی میں ایک پورا دور سانسیں لیتا محسوس ہوتا ہے جو حمید نسیم کے عصری شعور کی دلیل ہے۔

معروف معیشت دان و ادیبہ حمیدہ سالم نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو "شورشِ دوراں" کا نام دیا۔ حمیدہ سالم نامور شاعر اسرار الحق مجاز کی چھوٹی بہن ہیں اور آپ بیتی کا عنوان بھی انہی کی غزل کے ایک مصرعے سے ماخوذ ہے۔ ان کی ۳۲۶ صفحات پہ مشتمل یہ آپ بیتی ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پہ آئی۔ حمیدہ سالم کا تعلق یوپی کے قصبہ رودولی سے تھا۔ آپ بیتی میں لکھنو اور یوپی کے تیج تیوہار اور میلے ٹھیلے پوری آب تاب سے جلوہ افروز دکھائی دیتے ہیں۔ مصنفہ نے مشرقی یوپی کے طرز معاشرت، رسم ورواج، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب، ہندوؤں کے مسلمانوں سے باہمی روابط اور جاگیر دارانہ زندگی کے ٹھاٹ باٹھ کے بارے میں اس طرح معلومات فراہم کی ہیں کہ ان کا دور مجسم صورت میں قاری کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مصنفہ نے جاگیر دارانہ نظام کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے عروج و زوال اور خوبیوں خامیوں کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔ لکھتی ہیں کہ چالیس چالیس گاؤں اور کئی باغ ایک زمیندار کی ملکیت ہوا کرتے تھے جن کی دیکھ بھال کاشتکار کیا کرتے تھے۔ زمینداروں کے گھر پھل، اناج، گھی، تیل کے پیپے اور ترکاریوں کے ٹوکرے پہنچانا کاشتکاروں کی ذمہ داری تھی۔ آم کی فصل آتی تو صبح سویرے کاشتکار کی عورت آم کے ٹوکرے سر پر رکھے زمیندار کے گھر جاتی دکھائی دیتی۔ جاگیر دارنہ نظام کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ نظام کے پھلنے پھولنے کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ پہلے جاگیر دانہ نظام تھا تو اب سرمایہ دارانہ نظام۔

پہلے کاشتکار یا کسان تھے تو اب مزدور نے اس کی جگہ لے لی۔یعنی کھیل وہی کھیلا جا رہا ہے صرف نام کا فرق ہے۔مصنفہ نے جاگیر دانہ نظام میں لگان کی وصولی اور بلا معاوضہ بے گار کی مشقت پر بھی روشنی ڈالی ہے جو اس وقت کا اہم مسئلہ تھا۔مصنفہ کو خاوند کے ساتھ سوڈان جانے کا اتفاق ہوا۔جہاں دو سالہ قیام کے تجربات و مشاہدات کو آپ بیتی کا حصہ بناتے ہوئے سوڈان کے دارالخلافہ خرطوم کے محل وقوع، تاریخ و تہذیب، طرز بود و باش وغیرہ سے روشناس کرایا ہے۔مصنفہ نے سوڈان کے نسلی و لسانی حوالے بھی فراہم کیے ہیں۔سوڈان میں شادی بیاہ کی روایت و اقدار کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ شادی کے وقت بارات کا سارا خرچ لڑکے کی ذمہ داری ہوتی تھی۔اور لڑکے والے بارات کے ساتھ گوشت کے لیے دنبے بکرے، گھی کے کنستر اور میدے کی بوریاں وغیرہ بھی ساتھ لے کے جاتے۔تہذیب و تمدن کے علاوہ تعلیمی، مذہبی، سیاسی لحاظ سے بھی یہ آپ بیتی اپنے دور کے عصری شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ایک جگہ لکھتی ہیں:

> اس زمانے میں سال میں دو لمبی چھٹیاں ہوتی تھیں، گرمیوں کی اور کرسمس کی۔کرسمس آقاؤں کا تہوار تھا اور بڑا دن کہلاتا تھا۔گرمیوں کی چھٹیاں اس لیے کہ ٹھنڈے ملک کے باشندے گرمی سے پریشان ہوتے تھے۔ہولی، دیوالی، عید، بقر عید کی چھٹی ہو جاتی تھی۔
>
> (۴۹)

اس اقتباس کی چند لائنوں میں آپ بیتی نگار نے ملک کی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی فضا کو نہایت اختصار اور جامعیت سے سمویا یہ ان کے عصری شعور اور فنی قابلیت کا نتیجہ ہے ۔''اس آباد خرابے میں ''مشہور شاعر، مکالمہ نگار، آتش بیاں مقرر، شعلہ گفتار خطیب اور اسکرین پلے رائٹر اختر الایمان کی آپ بیتی ہے۔اختر الایمان نے یہ آپ بیتی محمود ایاز کے کہنے پہ تحریر کی یہ آپ بیتی پہلے پہل محمود ایاز ہی کے پرچے ''سوغات ''میں شائع ہوتی رہی بعد ازاں ۱۹۹۶ء میں اردو اکادمی دہلی نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔اختر الایمان نے شعور کی رو کا استعمال کرتے ہوئے زندگی کی کہانی ماضی، حال اور مستقبل کو نہایت مربوط انداز میں پیش کیا۔اختر الایمان نے امرد پرست اور اغلام بازی کا ذکر کرتے ایسے لوگوں کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہوئے یہ احساس دلایا ہے کہ یہ اٹیلیکچو ئلزم اس دور کی اجتماعی سائیکی کا درجہ پا چکی تھی۔ایک بستی قلعہ پتھر گڑھ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہاں

نجیب الدولہ کا بڑے بڑے پتھروں سے بنوایا ہوا ایک قلعہ ہے، جس کی مناسبت سے اسے پتھر گڑھ کہتے ہیں۔ اس بستی کے دوسرے نام گھسٹ پوری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے کہ جب نجیب الدولہ کو انگریز حکمران کے مقابلے پر شکست ہوئی اور قلعہ خالی کرنے کے حکم پر انہوں نے ساتھیوں سمیت قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر نکالا گیا۔ بھانتو نامی ایک مشہور زمانہ جرائم پیشہ قبیلے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ آدمی واسی قسم کے لوگ تھے۔ انہیں اکٹھا کر کے ایک جگہ اسی قلعے میں محصور رکھا گیا تھا۔ ان میں سے کوئی جب کہیں جاتا اپنی حاضری لگوا کر جاتا۔ سلطانہ ڈاکو اسی قبیلے کا ایک فرد تھا جو بعد میں دیوار پھاند کر بھاگ نکلا اور جنگل میں جائے پناہ ڈھونڈ لی۔ اس آپ بیتی سے ان کے دور کی مذہبی صورتحال کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ سورج دیوتا کی پرستش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> یہاں جگادھری میں گندے نالے کی دوسری طرف بہت سے باغ تھے اور کنڈ کے کنارے کئی مندر تھے اس جگہ کو غالباً سورج کنڈ کہتے تھے۔ میں کسی تنہا گوشے میں کنڈ کے کنارے سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ جاتا تھا اور لوگوں کو کنڈ میں پوجا کرتے اور پیسے پھینکتے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی کنڈ میں نہاتا تھا اور وہ پیسے کیچڑ میں سے چنتا تھا جو لوگ پوجا کے وقت پھینکتے تھے۔ (۵۰)

اختر الایمان نے اپنی آپ بیتی میں جہاں سماجی، معاشرتی نظارے پیش کئے ہیں وہیں اس وقت کی ادبی تحریکات، رویوں اور رجحانات پہ بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس آپ بیتی میں ن۔م۔ راشد، میراجی، جوش ملیح آبادی، بسمل شاہ جہاں پوری، صابر دہلوی، کرشن چندر، ملک راج آنند، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض یوسف ناظم، سردار جعفری، جیسے تمام مشاہیر کا ذکر ملتا ہے۔ انتظار حسین کی آپ بیتی "چراغوں کا دھواں" ۱۹۹۹ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔ ۳۶۱ صفحات اور یادوں کے پچاس برس پر مشتمل یہ آپ بیتی اپنے اندر اس دور کے کئی شاعروں ادیبوں کے خط اور کالم بھی شامل کیے ہوئے ہے۔ یہ آپ بیتی بھی تقسیم ہند اور ہجرت کے بعد ہی لکھی گئی لیکن دوسری آپ بیتیوں سے اس طرح مختلف ہے کہ اس میں مظلومیت کی ذاتی کہانی سنا کر ہمدردیاں سمیٹنے سے احتراز برتا گیا۔ یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جو صحیح معنوں میں جگ بیتی کہلانے کے لائق ہے۔ اس میں ہجرت کے بعد

لاہور کا سماجی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے کہ کون کس طرح، کہاں سے، کیسے آیا اور کہاں ٹھکانہ کیا۔ اس آپ بیتی میں تقسیم ہند، ہجرت، سیاست کے لیے شب خون، مارشل لاء، رائٹرز کے راگ درباری، میڈیا پر پابندی، ۱۹۶۵ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی جیسے تمام موضوعات کی موجودگی آپ بیتی نگار کے عصری شعور کی پختہ دلیل ہے۔ اس آپ بیتی سے اس دور کا ادبی پس منظر بھی سامنے آتا ہے انتظار حسین نے شاعروں، ادیبوں، ادبی تنظیموں اور مشاعروں کا حال لکھتے ہوئے مکمل تفصیلات فراہم کیں کہ کس کی کس سے ادبی چشمک تھی، کس کا کیا تکیہ کلام تھا۔ مارشل لاء اور اظہار رائے کی پابندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ مارشل لاء لگ گیا۔ آنے والے انتخابات کی گہما گہمی ختم۔ جلسے جلوس بند۔ لب بند، زباں بند، اخباروں پہ اوس پڑ گئی۔ لیڈروں کی بیان بازیاں قصہ ماضی ہوئیں۔ اب اخبارات میں ان کی جگہ مارشل لائی احکامات نے لے لی تھی۔ (۵۱)

اسی طرح ان کی پوری آپ بیتی ہم عصر زندگی کے خارجی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ عصری شعور ان کے ہاں اپنی تمام تر وسعتوں اور رعنائیوں سمیت جلوہ گر ہوا ہے۔ "منزلیں گرد کی مانند" نامور شاعر، نقاد، افسانہ نگار، فلمساز اور صحافی خلیق ابراہیم خلیق کی زندگی کی روداد ہے۔ جو ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پہ آئی۔ اس آپ بیتی کا عنوان فراق گورکھ پوری کے ایک شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف میں "کامیاب ناکام"، "عورت، مرد اور دنیا"، "اجالوں کے خواب"، "اردو غزل کے پچیس سال" شامل ہیں۔ ۷۷۶ صفحات اور ۱۳۲ ابواب پہ مشتمل "منزلیں گرد کی مانند" نامی آپ بیتی ابراہیم خلیق کے ۷۲ برس کے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہے۔ پہلے پہل یہ آپ بیتی رسالہ "افکار" اور "ارتقاء" میں شائع ہوتی رہی۔ مذہب، سیاست، ثقافت اور ادبی نشستوں کے احوال نے اس آپ بیتی کو آفاقی بنیادوں پر لا کھڑا کیا۔ ابراہیم خلیق نے الٰہ آباد، دہلی، لکھنو، اجمیر شریف، لاہور اور کراچی کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے برصغیر کو ایک ثقافتی مرکز کے طور پہ متعارف کروایا۔

اہلِ لکھنو کی عیش پرستی، رنگین مزاجی کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سال بھر مذہب سے دور رہنے والے محرم میں مجالس عزاء، امام باڑوں میں غمِ حسین منانے اور بیبیوں کی مجالس کے انعقاد کو کتنا متبرک سمجھتے۔ ابراہیم خلیق نے ہندوستان کے زوال آمادہ جاگیر دارانہ نظام کی عکاسی کرتے ہوئے طبقاتی کشمکش اور مزدور طبقے کے

مسائل کو بھی اجاگر کیا۔ روشن خیال اور قدامت پسند طبقے کے مابین محاذ آرائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی آپس میں حد درجہ ٹھنی ہوئی تھی۔ اس دور کی اہم ترین بحث خواتین کا پردہ تھا جس پر مولوی حضرات بھی دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروہ قدامت پسند اور ایک ترقی پسند یا روشن خیال مولویوں کا تھا۔ سرسید تحریک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب سرسید نے جدید مغربی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کے لیے تحریک کا آغاز کیا تو روایت پسند اور قدامت پرست طبقے نے اس کی بہت مخالفت کی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تحریک زور پکڑتی گئی اور جلد ہی مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج ہو گئی۔ اس آپ بیتی میں وہابی تحریک، اردو ہندی تنازعے، کانگرس، مسلم لیگ، شدھی، سنگھٹن، سائمن کمیشن، میثاقِ لکھنو، نہرو رپورٹ، خلافت کمیٹی اور انقلابِ روس کا بیان ان کے سیاسی شعور کی بیداری کا عکاس ہے۔ ابراہیم خلیق کے علمی و ادبی حوالے بھی نہایت معتبر ہیں۔ انہوں نے ادبی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے نظم و نثر کی تقریباً تمام اصناف اور اہم ادبا و شعرا کا ذکر بھی کیا ہے۔

"تمنا بے تاب" نامور افسانہ نگار، محقق، نقاد ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی ہے۔ ۳۲۷ صفحات پہ مشتمل یہ آپ بیتی ۲۰۰۱ء میں منظر عام پہ آئی۔ ڈاکٹر رشید امجد عصری مسائل اور سماجی بگاڑ سے بخوبی آگاہ تھے۔ "تمنا بے تاب" سماجی و معاشرتی اصلاح کی ایک تمنا ہے جو ان کے سینے میں بے تاب دکھائی دیتی ہے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب میں دونوں اطراف کی تہذیبوں نے اپنی اثر پذیری دکھائی۔ یہی وجہ تھی کہ کہیں ہندوؤں میں پردہ رائج نظر آتا تو کہیں مسلمان جنم پتریاں بنواتے دکھائی دیتے۔ سفر کے آغاز، بچوں کے نام کے انتخاب سے قبل ہندو جوتشی کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ ڈاکٹر رشید امجد ہم عصر سیاسی فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے دوسری جنگ عظیم دوم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جنگ کے تباہ کن واقعات نے لوگوں کے دل و دماغ پہ خوف طاری کر دیا۔ ہر طرف عدم تحفظ، یاسیت، بے بسی پھیلی تھی۔ نئی نئی اصطلاحات سامنے آنے لگیں۔ انہی دنوں "جرمن متو" نامی اصطلاح خوف کی علامت کے طور پر مقبول ہوئی۔ لکھتے ہیں اس زمانے میں ریڈیو کسی کسی کے گھر ہوتا تھا جو صرف خبریں سننے کا کام دیتا تھا۔ خبروں کا وقت ہوتے ہی لوگ ریڈیو کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کی سیاسی و سماجی فضا پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس زمانے میں اکثر چیزیں راشن سے ملتی تھیں اور عموماً بلیک ہوتی تھیں۔ مارشل لاء نے

ذخیرہ اندوزی پہ زد لگائی۔ دکانوں پہ لائنیں لگ گئیں۔ راجا بازار میں ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو کر میں نے بھی ایک الارم والی گھڑی خریدی۔۔۔ امی نے بھی قطار میں کھڑے ہو کر ایک ریشمی سوٹ لیا۔ پاکستانی بہت سیدھے ہیں وقتی طور پر ملاوٹ کے خاتمے، ذخیرہ اندوزی میں کمی ہی پر خوش ہو گئے۔ ملاوٹ کرنے والوں نے خوف سے لئی کے کنارے نقلی چیزوں کے ڈھیر لگا دیے۔ ان خاص طور پر مرچیں، ہلدی اور چائے شامل تھی۔ (۵۲)

رشید امجد نے آپ بیتی میں قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات و واقعات اور پاکستانی سیاست پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ذاتی موقف بھی پیش کیا۔ رشید امجد نے جمہوریت پسند ہونے کے باعث مارشل لاء کو ناپسند کرتے ہوئے آزادی اظہار کی حمایت کی۔ رشید امجد معاشرتی خرابیوں اور سماجی بگاڑ کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سماج میں ہمیشہ نظام کی خرابی کا رونا رویا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک بنیادی خرابی ہی یہی ہے کہ ہم ابھی تک اسی نو آبادیاتی نظام میں جی رہے ہیں جو سامراج نے ہمارے لیے قائم کیا تھا۔ رشید امجد کے خیال میں پولیس، عدلیہ اور تعلیم کے شعبوں میں تبدیلی لائے بغیر نظام کی اصلاح ممکن ہی نہیں۔

لیاقت علی خان کی کشمیر پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے جنرل اکبر کی سرکردگی میں چند فوجی افسروں نے جو لائحہ عمل اختیار کرنے کی کوشش کی وہ پنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سال یعنی پنڈی سازش کیس کے فوراً بعد ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندیاں عائد کر کے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اسی دوران اگرچہ لیاقت علی خان نے نہرو کو مکہ دکھا کر اپنے خلاف لگائے گئے ان الزامات کو کہا کہ ان کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے، رد کرنے کی کوشش کی لیکن یہ مکہ ہوا ہی میں لہرا تا رہ گیا۔ (۵۳)

رشید امجد نے معاصر ادبی منظر نامے پہ بات کرتے ہوئے اس دور کی ادبی روایت اور ادبی تحریکوں کا ذکر کیا اور اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، افتخار عارف، احمد جاوید، فتح محمد ملک، وزیر آغا، جمیل جالبی، کشور ناہید، پروین شاکر کے فن و شخصیت کو اجاگر کیا۔

۲۸۸ صفحات اور ۱۳ ابواب پہ مشتمل ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے فرزندِ ارجمند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے قلم سے منظرِ عام پہ آنے والی آپ بیتی "اپنا گریبان چاک" ہم عصر رویوں اور رجحانات کی بہترین عکاس ہے۔ اس آپ بیتی میں ایک عام سماجی رویئے اور اس کے نفسیات پہ اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کسی نامور سیاسی، سماجی یا ادبی شخصیت سے جڑے رشتے بھی ہمیشہ اسی شخصیت کے حوالے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے سماجی رویوں کے لحاظ سے ذاتی نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عام طور پہ کسی نامور شخصیت کے چاہنے والے بے شمار پرستار ہوتے ہیں جن کے نزدیک اس شخصیت کی حیثیت ایک تناور درخت کی ہے۔ اس درخت کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے پودے خواہ کتنے ہی قد آور اور تنومند کیوں نہ ہو جائیں اس درخت کے مقابلے پر ان کی حیثیت دبی ہی رہے گی۔ اسی آپ بیتی میں جاوید اقبال نے علامہ محمد اقبال کے تاریخی خط کا جواب بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں وہ ان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اجتہاد کی نہیں اتحاد کی ضرورت ہے۔ آپ بیتی میں پاکستانی قوم کی معاصر صورتحال کے پیش نظر یہ سوال اٹھایا کہ کیا واقعی ہم آزاد ہیں؟ مذہبی صورتحال پہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج کے مسلمان اپنے آپ کو صرف اس لیے مسلمان سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا۔ اس سے زیادہ ان کی زندگی میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں۔ جاوید اقبال نے مختلف ممالک کی ثقافتی جھلکیاں پیش کرتے ہوئے آپ بیتی کو آسٹریلیا، امریکہ، چین، روس اور ترکی کی رنگین ثقافت سے مزین کیا۔ آپ بیتی میں تحریکِ آزادی، مسلم لیگ کی کاروائیوں، کارکنوں کی گرفتاریوں، تقسیمِ ہند، ہندو مسلم فسادات، پاکستان کی سیاست و صحافت پہ لکھتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے گہرے عصری شعور کا ثبوت فراہم کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> تحریکِ پاکستان کے زور پکڑنے کے ساتھ ساتھ پنجاب میں اس کی حکومتی مخالفت بھی بڑھنے لگی۔ چناچہ خضر حیات کی یونینسٹ حکومت نے پنجاب میں مسلم لیگی کارکنان کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اسی طرح واحد مسلم لیگی انگریزی اخبار ڈان کے پنجاب میں داخلہ پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ نتیجہ میں اکثر مسلم طلباء کے گروہوں نے اپنے گھروں میں بیٹھے خفیہ طور پر وائس آف اسلام کے نام سے اخبار جاری کیے جو مسلم لیگی کارکنان کی گرفتاریوں کی خبریں شائع کر کے باقاعدہ عوام میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ (۵۴)

ہندو مسلم فسادات کے بارے میں لکھتے ہیں:

۱۹۴۶ء کے اواخر ہی سے ہندو مسلم یا سکھ مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔لاہور میں ہر شام کرفیو لگتااور قتل عموماً کرفیو لگنے سے چند منٹ قبل ہوتے۔ قاتل باقاعدہ ہیلمٹ پہن کر واردات کرتے جیسے کوئی فوجی آپریشن ہو رہا ہو۔ہمارے علاقہ میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی اس لیے اگر کوئی اکادکا سکھ یاہندو سائیکل سوار میوروڈ پر بھاگم بھاگ اپنے گھر مغلپورہ کی جانب جارہا ہوتا تو چند ہی لمحوں بعد اس کی چیخ وپکار سنائی دیتی یا لاش سڑک پر تڑپتی ہوئی نظر آتی۔ (۵۵)

مصنف نے پاکستانی سیاست اور عدالتی نظام پہ قلم فرسائی کرتے ہوئے مختلف سیاسی،مذہبی اورادبی شخصیات سے ملاقات کا احوال بیان کیاجن میں قائداعظم محمد علی جناح ،فاطمہ جناح،ذوالفقار علی بھٹو،سروجنی نائیڈو،پنڈرت نہرو،اندرا گاندھی اور سر راس مسعود وغیرہ شامل ہیں۔

"پردے سے پارلیمنٹ تک" آپ بیتی تحریکِ پاکستان کی سیاسی وسماجی رہنما،افسانہ نگاراور سفارت کار بیگم شائستہ سہروردی کی ہے جو پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی اور یو این او کی رکن بھی رہیں۔"کوشش ناتمام"،"دلی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے" اور "پردے سے پارلیمنٹ تک" ان کی اہم تصانیف ہیں بیگم شائستہ سہروردی کو ان کی خدمات کے اعتراف میں نشان حیدر سے بھی نوازا گیا۔ بیگم شائستہ سہروردی نے ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں جنم لیااور ۲۰۰۰ء کو بالآخر خالق حقیقی سے جاملیں۔یہ آپ بیتی ان کی ۸۵سالہ زندگی کے سرد وگرم کے ساتھ ساتھ گردوپیش کے حالات کی بھی پوری پوری خبر دیتی ہے۔ہندوستان کی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب،جہدوجہد آزادی، قیامِ پاکستان اور پاکستان کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی ایک روداد ہے جسے مصنفہ نے نہایت کمالِ مہارت سے آپ بیتی کے لبادے میں پیش کیا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے،یہ آپ بیتی سماجی تغیر کی ایک ایسی داستاں ہے جس میں قدیم طرز معاشرت کی عکاسی بھی ملتی ہے اور مغربی تہذیب کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ آپ بیتی مشرقی ومغربی تہذیبوں کا ایک حسین سنگم ہے جس میں بیسویں صدی کے پہلے بڑے عالمی تنازعے یعنی پہلی جنگِ عظیم کے منظر نامے پر روشنی ڈالتے ہوئے جنگ کے نتائج واثرات واضح کیے گئے ہیں۔ آپ بیتی نگار ۱۹۲۰ء کے ہندو مسلم اتحاد اور تحریکِ ترکِ موالات کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس دور میں پہلی بار ہندو مسلم اتحاد دیکھنے کو ملا دراصل پہلی

جنگ عظیم کے وقت اسلام کا مرکز ترکی تھا۔ برطانیہ اور جرمنی کی جنگ میں ترکی کی شمولیت نے ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان کر دیا کہ شکست کی صورت میں ترکی کے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے انگریزوں کا اس شرط پہ ساتھ دیا کہ ترکی میں مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ تاہم جنگ میں فتح کی صورت انگریز نے وعدہ خلافی کا مظاہرہ کیا۔ رد عمل کے طور پر ہندوستانی مسلمانوں نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور کئی تحریکیں بھی چلائیں۔ مصنفہ نے جنگ کا مکمل عالمی منظر نامے پیش کرتے ہوئے تحریک ترکِ موالات کو ترکوں سے اظہارِ یک جہتی کے طور پہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ترکوں سے ہمدردی کا یہ اظہار صرف زبانی کلامی نہیں تھا بلکہ اس کے لیے عملی احتجاج کرتے ہوئے انگریز کی لائی ہوئی مصنوعات اور ہر چیز کا بائیکاٹ کیا جانے لگا۔ یہاں تک کے طلباء نے یونیورسٹی ترک کر دی اور مزدوروں نے گورنمنٹ نوکریوں کو خیر باد کہہ دیا۔ ان کے مطابق تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ہندو مسلم اتحاد دیکھنے کو ملا۔ مسلمانوں کی تحریک ترکِ موالات کا رہنما گاندھی کو مقرر کیا گیا۔ ہندوؤں نے "اللہ اکبر" کے نعرے بلند کیے تو مسلمانوں سے بھی "گاندھی جی کی جے" کے نعرے سننے کو ملے۔ "پردے سے پارلیمنٹ تک" ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں ہندوستان میں پھیلتی فرقہ واریت، سیاسی و سماجی تغیر، مسلم لیگ، کانگریس، جلیانوالہ والا سانحہ، اردو ہندی تنازعہ، ۱۹۴۷ء کے فسادات، تقسیمِ ہند، ہجرت، ہجرت کے بعد مہاجرین کے حالات، مسئلہ کشمیر، طوائف الملوکی، پاکستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ جیسے تمام موضوعات کی موجودگی اس میں عصری شعور کی موجودگی کی واضح دلیل ہے۔

احمد بشیر ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت ہیں جنہوں نے ادب، ثقافت، سیاست، صحافت جیسے تمام میدانوں میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ ان کی عصری شعور کی حامل آپ بیتی "دل بھٹکے گا" ۳۹ ابواب اور ۸۹۰ صفحات پہ مشتمل ایک ایسی آپ بیتی ہے جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ ناول اور آپ بیتی کے اس حسین امتزاج پر ممتاز مفتی کا رنگ چھایا نظر آتا ہے۔ احمد بشیر نے افسانوی رنگ میں اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتے ہوئے اپنے دور کی مذہبی صورتحال، ذہنی و فکری رویے، عقائد و توہمات، معاشرتی رسم و رواج کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ خود احمد بشیر لکھتے ہیں: "یہ میری کہانی نہیں، ایک عہد کی داستان ہے جو آہستہ آہستہ کھلا، اپنے زوال کے کمال کو پہنچا اور اب نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔"(۵۶) احمد بشیر نے اپنے دور کے سماجی رویوں پہ روشنی ڈالتے ہوئے عورت سے روا

رکھے جانے والے سلوک کی نشاندہی کی اور لڑکیوں کو تھان پہ بندھی گائے قرار دیتے ہوئے ان سے امتیازی سلوک پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس آپ بیتی سے اس دور کی معاشرتی برائیوں اور اخلاقی بگاڑ کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ احمد بشیر نے ادبی روایت پہ روشنی ڈالتے ہوئے ادبی رویوں اور ترقی پسند تحریک پر تفصیل سے لکھا۔ احمد بشیر نے خاص طور پہ ممتاز مفتی کو اپنا محسن و مربی مانتے ہوئے باپ کی طرح کا مقدس ادیب قرار دیا۔ اس آپ بیتی سے ان کے سیاسی شعور کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مصنف نے پاکستان کے سیاسی اتار چڑھاو کی نشاندہی کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت کے عروج وزوال پر روشنی ڈالی اور مارشل لاء کے نفاذ، ملک دشمن پالیسیوں ،اظہار پر پابندیوں، سیاسی تحریکوں، جلسے جلوسوں وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

معروف نقاد اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی "نشان جگر سوختہ" ۲۰۰۵ء میں منظر عام پہ آئی۔ جس میں انہوں نے تاریخ کے ایک پر آشوب دور کی یاد دلاتے ہوئے تحریکِ پاکستان اور ہجرت کے زمانے کو امر کیا ہے۔ ہم عصر سیاسی تناظرات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے آمریت کو تنقید کا ہدف بناتے ہوئے برائے نام جمہوریت پہ بھی قدغن لگائی۔ اس آپ بیتی میں ادبی رویے بیان کرتے ہوئے امجد اسلام امجد، انتظار حسین، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، کشور ناہید، یوسف کامران، انور سجاد، عطا الحق قاسمی، فرمان فتح پوری، مستنصر حسین تارڑ اور اصغر ندیم سید جیسے نامور ادبا و شعرا کے فن و شخصیت پر قلم فرسائی کی گئی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> کرپشن، رشوت، عدم عدل کی وجہ سے آج پاکستان کینسر کے مریض سے مشابہ نظر آتا ہے تو یہی وہ ٹیڑھی اینٹیں ہیں جن پر اس ملک کی بنا استوار کی گئی ہے۔ شہیدوں کے خون کے ساتھ بلکہ جس ارزاں نرخ پر خونِ شہدا کی سوداگری ہوئی وہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ ہندوؤں کے مکانات کے تالے توڑ کر ان پر جو پڑوسی قابض ہوئے ان ہی کے پوتے قبضہ گروپ کے بانی تھے۔ جعلی الاٹمنٹوں، بوگس کلیمز، دھنیے کے کھیت، پودینے کے باغات اور مولیوں کی فصلوں والوں نے نئے ملک میں جھوٹ، دغا اور فریب کی ایسی فصل بوئی جس نے گلشن جیسے وطن کو خارستان میں تبدیل کر دیا۔ سب سے پہلے بحالیات کے

محکمہ میں رشوت اور حق تلفی کا چلن ہوا، پھر ہر محکمہ میں یہ چلن عام ہوا اور ان سب پہ
مستزاد وہ طالع آزما سیاست دان جنہوں نے نوزائیدہ ملک کو حلوائی کی دکان جانا۔ (۵۷)

یہ آپ بیتی ایک ایسا تہذیبی مرقع ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان کی تہذیب و ثقافت کھل کر سامنے آتی ہے۔ مصنف نے ہندوستان خاص کر پونا اور انبالہ کے طرز بود و باش اور قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے معاشی و معاشرتی حالات پر روشنی ڈالی۔ "رو میں ہے رخشِ عمر" ڈاکٹر عبد السلام خورشید کی آپ بیتی ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید نامور ادیب اور بے باک صحافی عبد المجید سالکؔ کے فرزند ہیں۔ یہ آپ بیتی ۲۰۰۵ء میں منظر عام پہ آئی۔ اس آپ بیتی کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن "وے صورتیں الٰہی" کے نام سے جبکہ دوسرا ایڈیشن "رو میں ہے رخشِ عمر" کے نام سے شائع ہوا۔ جس کا عنوان مرزا غالبؔ کے اس شعر سے اخذ کیا گیا ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (۵۸)

اس آپ بیتی کے آخری باب "باپ کا گناہ" میں مولانا سالکؔ صاحب کے خلاف ہونے والے سیاسی پروپیگنڈوں کو عیاں کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی کیا ہے اپنے دور کی سیاسی، سماجی، ادبی اور صحافتی زندگی کی مکمل روداد ہے۔ نوائے وقت میں ڈاکٹر عبد السلام کے فن کی داد یوں دی گئی ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر صرف ان کی آپ بیتی نہیں جگ بیتی بھی ہے اور اپنے زمانے کی تاریخ
کے بعض ایسے پہلوؤں کی حامل ہے جو تاریخ کی رسمی کتابوں میں نہیں ملتے ڈاکٹر صاحب
جہاں تحریکِ پاکستان کے حوالے سے نئے پہلو اور گوشے سامنے لائے ہیں۔ (۵۹)

یہ آپ بیتی صرف آپ بیتی نہیں، جگ بیتی ہے۔ یہ آپ بیتی معاصر وقت اور حالات کا مکمل ریکارڈ رکھے ہوئے ہے۔ اس آپ بیتی میں تحریکِ پاکستان، اہم ثقافتی مراکز، پاکستان کی سیاسی و سماجی زندگی، صحافت و ابلاغ کی دنیا، اہم شخصیات کے کردار کی مختصر لیکن جامع اور موثر انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ "ڈگر سے ہٹ کر" بھوپال کے نواب زادہ بصر اللہ خان کی صاحبزادی سعیدہ بانو کی آپ بیتی ہے۔ جو ۲۰۰۶ء میں ثمر آفسٹ پریس دہلی نے شائع کی۔ شیلا بہادر کے خیال میں سعیدہ بانو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز زمانے میں ڈگر سے ہٹی ہوئی ایک انوکھی عورت

کے طور پہ سامنے آئی ہیں۔ آپ بیتی میں بھوپال، لکھنو اور دہلی کی طرزِ معاشرت اور ۱۹۴۷ء کے فسادات کو موضوع بنایا۔ سعیدہ بانو کا کمال درجے کا عصری شعور آپ بیتی کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ ان کے ہاں جاگیر دار طبقے کی عیش پرستی، بادہ نوشی، شراب و کباب اور ناچ گانے کا حقیقی ماحول پیش کیا گیا۔ سعیدہ بانو نے جہاں اپنی نجی زندگی کے حالات بیان کیے وہیں ارد گرد کے ماحول اور روایت و اقدار کے بیان میں کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کے یہاں شادی بیاہ کی رسموں، بچے کے پہلے روزہ پر روزہ کشائی اور قرآن ختم کرنے پر نشرہ کی رسم کی ادائیگی کی مکمل تفصیل ملتی ہے۔ آرسی مصحف کی رسم کے بارے میں لکھتی ہیں کہ دولہا دلہن کو ایک تخت پہ آمنے سامنے بڑھا کر ان کے درمیان آئینہ اور صورت اخلاص کھول کے رکھ دی جاتی۔ دولہے کا سہرا اوپر اٹھا کر دولہا دلہن دونوں پر ایک لال رنگ شال ڈال دی جاتی اور دونوں کو صورت اخلاص پڑھنے کی ہدایت کر کے منہ دکھائی کی رسم ادا کرنے کو کہا جاتا، یہ رسم آرسی مصحف کہلاتی تھی۔ لکھتی ہیں کہ دولہا دلہن کو چاروں جانب سے گھیرے میں لیے خواتین شرارت بھرے فقرے اچھالتیں۔ اس وقت اس طرح کی فقرے بازی ضرور دیکھنے کو ملتی "بس کرو دولہے میاں" سعیدہ بانو اپنے دور کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں لکھتی ہیں کہ مرد عورت کی تنخواہ میں تفریق روا رکھی گئی تھی۔ مردوں کی دنیا بالکل الگ تھی، مرد حضرات مردان خانے میں رہتے، عورتیں زنان خانے میں۔ مرد مردان خانے میں آتے درجہ بدرجہ خادماؤں کے سلام قبول کرتے بچوں کو پیار کرتے، بہوؤں کو دعا دیتے، ماں اور دوسری بزرگ خواتین سے دعائیں لیتے۔ یہی تہذیب اپنے بیٹوں کو دیتے کہ زنان خانے میں ادب، سلیقے اور حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا جائے۔ یوں عورت کو گھر کی چار دیواری تک عزت دے کر باہر مرد گنجفہ، پچیسی، تاش، جوا، مے خواری، امرد پرستی جیسی ساری سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔

اس آپ بیتی کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں انگریز خواتین عیسائیت کی تبلیغ کا کام کس خوبی سے سرانجام دیتیں۔ یہ ظاہر کیے بغیر کہ ان کا مقصد کیا ہے یہ خواتین بظاہر بڑے اخلاق سے پیش آتیں۔ کوئی بیمار ہوتا تو دوا تجویز کرتیں، چوٹ لگتی تو مرہم پٹی کرتیں۔ یوں دلوں میں گھر کر کے نہایت آسانی سے اپنے مقصد کی تکمیل کر لیتیں۔ سعیدہ بانو عصری تغیر کے بارے میں لکھتی ہیں کہ آج دنیا کس قدر بدل چکی ہے، اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ بھونپو کی ایجاد نے سارے زمانے میں دھوم مچا دی لوگ ورطہ حیرت میں

مبتلا ہو گئے کہ کس طرح ایک گول پلیٹ سے گانے نکلتے ہیں۔ سعیدہ بانو نے تقسیم ہند کے حالات بیان کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہجرت کو بھی آپ بیتی میں جگہ دی۔ ان کی آپ بیتی فسادات میں گھری عورت اور اسے درپیش مسائل کی مکمل آئینہ دار ہے۔ فسادات اور تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھی گئی یہ آپ بیتی ہنگاموں، بلووں اور بے گھر ہونے والے افراد کی مکمل روداد ہے۔

چاہِ یوسف سے صدا" سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی آپ بیتی ہے۔ اردو زبان ادب میں چاہِ یوسف کا استعارہ بکثرت استعمال ہوتا چلا آیا ہے انیسویں صدی میں یہ خاص طور پہ شاعری میں مستعمل رہا۔ اس آپ بیتی کا عنوان مولانا الطاف حسین حالی کے اس مشہور زمانہ شعر سے اخذ کیا گیا ہے:

؎ آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا

دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت (۲۰)

اس آپ بیتی میں پاکستانی سیاست و صحافت کا کٹھا چٹھا کھولا گیا۔ مصنف نے سیاسی ہیر پھیر، عوام کی سیاست دانوں سے وابستہ توقعات اور جذباتی پن بیان کرتے ہوئے پاکستانی سیاست میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا۔ سیاست سے وابستگی کی بنا پر ان کا سیاسی شعور دیکھنے لائق ہے۔ اس آپ بیتی کو سامنے رکھتے ہوئے تاریخ کی ایک معیاری کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔ سیاست کے علاوہ مصنف نے معاشرتی مسائل، سماجی انتشار اور بد نظمی کو بھی اجاگر کیا۔ نامور پاکستانی شاعر انیس ناگی افسانہ نگار، کالم نگار، محقق، نقاد اور مترجم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں اور ۲۰۰۷ء میں ان کی آپ بیتی بھی "ایک ادھوری سرگزشت" کے نام سے منظر عام پہ چکی ہے۔ انیس ناگی کا اصل نام یعقوب علی ناگی تھا۔ شاعری اور نثر کے حوالے سے اب تک ان کی ۵۰ سے زائد کتب منظر عام پہ آچکی ہیں۔ جن میں "کیمپ"، "محاصرہ"، "گردش"، "دیوار کے پیچھے"، "جنس اور وجود"، "غالب ایک شاعر ایک اداکار"، "نیا شعری افق"، اور "پاکستانی اردو ادب کی تاریخ" خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔ "ایک ادھوری سرگزشت" کے نام سے منظر عام پہ آنے والی ان کی آپ بیتی جمالیاتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ ثقافتی رنگا رنگی، سیاسی ریشہ دوانیوں، معاشرتی انتشار، بے سمتی و بے راہ روی اور پاکستان کی تہذیب و تمدن کے اجمالی جائزے پر مشتمل

یہ آپ بیتی ان کے عصری شعور کی گواہی دیتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ آپ بیتی جہاں گزرے وقت کی ایک سند ہے وہیں نئے لکھنے والوں کے لیے بھی زادِ راہ ہے۔

''آپ بیتی پاپ بیتی''مشہور شاعر، نقاد اور نثر نگار ساقی فاروقی کی آپ بیتی ہے جن کا اصل نام قاضی شمشاد نبی تھا۔ یہ آپ بیتی پہلے پہل کراچی کے رسالے ''مکالمہ'' اور بمبئی کے رسالے ''نیاورق'' میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ بعد ازاں جنوری ۲۰۰۸ء کو اکادمی بازیافت، کراچی نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ''آپ بیتی پاپ بیتی'' دراصل ایک پاپ کی گٹھڑی ہے جو ساقی فاروقی نے پاپ نویسی کرتے ہوئے قارئین کے سامنے رکھی ہے۔

ترقی پسند ادب پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے ساقی فاروقی نے علامہ اقبال، غالب، فیض احمد فیض، ن۔م۔ راشد، میراجی، حبیب جالب، شمیم احمد، جمال پانی پتی، نگار صہبائی، قمر جمیل، پروین شاکر، عبید اللہ علیم، ثروت حسین، رئیس فروغ، اطہر نفیس، سلیم احمد جمیل الدین عالی کے بارے میں بھی ذاتی تاثرات رقم کیے۔ ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے انسان کی نہیں بلکہ انسان کی اس شبیہہ کی پوجا کی جو انہوں نے تخیل میں سجا رکھی تھی۔ ترقی پسند تحریک کی ناکامی کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مبادہ ان کی نیت ہی خراب تھی ان کی گفتگو عوام سے تھی لیکن عوامی زبان کے خلاف تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اردو کے مرحومین اور 'موجودین' ادیبوں میں شاید میں واحد آدمی ہوں جس نے مذہب اور جنس کے مسائل پر، بلاخوف وخطر، نہایت تفصیل سے اور خاطر جمعی سے، اپنے سوچ بچار کی روشنی میں، اپنی آرا کا تحریراً اظہار کیا ہے۔ (۶۱)

ساقی فاروقی روز مرہ زندگی کے سماجی رویے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دور میں شراب نوشی، طوائف الموکی جیسی برائیاں عام تھیں۔ لوگ اگرچہ برابر گناہ کیے جاتے لیکن ساتھ ہی یہ ڈر بھی دل میں پناہ گزیں ہوتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ چنانچہ شراب پینے کے فوراً بعد لوگ بو ختم کرنے کے لیے الائچی استعمال کرتے دکھائی دیتے۔ طوائف کے پاس جانا ہوتا تو کمبل اوڑھ کے منہ چھپاتے ہوئے کہ کہیں پہچانے نہ جائیں۔ ساقی فاروقی عورت کی آزادی کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ ساقی فارقی نے مولوی کے عوامی شاہراہ پہ استنجا کرنے کو سخت ناپسندیدہ عمل قرار دیا۔

ان کے دور میں عورتیں ڈولی میں بھی برقعے میں لپٹی ہوتی تھیں۔ ساقی فاروقی اپنے دور کی دہرے پردے والی اس مروجہ روایت کی مخالفت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے ادبی ریاست اور مذہبی سیاست کے بے تاج بادشاہوں کا محاسبہ کرتے ہوئے شعراء کرام، ناقدین اور علماء حضرات کی کلاس لی ہے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی اسی صاف گوئی کی بنا پر خالد احمد نے انہیں اردو کا "خود کش بمبار" قرار دیا۔ ساقی فاروقی نے اپنی آپ بیتی میں زیادہ تر عہد کے منفی پہلو نمایاں کیے۔ ان کی آپ بیتی میں ہم عصر بدعات اور برائیوں پر مزاحمتی رویہ پایا جاتا ہے۔

ماہر نفسیات، افسانہ نگار، کالم نگار شاعر، مترجم، دانشور ڈاکٹر خالد سہیل کی انگریزی و اردو کی تقریباً ۶۶ کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں آڈیو کتب بھی شامل ہیں۔ "سچ اپنا اپنا" خالد سہیل کی آپ بیتی ہے جو ۲۰۰۹ء میں دارالعشور، لاہور سے شائع ہوئی۔ نہایت ٹھوس اور مدلل اندازِ فکر رکھنے والے خالد سہیل نے ادب، نفسیات، سماجیات اور سیاسات جیسی زندگی کی مختلف جہات پر بے لاگ تبصرہ کیا۔ خالد سہیل کا خیال ہے کہ ادیب بھی ایک ماہرِ نفسیات ہوتا ہے جو انسانی نفسیات کا مطالعہ درسی کتب سے نہیں، زندگی سے کرتا ہے۔ اس آپ بیتی میں خالد سہیل ہجرتوں کے مسافر کے طور پہ سامنے آتے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے سماج میں پائے جانے والے رنگ و نسل، زبان، اور ثقافت کے امتیاز کو اجاگر کرتے ہوئے عام سماجی رویے بھی بیان کیے ہیں۔ نجی و عائلی حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر خالد سہیل نے خاندانی و معاشرتی رسم و رواج پہ قلم اٹھاتے ہوئے آپ بیتی کو جس طرح نہایت خوبصورتی سے معاصر ثقافتی رنگوں سے ہم آہنگ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر خالد سہیل نے روایت زدہ معاشرے پہ قدغن لگاتے ہوئے صدیوں سے یوں ہی چلی آتی کئی روایات بیان کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گھر سے بیٹی کو رخصت کرتے وقت یہ کہنا کہ اب اس گھر میں تمہاری لاش ہی آئے ایک نہایت بے رحم سماجی رویہ ہے۔ جس کا بھگتان بعد اوقات بیٹی کو ساری زندگی بھرنا پڑتا ہے۔ یوں ان چاہے اور ظالم شوہر کے گھر جہاں اس کی رتی برابر وقعت نہ ہو وہیں ساری زندگی ایک زندہ لاش کی طرح گزار دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر خالد سہیل مشرقی ماحول میں مرد و عورت کے مابین تفریق اور عورت پر بے جا پابندیوں کا حوالہ بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ماحول کو گھٹن زدہ ماحول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایسے روایتی اور فرسودہ ماحول میں عورت کے پیدا ہوتے ہی اس کی ذہنی تربیت شروع کر دی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں مرد بے لگام پھرتے ہیں، وہاں عورت کو

ابتدا ہی سے روایت کے نام پہ مختلف زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ تلخ سماجی و معاشرتی حقائق پہ مشتمل یہ آپ بیتی ڈاکٹر خالد سہیل کے گہرے عصری شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے جس پہ ان کے علمِ نفسیات کا پرتو صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

"راہِ رواں" معروف روحانی شخصیت، ڈراما نگار، افسانہ نگار بانو قدسیہ کی آپ بیتی ہے۔ کل ۶۷۵ صفحات اور ۱۸ ابواب پر مشتمل یہ آپ بیتی سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۱۱ء میں شائع کی۔ بانو قدسیہ کا اصل اور خاندانی نام قدسیہ چٹھہ ہے۔ "بانو" ان کے محبوب خاوند کا پیار سے عنایت کردہ نام ہے، جسے انہوں نے ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ "راہِ رواں" بیک وقت آپ بیتی بھی ہے اور سوانح بھی۔ بانو قدسیہ نے جہاں اپنی زندگی کے داخلی و خارجی اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا ہے وہیں اشفاق احمد کی زندگی کے نشیب و فراز کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ "راہِ رواں" بانو قدسیہ کے اشفاق احمد کے ساتھ گزرے سفر کی کہانی ہے جو عشق و محبت کی بھول بھلیوں، رشتوں تعلقات کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ دین و دنیا کے اسرار و رموز اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے یہ آپ بیتی بانو قدسیہ کی اشفاق احمد سے وفا و محبت کا بہترین ثبوت ہے، جس میں انھوں نے قلم کے جوہر دکھاتے ہوئے اشفاق احمد کی زندگی اور پٹھان قوم کی زندگی کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ یہ آپ بیتی پٹھان قوم کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> یہ لوگ نہ مداخلت کرتے تھے، نہ مداخلت برداشت کرتے تھے۔ انتہا کے مہمان نواز لیکن دوستی کو دسترخوان سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔ میل جول میں اس درجہ محتاط کہ ذات برادری سے باہر شادی کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ (۶۲)

یہ آپ بیتی اپنے دور کی ادبی روایت کو بھی محفوظ کیے ہوئے ہے۔ اس میں اس دور کے تمام اہم ادیبوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس آپ بیتی میں کہیں معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتے لوگ دکھائے ہیں تو کہیں والدین کے مابین ناچاکی اور بچوں پر اس کے اثرات۔ کہیں کم عمری کی شادی ہے تو کہیں پے در پے شادیاں۔ کہیں جان لیوا امراض اور بچوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دیتی ہے تو کہیں ذات برادری کے گھن چکر قاری کو الجھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں ٹاٹوں پہ بیٹھے قلم گھڑتے بچے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں گاچی ملتے، تختی سکھاتے لڑکے۔

غرض ایک پورا دور ہے جو اس آپ بیتی سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ''جستجو کیا ہے'' انتظار حسین کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ ہے جو ۲۰۱۱ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا اس کا عنوان مرزا غالب کے اس شعر کے مصرعہ ثانی سے منتخب کیا گیا ہے:

؎ جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا

کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے (۶۳)

اس سے پہلے ان کی ایک آپ بیتی ''چراغوں کا دھواں'' ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پہ آچکی ہے۔ ''جستجو کیا ہے'' میں انتظار حسین نے ہجرت کے بعد کے ۵۰ سال کے حالات واقعات بیان کیے۔ اس آپ بیتی میں پریم چند، قرۃ العین حیدر، ناصر کاظمی، کشور ناہید اور جمیل الدین عالی جیسے شاعروں، نقادوں اور ادیبوں کا ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ انتظار حسین نے پاک ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس، نگینہ بیکری، چیز ہوٹل اور میٹرو ہوٹل کی ادبی محفلوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ میٹرو ہوٹل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہاں نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی دلچسپی کا مرکز خوبرو رقاصہ انجیلا تھی جس کا رقص دیکھنے کے لیے سب جوق در جوق ہوٹل کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ سیاسی اور معاشی حالات اور ان کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی۔ پہلے مارشل لاء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پابندیوں کے اس دور میں لوگوں میں خوف و سراسیمگی پھیل گئی اور لوگ ۱۹۵۷ء کے زمانے کو بھی ۱۸۵۷ء کے تناظر میں دیکھنے لگے اس سے ادبی محفلیں اجڑ گئیں اور ادب پر بھی سکوت طاری ہو گیا۔ اس آپ بیتی میں سقوط ڈھاکہ، ہجرت، روسی ادب کے خلاف تحریک اور مزاحمتی تحریک کا ذکر بھی ملتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے مشرقی و مغربی تہذیب کا موازنہ کرتے ہوئے مشرقی تہذیب کو سراہا اور ہم عصر تہذیب سے واقفیت کا ثبوت فراہم کیا۔

''بند گلی میں شام'' اُردو زبان و ادب کے استاد، شاعر، نقاد اور محقق توصیف تبسم کی آپ بیتی ہے جو عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی دراصل ایک جگ بیتی ہے جس میں توصیف تبسم نے روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے خود پسندی و خود نمائی سے گریز کیا ہے اور مجلسی و معاشرتی زندگی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ سیالکوٹ اور بدایوں کے ایک قصبے سہسوان کا مذہبی، سماجی، علمی و ادبی ماحول بیان کیا ہے مذہبی پس منظر کے

حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ دونوں علاقے اہل حدیث کا گڑھ تھے۔ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب ہونے کی بنا پہ آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا رہتا۔ کبھی تشدد پسند ہندو گاؤکشی پہ فساد کرتے تو کبھی یہ دلیل پیش کرتے ہوئے کہ گائے ہماری ماتا ہے تو نیل گائے بھی ہماری ماتا ٹھہری، نیل گائے کے شکار پہ پابندی لگا دیتے۔ جس پر جزبز ہو کے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے مسلمان بے اختیار کہہ اٹھتے کہ یہ نیل گائے نہیں نیل گھوڑا ہے۔ اس آپ بیتی میں اس دور کے ادبی ماحول، مشاعروں اور نیلم احمد بشیر، ممتاز مفتی، منشی تلوک چند مرحوم، عبدالحمید عدم، منیر شیخ، ناصر کاظمی، یوسف ظفر، صادق نسیم، مشفق خواجہ، پروفیسر خلیل صدیقی، پروین عاطف ماور ذوالفقار علی بخاری جیسے معاصر شعرا و ادباء کا ذکر نہایت مناسب الفاظ میں ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی ہم عصر سرگرمیوں کی ایک مکمل داستان ہے۔

کشمیر کے علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھنے والی معروف ناول نگار رضیہ بٹ جن کا اصل نام رضیہ نیاز بٹ تھا، اب تک ۵۰ ناول اور ۳۵۰ سے زائد کہانیاں لکھ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے کتنے ہی مضامین اور ریڈیو سکرپٹ بھی منظر عام پہ آ چکے ہیں۔ "بچھڑے لمحے" کے نام سے ماضی کو جاوداں کرتے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق اور معاشرتی ناہمواریوں کی عکاسی کی۔ رضیہ بٹ نے رنگپور، سیالکوٹ، کشمیر، راولپنڈی، پشاور کی تاریخ و تہذیب بیان کی ہے۔ کشمیر کو جنت نظیر قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ پھولوں اور پھلوں سے لدا کشمیر کا یہ علاقہ ارضی جنت تھا۔ جہاں خوشبودار سیبوں کی اتنی بہتات تھی کہ جو سیب پیڑ سے زمین پر آ گرتا وہ ہمیشہ گایوں بھینسوں کو ڈال دیا جاتا اسی لیے گائے بھینس کے دودھ سے بھی سیب کی خوشبو آتی تھی۔ ہندوستانی معاشرے کی مذہبی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ان کے گھر میں جو بوڑھی عورتیں تھیں وہ اسے پسند نہ کرتی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بچہ اگر ان کے برتنوں کو ہاتھ لگا دیتا تو وہ سخت برہم ہوتیں کہ برتن بھٹ گیا ہے یعنی ناپاک ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو بھی سمیٹے رہتیں کسی مسلمان سے چھو جاتیں تو فوراً ولیحان کرتیں کہ بھٹ گئی ہیں۔ (۶۴)

مزید لکھتی ہیں کہ مسلمان بچے مذہبی اختلافات کے تو نام سے بھی ناواقف تھے لیکن بوڑھی ہندو عورتوں کو تنگ کرنا ان کی مرغوب شرارت ہوتی۔ چنانچہ بچے کبھی کسی بوڑھی عورت کے برتنوں کو چھو لیتے تو کبھی ان کی ململ کی دھوتیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے اس کی ہائے وائے اور کوسنوں سے لطف اندوز ہوتے۔ ان کوسنوں اور ہائے وائے کے رد عمل کے طور پر بچے شرارت کے تحت دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالے گئے کپڑوں میں خود کو لپیٹ لیتے۔ ماتا جی کے بیٹے، بیٹیاں اور بہوئیں ہنس رہی ہوتیں اور ماتا جی کو پر امن کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتیں لیکن ماتا جی بھرشٹ ہوئی چیزوں کو جب تک دھو نہ لیتیں انہیں چین نہ آتا۔ نئی اور پرانی نسل میں مذہبی عقیدے کا فرق بھی ان کی نظروں سے ڈھکا چھپا نہ رہا لکھتی ہیں:

> عام ہندو بڑی بوڑھیوں اور بوڑھوں کا بھی یہی رویہ تھا۔ لیکن اس وقت کی نئی نسل آزادرویوں کی حامل تھی۔ وہ چھوت چھات یا بھرشٹ ہو جانے کی قائل نہ تھی۔ اور اس نسل کے ہماری عمر کے بچے تو بالکل ہی ہم ایسے تھے۔ اکٹھے کھیلتے اکٹھے پڑھتے اور کھاپی بھی اکٹھا ہی لیتے تھے۔ اگر کوئی غلط کام کرتے تو ایک دوسرے کو تحفظ دینے میں بھی برابر کے شریک ہوتے تھے۔ (۶۵)

اس آپ بیتی سے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب، ہندو مت، مسلم کلچر، پاکستانی تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی ہے اور قاری تقسیم ہند سے قبل اور مابعد کے حالات و واقعات سے آشنا ہوتا ہے۔ رضیہ بٹ نے معاصر حقائق کو نہایت دلچسپ پیرائے میں پیش کیا۔ تاریخ کا ایک اہم حصہ اپنے اندر سموئے ہونے کے باوجود یہ آپ بیتی تاریخ کی طرح بوجھل نہیں یہی اس آپ بیتی کا کرشمہ ہے۔ انگریزی، ہندی، اردو اور پنجابی کے نامور شاعر و ادیب ستیہ پال آنند ۲۴ اپریل ۱۹۳۱ء میں چکوال کے ایک قصبے کوٹ سارنگ میں پیدا ہوئے۔ ستیہ پال آنند نے زندگی کی آٹھ دہائیوں پہ مشتمل تجربات و مشاہدات کو آپ بیتی کی شکل دے کر، ۲۰۱۳ء میں شائع کیا۔ کلاسک آرٹ پریس دہلی سے شائع ہونے والی یہ آپ بیتی ۵۵۲ صفحات پہ مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی میں ایرانی تصوف، ہندو بھگتی تحریک،

چرچل، ہٹلر، سکندر، پورس، مہاتما گاندھی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر، رام لال، دینا ناتھ فاضل، جوش ملیح آبادی اور عرش ملسیانی کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے قبل

کے راولپنڈی، بسال، چکوال، پنڈی گھیب وغیرہ کی تہذیب وثقافت پر روشنی ڈالتے ہوئے تقسیم ہند، فسادات و لوٹ مار اور ہجرت کا مفصل حال رقم کیا گیا ہے۔ ستیہ پال آنند لکھتے ہیں:

> راولپنڈی میں جہاں میں مشن ہائی سکول میں میٹرک کی تعلیم حاصل کر رہا تھا مارچ ۱۹۴۷ء کو فسادات پہلے شروع ہوئے کچھ لوگ مارے گئے کچھ گھر جلا دیئے گئے۔۔۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ کدالیں، کسیاں، ڈانگیں، تلواریں، چھرے اور دیگر ہتھیار لے کر گلیوں میں گھس گئے۔ ناولٹی ٹاکیز کی طرف سے پہلے تیس پینتیس گھروں کے دروازے توڑ دیئے گئے ان میں چھپے ہوئے عورتوں مردوں اور بچوں کو نکال کر گھروں کا سامان لوٹ لیا گیا نوجوان عورتوں کو ہانک کر لے جایا گیا۔ مردوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا گیا صبح دو بجے تک یہ قتلِ عام جاری رہا۔ (۲۶)

یہ آپ بیتی سکھ اور ہندو قوم کی تہذیب وثقافت اور ہجرت کے پس منظر میں لکھی گئی ایک یگانہ روزگار تحریر ہے۔ اس کے بعد بھی جتنی آپ بیتیاں تخلیق ہوئیں ان میں کسی نہ کسی حد تک عصری شعور ضرور موجود رہا۔ بحیثیت مجموعی جہاں تک عصری شعور کا تعلق ہے اردو آپ بیتی ابتدا ہی سے عصر کی ترجمانی کا فریضہ بخوبی سرانجام دیتی چلی آئی ہے اردو آپ بیتی کی روایت پہ نظر دوڑائی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے ابتدا ہی سے آپ بیتی کے ساتھ عصری شعور نمو پاتا اور پھلتا پھولتا رہا۔

د۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی ادبی خدمات: مختصر تعارف

ا۔ ادا جعفری کا تعارف اور ادبی خدمات

اردو ادب کی نامور شاعرہ ادا جعفری کا اصل نام عزیز جہاں تھا جو ۱۹۴۷ء تک ادا بدایونی رہیں شادی کے بعد شریکِ حیات نورالحسن جعفری کی نسبت سے ادا جعفری کہلائیں۔ ادا جعفری ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں شہر کے ایک جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ جنہیں اردو شاعری کی "خاتونِ اول" ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ادا جعفری نے نہ صرف شاعری بلکہ نثر میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ادا جعفری نے اس وقت قلم اٹھایا

جب خواتین کے قلمی اظہار کو معیوب گردانا جاتا تھااور اس کے ذہنی و تخلیقی وجود کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ ایسے میں ادا جعفری نے ناصرف اپنی قابلیت کالوہامنواتے ہوئے خود کو برصغیر کے صفِ اول کے شاعروں کے مد مقابل لا کھڑا کیابلکہ اردو شاعری کی خاتونِ اول ہونے کا اعزاز بھی اپنے نام کر لیا۔سید ضمیر جعفری اور حمایت علی شاعر کی جانب سے اردو شاعری کی خاتون اوّل قرار پانے والی اس خاتون نے صحیح معنوں میں خواتین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ادا جعفری نے علم وادب کے مرکز بدایوں شہر کے ایک مذہبی اور قدامت پسند روایتی گھرانے میں جنم لیا۔ علم و ادب کی محبت میں رچی بسی یہ اسی فضا کا اثر تھا کہ اس قدامت پسند روایتی گھرانے نے اردو ادب کو ایک منفرد شاعرہ سے روشناس کرایا۔ادا جعفری نے اب تک جو خدمات سرانجام دیں انہیں سراہتے ہوئے حکومتِ وقت اور مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے انہیں کئی اعزازات سے بھی نوازا گیاان میں تمغہ حسن کارکردگی، تمغہ امتیاز، وثیقہ اعتراف، آدم جی ادبی ایوارڈ اور کمال فن ادبی ایوارڈ شامل ہیں۔ادا جعفری نے ۹سال کی عمر میں پہلا شعر کہا اور ۱۲سال کی عمر میں ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ ان کا ابتدائی کلام اختر شیرانی کے رسالہ "رومان"، مرزا ادیب کے "ادب لطیف" اور مولانا محمد تاجور کے رسالہ "شاہکار" میں شائع ہوتا رہا۔ ابتداًاختر شیرانی اور پھر اثر لکھنوی سے اصلاح لی، تاہم یہ اصلاح بھی نہایت مختصر عرصے کے لیے تھی۔ادا جعفری نے اگرچہ نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ تاہم اپنے مزاج اور ترقی پسند تحریک کے زیرِاثر نظم سے انہیں زیادہ نسبت رہی۔ نظم میں انہوں نے خاص طور پہ ہائیکو، نظمِ معریٰ اور آزاد نظم میں طبع آزمائی کی۔اگرچہ ادا جعفری سے قبل بھی کئی شاعرات افق پہ ابھریں لیکن ان میں سے زیادہ تر نے یا تو اپنے نام کا عندیہ دیے بغیر شاعری کی یا صرف عشق و محبت کے روایتی موضوعات اپنائے۔ادا جعفری وہ پہلی خاتون شاعرہ ہیں جنہوں نے عشق و محبت کے روایتی موضوعات سے ہٹ کر عورت کی مکمل نفسیات پیش کیں۔ان کے ہاں عورت کے جذبات و احساسات کی پیشکش کے سلسلے میں جو تنوع اور ندرت دیکھنے کو ملتی ہے وہ اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھی گئی۔اسی خاصیت کی بناپر سید ضمیر جعفری نے انہیں اردو شاعری کی خاتونِ اول قرار دیاہے۔لکھتے ہیں:

> ادانے شاعری کے اس تہہ خانے کی جس میں عورت محصور تھی، کئی صدیوں کی چنی ہوئی سنگلاخ دیواریں توڑ کر ہوااور روشنی کے بہت سے دریچے مہیا کیے ہیں اور میں ادا کو ان ہی

معنوں میں اردو شاعری کی خاتونِ اول کہتا ہوں۔ (۶۷)

ادا جعفری کا شمار ان باشعور خواتین شاعرات میں ہوتا ہے جو حقوقِ انسانیت کے لیے آواز بلند کرتی رہی ہیں۔ شاعری میں ان کے پسندیدہ موضوعات وطن سے محبت، فطرت اور سماج ہیں۔ ان کی شاعری میں کہیں اختر شیرانی کی رومانیت کی لے ملتی ہے تو کہیں اداسی کی ایک گہری دبیز چادر تنی نظر آتی ہے۔ کہیں دہشت گردی کے خلاف احتجاج ملتا ہے تو کہیں معاشرتی اقدار اور رسم ورواج کی گہری چھاپ قاری کو اپنے اثر میں لیتی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں وہ سہاگن کا روپ دھارے ایک مشرقی عورت کی طرح وفا کا پیکر بنی دکھائی دیتی ہیں تو کہیں ان کے ہاں مرد کے ہر جائی پن کے قصے بھی دیکھنے سننے کو ملتے ہیں۔ کہیں ان کا ہر ایک لفظ جزبہ ممتا کی گواہی دیتا ہے تو کہیں وہ نوجوان نسل اور تمام آنے والی نسلِ انسانی کے لیے دعا گو دکھائی دیتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی ادا جعفری اپنی شاعری میں ایک وفا شعار بیوی اور مامتا کے جذبے سے بھرپور عورت کے روپ میں سامنے آئیں۔ ادا جعفری کی شاعری رنگا رنگ اور متنوع موضوعات کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ جدید دور سے ہم آہنگ ہے۔ اگرچہ ادا جعفری کے ہاں کہیں کہیں طنز کی کاٹ بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر ان کے ہاں نرم، دھیما اور محبت بھرا انداز دیکھنے کو ملتا ہے تہذیب وشائستگی اور اعتدال پسندی کی یہی خاصیت انہیں دیگر شاعرات سے ممتاز کرتی ہے۔

"میں ساز ڈھونڈتی رہی" ادا جعفری کا پہلا مجموعہ کلام ہے اس مجموعے میں شامل زیادہ تر کلام آزادی سے قبل ہندوستان میں لکھا گیا جو مشہور زمانہ رسائل "سویرا"، "ایشیا"، "رومان"، "افکار" اور "ادب لطیف" میں شائع ہوتا رہا۔ تاہم تقسیم ہند اور فسادات کے باعث اس مجموعہ کلام کی اشاعت ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ منظوم پیش لفظ کا حامل یہ مجموعہ کلام قدیم وجدید کا حسین امتزاج ہے جس میں ترقی پسندانہ خیالات کے ساتھ ترنم اور موسیقیت کی لے بھی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس مجموعہ کلام میں ادا جعفری نے ایک نوعمر کنواری لڑکی کے جذبات واحساسات کی نمائندگی کی ہے۔ ادا جعفری کا دوسرا شعری مجموعہ ۱۹۶۷ء میں "شہر درد" کے نام سے شائع ہوا جس پر انہیں آدم جی ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۶۵ء کے پس منظر میں تخلیق کیے گئے اس مجموعہ کلام میں جذبہ حب الوطنی اور عوام کے جزبات واحساسات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک وبھارت جنگ کے تناظر میں "میرے شہید"، "خاک وطن کو سلام" اور "سترہ دن بعد" کے زیر عنوان تحریر کی گئی نظمیں اسی مجموعہ کلام میں

شامل ہیں۔ ادا جعفری کا تیسرا مجموعہ کلام "غزالاں تم تو واقف ہو" کے نام سے ۱۹۷۴ء میں منظر عام پہ آیا جو سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لکھا گیا۔ وطن سے محبت کے اظہار پر مشتمل اس مجموعہ کلام میں تقریباً تمام نظمیں ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۳ء تک کے زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ ادا جعفری لکھتی ہیں:

> تیسری کتاب غزالاں تم تو واقف ہو ۱۹۷۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔۔۔ اس شعر میں ایک شہر کے زخموں کی داستان تھی اور میری یہ کتاب جن دنوں کی کہانی کہتی ہے، وہ دن میرے دیس بلکہ پورے جنوبی ایشیا پر بھاری تھے۔ یہ خطہ زمین اور میرا دل دونوں زخمی تھے۔ اس کتاب میں زیادہ تر نظمیں وہی ہیں جو ان چند برسوں میں لکھی گئی تھیں جب انسان، انسان سے بد ظن ہو گیا۔ جب بھائی نے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگے تھے۔ (۶۸)

"غزالاں تم تو واقف ہو" نامی اس مجموعہ کلام میں "مسجدِ اقصیٰ"، "ابھی تو شب خون نہیں ہوا ہے" اور "شہر عزیزاں" جیسی نظمیں شامل ہیں جن میں سے زیادہ تر کا موضوع سقوط ڈھاکہ، حب وطن، تنہائی اور بے دست و پائی ہے۔ ادا جعفری کا چوتھا مجموعہ کلام "ساز سخن بہانہ" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا جسے انہوں نے اپنی والدہ کے نام موسوم کیا۔ یہ مجموعہ کلام اپنے اندر محسوسات کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ داخلی و خارجی زندگی سے مزین یہ مجموعہ ادا جعفری کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ادا جعفری کا پانچواں مجموعہ کلام "حرف شناسائی" ۱۹۹۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ادا جعفری نے "حرف شناسائی" کا سارا کلام اپنے شوہر نورالحسن جعفری کی وفات (دسمبر ۱۹۹۵ء) کے بعد لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ کلام پر حزن و ملال کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں درد کی کسک، تنہائی اور ایک مشرقی وفا شعار عورت کے بیوہ ہو جانے کا دکھ ملتا ہے۔ ان نظموں میں بیوہ ہونے کا یہ غم صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں کئی نظمیں دہشت گردی، بم دھماکوں سے ہونے والی اموات اور چار سُو پھیلی دہشت پہ بھی تحریر کی گئی ہیں۔ ان نظموں میں پاکستان کی جھوٹی صحافت کا کٹھا چٹھا کھولا گیا کہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، اخبارات کی سرخی ہمیشہ یہی رہے گی کہ حالات معمول کے مطابق رہے۔ شاعری کا وہ سفر جو "میں ساز ڈھونڈتی رہی" سے شروع ہوا تھا "سفر باقی ہے" پر آکر اختتام پذیر ہوا۔ ۱۹۹۹ء کے بعد لکھا گیا کلام "سفر باقی ہے" کے نام سے منظر عام پہ آیا جو ۲۰۰۲ء ان کی کلیات کے ہمراہ شائع ہوا۔ اس مجموعہ

کلام میں سماجی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس کے بعد "موسم موسم" کے نام سے ادا جعفری کی ایک کلیات منظر عام پہ آئی۔ چھ شعری مجموعوں (میں ساز ڈھونڈتی رہی، شہر درد ، غزالاں تم تو واقف ہو، ساز سخن بہانہ ہے، حرف شناسائی، اور سفر باقی ہے) پر مشتمل شاعری کی یہ کلیات ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی جس میں ان کا ۱۹۵۰ء سے ۲۰۰۲ء تک لکھا جانے والا تمام کلام شامل ہے۔

ادا جعفری نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی طبع آزمائی کی جس میں وہ کامیاب رہیں۔ادا جعفری نے نثر میں بھی انہی خصوصیات کو برتا جو شاعری میں ان کا خاصا تھیں۔ نثری میدان میں ان کی کل دو تصانیف منظرِ عام پہ آئیں۔ نثری میدان میں ادا جعفری نے پہلا پتھر "غزل نما" کا پھینکا جو قدیم غزل گو شعرا کے حالات و واقعات اور شاعری کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ادا جعفری نے یہ کتاب مشفق خواجہ کی فرمائش پہ تحریر کی۔پہلے پہل یہ کتاب انجمنِ ترقی اردو کے ماہنامہ قومی زبان میں قسط وار شائع ہوتی رہی بعد ازاں ۱۹۸۷ء میں انجمن نے اسے کتاب کی شکل دے دی۔ "غزل نما" میں ادا جعفری نے ۳۷ مختلف غزل گو شعرا کی خدمات کو سراہتے ہوئے مختصر انداز میں ان کے حالات و واقعات کیے اور ان کی شخصیت و فن کو اجاگر کیا ان شعرا میں بیجاپور، گولکنڈہ، شمالی ہند اور میر و غالب کے دور کے غزل گو شعرا شامل ہیں۔ادا جعفری نے سولھویں صدی سے آغاز کر کے بیسویں صدی کے نصف آخر تک کی اردو غزل کے حوالے سے مختلف نکات کی وضاحت کی ہے۔زبان کی ساخت، تلفظ، شعری تلازمات، دیگر زبانوں کے مرتب کردہ اثرات، اور خواص و عوام کے لسانی رویوں کے بارے میں مفید معلومات سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اردو زبان کا کوئی خاص لفظ، کن مدارج سے گزر کر، آج اپنی موجودہ شکل میں مستعمل ہے۔ادا جعفری کے ادبی شعور پر مشتمل یہ تصنیف بلاشبہ نثر کی ایک بہترین تصنیف ہے۔ "جو رہی سو بے خبری رہی" ہندوستان کی نامور شاعرہ ادا جعفری کی آپ بیتی ہے جو پہلے پہل مشہور زمانہ رسالہ "افکار" کی زینت بنتی رہی بعد ازاں ۱۹۹۵ء میں حوری نورانی نے مکتبہ دانیال کراچی سے کتابی شکل دے کر اسے زندہ و جاوید کر دیا۔ ۱۲۹ ابواب اور ۲۷۳ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی صہبا لکھنوی کی تحریک پہ لکھی گئی۔ بلاشبہ ادا جعفرہ تو نہ رہیں لیکن ادب میں ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔خواتین کے لیے ادبی سفر کو آسان بنانے والی اس بے مثال شاعرہ و ادیبہ کا نام ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔

۲۔ کشور ناہید کا تعارف اور ادبی خدمات

اردو ادب کی نامور شاعرہ و ادیبہ کشور ناہید نے ۱۸ جون ۱۹۴۰ء کو ہندوستان کے شہر اترپردیش میں جنم لیا۔ کشور ناہید سید ابنِ حسن کی چوتھی بیوی سیدہ جمیلہ خاتون سے پانچویں اولاد تھیں جو ایک آزاد اور ثابت قدم عورت ثابت ہوئیں۔ انہوں نے معاشرے کے پہلے سے متعین اور طے شدہ راستوں پہ چلنے کے بجائے اپنی منزل کا انتخاب خود کیا۔ کشور ناہید سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہیں اور کئی رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ خداداد صلاحیتوں کی مالک کشور ناہید اُردو ادب میں کئی حوالوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ کشور ناہید کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے افتخار عارف لکھتے ہیں:

> کشور ناہید ہمارے عہد کی رجحان ساز شاعرہ، نامور سوانح نگار، مشہور مترجم، مقبول کالم نگار اور پاکستان کی بیدارئ خواتین کی تحریک کے حوالے سے عالمی سطح پر متعارف تخلیق کار کے طور پر عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں خواتین میں شعور و آگہی کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے احساس کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں کشور ناہید کی خدمات کا ہر سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔[۶۹]

افتخار عارف کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کیونکہ بات خواہ شاعری کی ہو یا نثر کی، کشور ناہید اپنی خدمات کے حوالے سے ہر میدان میں پیش پیش رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری، ترجمہ نگاری، خودنوشت سوانح، کالم نگاری اور بچوں کے ادب کے حوالے سے ان کی کئی کتب منظرِ عام پہ آچکی ہیں۔ کشور ناہید کی انہی ادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں رانی جھانسی، شاعرات کی اماں حوا اور ادب کی پھولن دیوی جیسے القابات سے بھی نوازا گیا۔

کشور ناہید نے لکھنے کا آغاز شاعری سے کیا۔ ابتداً وہ کالج مقابلوں کے لیے لکھتی رہیں اور پھر جلد ہی وہ باقاعدہ لکھنے کی طرف آمادہ بہ مائل نظر آنے لگیں۔ شاعرات کی اماں حوا کہلانے والی کشور ناہید کی اب تک شاعری کی بے شمار کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں اور تخلیق کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ کشور ناہید نے پہلا شعری مجموعہ ''لبِ گویا'' ۱۹۶۹ء میں ۲۹ برس کی عمر میں لکھا۔ محبت، تنہائی و بے گانگی اس کے اہم موضوعات ہیں۔ ''لب گویا'' کی

ابتدائی نظموں میں کشور ناہید کے ہاں محبت پر یقین اوراپنی ذات پر ملتاہے جو آہستہ آہستہ تنہائی اور کم مائیگی و بے گانگی کے احساس میں بدلتا دکھائی دیتاہے۔کشور ناہید کا دوسرا مجموعہ "بے نام مسافت" کے نام سے ۱۹۷۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ سماجی جبریت کی یہ شاعری خود کشور ناہید کی ذات کے اوراردگرد کے ماحول کے مطابق ڈھلی دکھائی دیتی ہے۔کشور ناہید کا تیسرا "نظمیں" نامی مجموعہ قومی و بین الاقوامی شاعری کے تراجم پہ مشتمل ہے جس میں شامل زیادہ تر نظمیں خود کشور ناہید کے نظریات وافکار کی آئینہ دار ہیں۔ دراصل مصنفہ نے جسے اپنی سوچ سے مربوط وہم آہنگ پایاترجمہ کرڈالا۔کشور ناہید نے جیسے تیسے نبھاکے بجائے خود کلامی کے انداز میں احتجاج کرتے ہوئے زندگی کے جبر و تشدد کو نمایاں کرکے پیش کیا۔۱۹۷۸ء میں کشور ناہید کا شاعری کے تراجم پہ مشتمل ایک اور مجموعہ کلام شائع ہوا۔ "گلیاں، دھوپ، دروازے" کے نام سے شائع ہونے والے اس مجموعہ کلام میں جاپانی شاعرہ ہیرا کی نظموں کے تراجم شامل ہیں۔ "گھاس تو مجھ جیسی ہے"، "نیلام گھر"، "تیرالٹیاشہر بھنبھور"، "ہم نے خواہشوں کے سارے پرندے اڑادیے ہیں" اور "دفعہ ۱۴۴" اس مجموعے کی مشہورترین نظمیں ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں "ملامتوں کے درمیان" نامی مجموعہ کلام منظرِ عام پہ آیاجس میں عورت کو رومانیت سے ہٹ کر ایک نئے انداز میں پیش کیاگیا۔ اس میں عورت ذات کے غم وغصہ اور اذیت کا بیان ملتاہے۔ زمانے کے جبر کا ذکر کرتے ہوئے عورت کا احتجاج ریکارڈ کروایا گیالیکن اس سلسلے میں شاعرہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں۔ اس مجموعہ کلام میں فرسٹریشن اور تلخی کا واضح عنصر پایا جاتاہے جذبات کا اک لاواہے جو بہہ نکلاہے۔ سرکشی اور جذباتیت کے اسی عنصر کی بنا پر انہیں کئی مرد ناقدین نے طنز کانشانہ بنایاہے۔ اس مجموعے میں "پرکٹے پرندے"، "آخری فیصلہ"، "مجھ سے چھپے رہو"، "سورج سوانیزے پر" اور "آگ کا رقص" جیسی نظمیں شامل ہیں۔ "فتنہ سامانی دل" نامی مجموعہ کلام ۱۹۸۵ء میں منظرعام پہ آیا۔ جس میں جذبوں کی آنچ صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ رواں اور سلیس اسلوب کی حامل یہ شاعری داخلی دنیا کے علاوہ خارجی مظاہر کا عکس بھی پیش کرتی ہے۔ اس میں شامل نظمیں ان کی سیاسی بیداری اور تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ بھرتے ہوئے کشور ناہید نے ۱۹۸۶ء میں شاعری کی ایک اور کتاب پیش کی۔ اس مجموعے میں بڑی نفسیاتی گرہ دار نظمیں ہیں جو نسوانی اور خاندانی تنہائی کے ساتھ ساتھ رشتوں کے طلب اوررسد کے نظام پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں کشور ناہید نے " خیالی شخص

سے مقابلہ" کے عنوان پر مشتمل مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی شاعرات کی نظموں کے تراجم پیش کیے۔ یہ مجموعہ برما کی ایک نوبل امن انعام یافتہ خاتون آنگ سان سو کی کے نام کیا گیا ہے۔"سکڈ میزائل کی تربت پر" ،"فیصلہ ۱۹۹۱"،"بے انت یاترا"، "وینا حیات اورآسیہ ایوب کی فردِ جرم"اور"بارھویں ترمیم میں ترمیم "اس مجموعہ کلام کی نمائندہ نظمیں خیال کی جاتی ہیں۔اس کے بعد"میں پہلے جنم میں رات تھی"نامی مجموعہ کلام منظر عام پہ آیا جس میں کئی نظمیں احمد ندیم قاسمی، شہزادی ڈیانا،بے نظیر بھٹو،مرتضی بھٹو،طالبان،عدالتی نظام،وغیرہ کے حوالے سے تخلیق کی گئی ہیں۔ "دشتِ قیس میں لیلیٰ"کشور ناہید کے ۸ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات ہے جس کا عنوان مرزا غالب کے درج بالا مصرعے سے اخذ کیا گیا:

؎ قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا

تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں (۷۰)

نعیم پاشا کی خوبصورت پینٹنگ سے مزین"سوختہ سامانیٔ دل"نامی شعری مجموعہ ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا جس میں مختلف ممالک کی شاعری کے تراجم کے ذریعے زبان وادب کو بین الاقوامی شاعری کے ذائقے سے روشناس کرایا گیا ہے۔کشور ناہید نے عورت کے حسن کے قصیدے پڑھنے،دوسری عورتوں سے اس کے جلاپے کے قصے سنانے والوں کو بہت معصوم قرار دیا اور مسکراتی عورت کا اذیت بھرا چہرہ دیکھنے کی دعوت دی ہے۔کشور ناہید نے "وحشت اور بارود میں لپٹی شاعری"نامی مجموعے میں خودکش دھماکوں کے نتیجے میں پھیلے انتشار،بدامنی اور عدم تحفظ کی نشاندہی کی ہے۔۲۰۱۶ء میں کشور ناہید نے"آباد خرابہ"نامی ایک مجموعے میں پاکستانی معاشرے کے مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ مجموعہ کلام سوات ہزارہ، بلوچستان،پشاور اور شامی پناہ گزینوں کے غم کی داستان ہے۔اس مجموعے میں"سوات کا نوحہ"،"ہزارہ بستی والوں کا ہزنیہ"،"نوحہ بلوچستان کا"،"سانحہ کراچی ۱۳ مئی"،"ٹینڈرز نوٹس"اور"اصغر ندیم سید کا دائرہ زیست"جیسی نظمیں شامل ہیں۔کشور ناہید نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثری میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں اور اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔نثر میں کشور ناہید نے کالم نگاری،ترجمہ اور مضمون کو اپنا خاص میدان بنایا۔"عورت ایک نفسیاتی مطالعہ"سیمون ڈی بوار کی معرکۃ الارا کتاب"Second Sex"کے ترجمہ و تلخیص پر مشتمل ایک نثری

تصنیف ہے۔ ۱۹۸۲ء میں شائع ہونے والی اس کتاب میں عورت کے نسوانی نفسیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں کشور ناہید کا سفری تجربات پر مشتمل رپورتاژ "آ جاؤ افریقہ" شائع ہوا جس میں افریقی سماج کی سیاہ فام عورت کی مشقت بھری زندگی کو بھی زیرِ بحث لایا گیا۔ کشور ناہید نے کھیتوں اور ملوں میں کام کرتی افریقی عورت کو دلکش اور جاذب نظر قرار دیا۔ "باقی ماندہ خواب" کشور ناہید کی مغربی مفکرین کے انٹرویوز اور تنقیدی مضامین پر مشتمل نثری تصنیف ہے۔ اس میں جے ایچ لارنس، اینا اضماتووا، ہیمنگوے، پابلو نرودا، ہنری ملر، ہرمن ہیسے، البرٹ کامیو، سیمون ڈی بوار اور سارتر وغیرہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کشور ناہید نے دنیا کی پہلی خاتون ہائی جیکر اور فلسطینی حریت پسند مجاہدہ لیلیٰ خالد کی آپ بیتی "My People Shall Live" کا نثری ترجمہ کیا جو "میرے لوگ زندہ رہیں گے" کے نام سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ یہ تصنیف اردو زبان و ادب میں قابلِ ذکر اضافہ کیا۔ ۱۹۹۲ء میں کشور ناہید نے بیپسی سدھوا کے ایک ناول "Bride" کو "زیتون" کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ فراغت اور بے روزگاری کے زمانے میں معاشی ضروریات کے تحت کیا گیا۔ ۱۹۹۶ء میں کشور ناہید کی ایک اور کتاب "خواتین افسانہ نگار" منظر عام پہ آئی جس میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کی ۲۳ افسانہ نگار خواتین کے افسانے مرتب کیے گئے ہیں۔ اس میں حجاب امتیاز علی، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، خالدہ حسین، الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح احمد، زاہدہ حنا اور زیتون بانو وغیرہ کا ایک ایک افسانہ شامل ہے۔ لکھتی ہیں:

> یوں تو اُردو ادب میں کہانی اور وہ بھی جدید کہانی لکھنے والیوں میں بہت سے نام فہرستوں میں گنوائے جاسکتے ہیں مگر جن کو ادب کی سند ملی اور جنھوں نے زینت کی کشیدہ کاری کے پیرہن سے نکل کر ایک کہانی کار کی حیثیت سے اپنا وجود منوایا، اپنے عہد کو تحریر کیا، اپنے اندازِ فکر اور اسلوب کو منوایا اور جن کی تحریر سے آنکھ چرانا نقادانِ ادب کے بس کی بات نہیں رہی ان کی کہانیوں کو مجتمع کیا تو اپنے زمانے کی تاریخ کی بساط بچھتی چلی گئی۔ (۱۷)

کشور ناہید نے نہایت مختصر اور جامع انداز میں خواتین کے ادبی سفر کی روداد بیان کی اور ان تمام خواتین کو منتخب کرنے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ ان خواتین نے رومانیت سے ہٹ کر اپنے عہد اور تاریخ کو رقم کیا۔ ۱۹۹۳ء میں کشور ناہید نے "Women Myth And Realities" نامی ایک کتاب مرتب کی جس کے لیے چند

ایسے مضامین کا انتخاب کیا جن کا موضوع عورت تھا۔ اسرار ورموز سے بھرپور یہ کتاب عورت کی نفسیات اور اس کے سماجی مقام کے متعلق کچھ حقائق پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد کشور ناہید نے ''عورت زبانِ خلق سے زبان حال تک '' کے نام سے عورت کے موضوع پر مشتمل ۲۶ مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب دیا۔ جدید خیالات کی حامل خواتین کے افکار و خیالات پر مشتمل یہ مضامین بین الاقوامی منظر نامے کے ذریعے، عورت اور مرد کے مقام میں تضاد واضح کرتے ہیں۔ ''بری عورت کے خطوط ''۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والا خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ ماں کی ایک ایسی بیٹی سے وابستہ خوف، حسرتیں اور خواہشات ہیں جو کبھی پیدا ہوئی، نہ پیدا ہو گی۔ حسرتیں کہ اگر بیٹی ہوتی تو دوست میسر ہوتا جس کے سامنے دل کے داغ رکھے جاسکتے۔ خوف کہ اگر وہ بھی اس دنیا اور بیٹوں جیسی ہوتی تو؟ ''بری عورت کی کتھا'' کے نام سے کشور ناہید کی آپ بیتی شائع ہوئی ۱۹۹۴ء میں بھارت جبکہ ۱۹۹۷ء میں پاکستان سے شائع ہونے والی یہ آپ بیتی کشور ناہید کی زندگی کی داستان ہے۔ جو اُردو آپ بیتی کی روایت میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام کیا ہے۔ ۱۴ ابواب اور کل ۱۷۴ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی اردو آپ بیتی کی روایت میں ایک دلکش اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کشور ناہید کی مطبوعات کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

ادا جعفری اور کشور ناہید دونوں کا شمار اہم لکھاریوں میں ہوتا ہے وقت اور مشکل حالات بھی جن کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ ان دونوں خواتین کی اہمیت و انفرادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے نہایت مشکل وقت میں عورت کو اس کے ادبی حقوق دلانا کا پرچار کیا جب عورت کا لکھنا نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا اور خود لکھنا تو درکنار اسے تو کسی مشاعرے میں جانے کی اجازت تک نہ تھی۔ ان دونوں خواتین نے زمانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قلم اٹھایا اور اپنی ادبی حیثیت منوا کر رہیں۔ اگرچہ ان دونوں خواتین کو ادب میں اولین اور بنیادی مقام بطور شاعرہ ہی حاصل رہا لیکن نثری میدان میں بھی ان کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ ان دونوں خواتین کی نثری تخلیقات بھی نہایت اعلیٰ درجے کی معیاری تخلیقات ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد امجد عابد،ڈاکٹر، عصری شعور کی اصطلاح اور اردو تنقید،zabanoadab.gcuf.edu.pk،۲جون ۲۰۱۷،۴:۳۰am

۲۔ Oxford English Dictionary,Vol.1,Oxford University Press,United Kingdom,1970,P 80

۳۔ محمد طفیل، تصریحات (مضمون)، مطبوعہ: نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۳۰۲

۴۔ وہاج الدین علوی، ڈاکٹر، اردو میں خود نوشت سوانح: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۴۱

۵۔ عبدالمجید قریشی، آپ بیتی اردو ادب میں (مضمون)، مطبوعہ: سہ ماہی الزبیر، اکادمی اردو، بہاولپور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹

۶۔ سالک، علیم الدین، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو (مضمون)، مطبوعہ: نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴، ص ۴۰

۷۔ جعفر تھانیسری، کالا پانی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۹۷

۸۔ جعفر تھانیسری، کالا پانی، ص ۹۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۱۔ شہر بانو بیگم، بیتی کہانی، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۶، ص ۵۷

۱۲۔ وہاج الدین علوی، ڈاکٹر، اردو میں خود نوشت سوانح: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۸۵

۱۴۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، تلخیص، مطبوعہ: نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۵۱۲

۱۵۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، تلخیص، مطبوعہ: نقوش، ص ۵۱۲

۱۶۔ ندیم احمد،ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری(مضمون)، مطبوعہ: خدابخش لائبریری جرنل پٹنہ، بہار، ہندوستان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۵

۱۷۔ وہاج الدین علوی، ڈاکٹر، اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۴۹

۱۸۔ احمد شجاع، حکیم، خون بہا، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۴۲

۱۹۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد، جامعہ اردو کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۴۰۳

۲۰۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب۔ شناخت کی نصف صدی، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۴۔۲۸۳

۲۱۔ مرزا غالب، دیوان غالب، غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی، طبع سوم، ۲۰۰۷ء، ص ۸۲

۲۲۔ آغا جانی کاشمیری، سحر ہونے تک، امپیریل پریس، دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۸

۲۳۔ سید احتشام حسین، پروفیسر، تنقیدی جائزے، احباب پبلشرز لکھنو، ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۱

۲۴۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، میری دنیا، کارواں پبلشرز، الہ آباد، ۱۹۶۵ء، ص ۱۴

۲۵۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، میری دنیا، ص ۱۴

۲۶۔ کرنل محمد خان، بجنگ آمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص ۶۳

۲۷۔ کرنل محمد خان، بجنگ آمد، ص ۱۷۲

۲۸۔ وہاج الدین علوی، اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۱

۲۹۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری (مضمون)، مطبوعہ: خدابخش لائبریری جرنل پٹنہ، بہار، ہندوستان، ۲۰۰۲ء، ص ۶۸

۳۰۔ جوش ملیح آبادی، یادوں کی بارات، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء ص ۲۶

۳۱۔ سعید خان، (انتساب) یادوں کی بارات از جوش ملیح آبادی، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء ص ۱

۳۲۔ گوپال متل، لاہور کا جو ذکر کیا، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸

۳۳۔ مرزا غالب، دیوان غالب، غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی، طبع سوم، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱

۳۴۔ احسان دانش، جہانِ دانش، القائم آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۴۷

۳۵۔ کلیم الدین احمد، ڈاکٹر، اپنی تلاش میں، (جلد اول)، کلچرل اکادمی، گیا، ۱۹۷۵ء، ص ۲۰۳

۳۶۔ اطہر حسین، ڈاکٹر، شام شعر یاراں میں مشتاق احمد یوسفی کی عصری آگہی، avadhnama.com، ۱۲ جون ۲۰۱۸، 7am

۳۷۔ ابوالحسن علی ندوی، (پیش لفظ)، آپ بیتی، از عبدالماجد دریابادی، مکتبہ فردوس لکھنو، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱

۳۸۔ مشفق خواجہ، (پیش لفظ)، مٹی کا دیا، از مرزا ادیب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳

۳۹۔ صہبا لکھنوی، خود نوشت، مطبوعہ: ماہنامہ افکار، مکتبہ افکار کراچی، ۱۹۸۴، ص ۴۳-۴۴

۴۰۔ محمد خالد اختر، ڈاکٹر، گردِ راہ (مضمون)، مطبوعہ: آج، شمارہ ۵۲، فروری ۲۰۰۵، آج کی کتابیں، کراچی، ص ۳۲۴

۴۱۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، گردِ راہ، (طبع سوم)، المسلم پبلشرز کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۳

۴۲۔ مشتاق قمر، شام کی منڈیر سے، مطبوعہ: ماہنامہ اردو زبان، سرگودھا، نومبر ۱۹۸، ص ۸۲

۴۳۔ مشفق خواجہ، (دیباچہ)، حیاتِ مستعار، از جلیل قدوائی، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۸

۴۴۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد، جامعہ اردو کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۴۵۸

۴۵۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷، ص ۲۲

۴۶۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، ص ۱۰۰

۴۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، یادِ عہد رفتہ، لاہور، ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۸ء، ص ۷

۴۸۔ اعجاز حسین بٹالوی، ناممکن کی جستجو (مضمون) مطبوعہ: علامت، شمارہ ۸، اگست ۱۹۹۳ء، استقلال پریس لاہور، ص ۳۸

۴۹۔ حمیدہ سالم، شورشِ دوراں، ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹

۵۰۔ اختر الایمان، اس آباد خرابے میں، اردو اکادمی دہلی، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۷

۵۱۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۵

۵۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، حرف اکادمی راولپنڈی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۸

۵۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب ، ص ۳۵

۵۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، اپنا گریباں چاک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۵۷

۵۵۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، اپنا گریباں چاک ، ص ۵۸

۵۶۔ احمد بشیر، دل بھٹکے گا، فیروز سنز لاہور، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۸

۵۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۶۰

۵۸۔ مرزا غالب، دیوان غالب، غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی، طبع سوم، ۲۰۰۷ء، ص ۹۹

۵۹۔ نوائے وقت، www.nawaiwaqt.com، ۹ نومبر ۲۰۱۴ء، 9:15am

۶۰۔ الطاف حسین حالی، مولانا، دیوان حالی، اردو اکادمی دہلی، دہلی، طبع نہم، ۲۰۱۳ء، ص ۲۷

۶۱۔ ساقی فاروقی، آپ بیتی پاپ بیتی، اکادمی بازیافت کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۵۰

۶۲۔ بانو قدسیہ، راہِ رواں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۴

۶۳۔ مرزا غالب، دیوان غالب، غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی، طبع سوم، ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۸

۶۴۔ رضیہ بٹ، بچھڑے لمحے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۸

۶۵۔ رضیہ بٹ، بچھڑے لمحے، ص ۴۰

۶۶۔ ستیہ پال آنند، کتھا چار جنموں کی، کلاسک آرٹ پریس، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۵۲۵

۶۷۔ سید ضمیر جعفری، اردو شاعری کی خاتون اول، (مضمون) مطبوعہ: نگار ادا جعفری نمبر، سالنامہ، ۱۹۹۸ء ص ۵۱

۶۸۔ ادا جعفری، ساز سخن بہانہ ہے، غالب پبلشرز لاہور، طبع اول، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱

۶۹۔ افتخار عارف، (پیش لفظ) کشور ناہید: شخصیت و فن، از شاھین مفتی، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۷

۷۰۔ مرزا غالب، دیوان غالب، غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی، طبع سوم، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۵

۷۱۔ کشور ناہید، خواتین افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۶ء، ص ۵

باب دوم:

ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور: سماجی تناظرات

سماج ہندی زبان کا لفظ ہے جو سنسکرت کے دو الفاظ "سم" اور "اج" سے مل کر بنا ہے۔ "سم" بمعنی اکٹھا اور "اج" کے معنی رہنا۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے society کا لفظ مستعمل ہے جو لاطینی زبان کے لفظ socias سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں اکٹھا ہونا۔ جز وقتی طور پر مجمع کی صورت اکٹھے ہونے والے افراد کو سماج کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ سماج سے مراد مختلف اصولوں، روایتوں اور آدرشوں میں بندھا افراد کا ایسا گروہ ہے جو اخلاقی و باطنی طور پر ایک دوسرے وابستہ ہو اور کافی عرصے سے ایک جگہ رہ رہا ہو۔ سماج ایک جگہ رہنے والا افراد کا ایک ایسا گروہ ہے، جس کی ضروریات اور مسائل ایک ہوں اور اغراض و مقاصد میں مشابہت و ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ "سماج رسم و رواج کا، حقائق اور آپسی ہمدردی کا، مختلف گروہوں اور شعبوں کا، انسانی برتاؤ اور طور طریقوں کا حریّت اور مساوات کا نام ہے۔"(۱) ادب کی بنیاد سماج پر ہے۔ عام طور پر ادب سماج کا آئینہ کہلاتا ہے۔ ادب دراصل وہی دکھاتا ہے جو سماج میں چل رہا ہو۔ ادیب بھی چونکہ سماج کا ایک حصہ ہے لہذا ادب سماج سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ کسی بھی عہد کے ادب میں اس کی سماجی جھلکیاں واضح طور پہ دیکھی جا سکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> میرے خیال میں ادب ایک سماجی فعل ہے اور چونکہ سماجی زندگی ہر لمحہ اور ہر آن تغیر و تبدل سے ہم آغوش و ہمکنار رہتی ہے۔ اس لیے ادب بھی تغیرات و انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ ہر دور کے ادب میں اس وقت کی سماجی تصویروں کا آنا ضروری ہے کیونکہ ادب بہر حال سماجی زندگی ہی کے درمیان پیدا ہوتا، پلتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔ کسی قسم کا کوئی ادب اپنے ماحول، حالات و واقعات اور سماجی زندگی کے مختلف مسائل سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ (۲)

ادب اور سماج کے مابین اس گہرے تعلق کو ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اس طرح بیان کیا ہے:

ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔ دراصل ادب اپنے سماج کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کا سوسائٹی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ادب پر اس دور کی سماج کی تحریکات کا اثر پڑتا ہے اور عوام کے رجحانات کا عکس ملتا ہے۔ (۳)

ڈاکٹر سلام سندیلوی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب اور سماج کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جہاں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ادب سماج کے لیے ہوتا ہے، وہیں اس بات پر بھی تمام نقاد متفق ہیں کہ ادب اپنا مواد بھی سماج ہی سے لیتا ہے۔

آپ بیتی اور سماج

آپ بیتی بھی ادب ہی کا ایک حصہ ہے جو آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی بن کر سامنے آتی ہے۔ آپ بیتی نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی سطح پر بھی ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتی چلی آئی ہے۔ خالصتاً انفرادی نوعیت کی صنفِ ادب ہونے کے باوجود آپ بیتی میں سماجی رنگوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی خصوصیت موجود رہی ہے۔ چنانچہ ہر دور کی آپ بیتی میں اس دور کے سماجی رنگ واضح طور پہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یوسف جمال انصاری نہایت اچھوتے اور منفرد انداز میں سماج اور آپ بیتی کے مابین تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خارج اور باطن میں ایک ایسا باہمی ربط ہے کہ خارجی عالم کو ہمیشہ اپنی ذات ہی کے ذریعے پرکھا جاتا ہے۔ اسی طرح خود اپنی ذات کی معرفت و تشریح کے لیے خارج کا سہارا بھی ناگزیر ہے۔ یوسف جمال انصاری لکھتے ہیں:

بات یہ ہے کہ علمِ ذات اور علمِ خوارج دونوں کے درمیان ایک ضد بھی ہے اور ایک ربطِ باہم بھی۔ باہر کی دنیا جاننے کے لیے اپنی ذات کا سہارا لینا ناگزیر ہے اور اسی طرح اپنی ذات کی تشریح کرنے کے لیے کل پیمانوں کی مدد لینی پڑتی ہے، جو باہر کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۴)

آپ بیتی صرف ذاتی حالات و کوائف کے بیان تک محدود نہیں اس میں آپ بیتی نگار کی فکر اور سماجی بصیرت کی جھلک ناگزیر ہے۔ ہر آپ بیتی نگار کے ہاں نجی حالات و واقعات کے ساتھ سماجی زندگی کا مشاہدہ بھی

سامنے آتا ہے۔ تاہم یہ آپ بیتی نگار پہ منحصر ہے کہ وہ داخلی و خارجی زندگی کے حالات وواقعات کے مابین توازن قائم کر سکتا ہے کہ نہیں۔

ا۔ ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" میں عصری شعور کے سماجی تناظرات

ادا جعفری ہم عصر سماجی صورتحال سے اچھی طرح آگاہ تھیں۔ ایک گھریلو، روایتی اور پردہ دار خاتون ہونے کے باوجود ادا جعفری سماجی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ ادا جعفری اپنے دور کے ان تمام سماجی امور و مسائل کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے انہیں حل کرنے کی خواہش مند دکھائی دیتی ہیں جو جدید تقاضوں سے غیر ہم آہنگ ہونے کی بنا پر اصلاح و تغیر کے متقاضی ہیں۔ ادا جعفری اپنی آپ بیتی کے بارے میں لکھتی ہیں: "یہ ایک ایسی کہانی ہے جو کہانی بھی نہیں ہے ہاں ایک خاص زمانے کے رنگ، تہذیب، طرزِ فکر اور طریقِ معاشرت سے دوبارہ ملاقات یا تعارف کی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ "[۵] ادا جعفری نے روزمرہ زندگی کی چہل پہل، جاگیر دارانہ طبقے کی عیاشیوں، لاپروائیوں اور سماجی روایات واقدار کا ذکر کرتے ہوئے دراصل ایک مکمل سماجی منظر نامہ پیش کیا ہے، جو ان کے سماجی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> جو رہی سو بے خبری رہی کو ایک نہایت کامیاب خود نوشت اس لیے بھی کہا جا سکتا ہے کہ ادا نے اپنی زندگی کے ہر گوشے کو بے نقاب کرنے کے باوجود صرف اپنی ذات کو ہی توجہ کا مرکز نہیں بنایا بلکہ اپنے عہد و ماحول، اعزہ و احباب سبھی کے ساتھ انصاف کیا ہے کسی کو نظر انداز نہیں کیا۔ یوں تو یہ ادا جعفری کے سفر زندگی کی روداد ہے مگر ایک مکمل عہد، ایک خاص زمانے کی تہذیب، طرزِ فکر، طریقِ معاشرت، اس دور کی نامور شخصیات، کیا ہے جو ان پونے چار سو صفحات میں نہ سمٹ آیا۔ [۶]

ڈاکٹر نورالحسن نقوی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ ادا جعفری کی آپ بیتی واقعی مختلف خصوصیات سے مزین ان کے دور کی ایک مکمل داستاں ہے جس میں سماج کے رنگا رنگ اور متنوع پہلو سامنے آتے ہیں اور قارئین کے لیے مزید دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

i۔ سماجی روایت واقدار کا تناظر

اداجعفری نے ان تمام ہم عصر روایات واقدار پہ روشنی ڈالی جو صدیوں سالوں جوں کی توں نسل در نسل آگے منتقل ہوتی چلی آئی تھیں۔ لکھتی ہیں کہ کہ یہ روایتیں سماج میں ایک مدت سے نبھائی جارہی تھیں لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگوں نے ان میں سے بہت سی قدیم روایات کو خود اپنی آنکھوں سے پامال ہوتے دیکھا۔ سماجی روایت وقدار بیان کرتے ہوئے ان کے ہاں تین طرح کے سماجی منظر نامے سامنے آتے ہیں پہلا منظر نامہ تقسیم ہند سے پہلے کا سماجی منظر نامہ ہے جس کے تحت انہوں نے تورہ بندی کی روایت، زچہ گیری کی روایت ،چالیس نفلوں کی روایت، چراغی اور بچے کی پیدائش پر زچہ وبچہ کی مزار پر حاضری کی مختلف روایتیں بیان کی ہیں۔

ا۔ تقسیم ہند سے پہلے کا سماجی منظر نامہ

اداجعفری کی آپ بیتی میں ہندوستان کا قدیم سماجی منظر نامہ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت اجاگر ہوا ہے۔ گرمیوں کے شب وروز کا سماجی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ گرمیوں میں روز کا یہی معمول تھا کہ شام ہوتے ہی صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا اور سفید چادروں والی چارپائیاں بچھادی جاتیں۔ ان کی ایک طرف لکڑی کی گھڑونچی پر گھڑے اور صراحیاں رکھ دی جاتیں جن پر چاندی کے چمکتے ہوئے کٹورے اور گلے میں بیلے کے موٹے موٹے ہار ہوتے جو رات کھلنے پر خوشبو کی سوغات بانٹتے۔ اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید سہولیات سے محروم اس سماج میں خس خانے ایک اہم سماجی ضرورت تھے۔ گرمی کی شدت اور لو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے خس کی ٹٹیوں سے بنے ان کمروں کا استعمال عمل میں لایا جاتا۔ جنہیں مزید ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا۔ خس خانوں میں ہاتھ سے چلنے والے پنکھے لگے ہوتے جن پر ایک ملازمہ معمور ہوتی اس کا کام پنکھے کو چالو رکھنا ہوتا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> بڑی حویلی میں گرمیوں کی دوپہر میرے لیے سب سے قیمتی خوبصورت وقت ہوتا۔ جب گرمی اور لو کی شدت سے بچنے کے لیے دالانوں کے پردے کھینچ دیے جاتے۔ خس خانوں میں پانی چھڑکا جاتا اور بوڑھی نوکرانی چھت سے لٹکے پنکھے کی ڈوری کھینچنا شروع کر دیتی۔ بیبیاں، چھوٹے بچوں کو سلا کر لڑکے لڑکیوں کو آرام کرنے کی ہدایت دیتیں اور خود بھی

چوکیوں کے فرش یا پلنگ پر لیٹ کر سو جاتیں۔ نوکرانی کو بھی نیند آنے لگتی اور پنکھے کی جنبش میں وقفے بڑھتے جاتے۔[۷]

ایک جگہ لکھتی ہیں:

ٹھیلا خواتین کے استعمال کی عام سواری تھی۔ڈولی بھی استعمال ہوتی تھی جسے دو کہار اٹھا کر چلتے تھے لیکن اس میں گنجائش کم ہوتی تھی۔ ٹھیلا ایک دو پہیوں کی گاڑی تھی جس کے پچھلی طرف لکڑی کا تختہ اور تین جانب کپڑے کا پردہ لگا ہوتا۔ پیچھے سے ہینڈل پکڑ کر چلایا جاتا تھا۔[۸]

ادا جعفری کو اس بات کا مکمل شعور تھا کہ ان کا ہم عصر سماج کیسا تھا اور کن خصوصیات کی بنا پر دیگر ادوار سے منفرد و ممتاز رہا۔ ادا جعفری نے اپنی آپ بیتی میں ہم عصر سماج کی سوچ، مسائل، تہذیب و ثقافت جیسے سبھی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ہندوستانی سماج میں کئی روایتیں عام تھیں۔ راکھی بندھن کے بارے میں لکھتی ہیں:

بچپن میں مجھے ہندوؤں کے تہوار ہولی، دیوالی وغیرہ سبھی بہت دلچسپ نظر آتے تھے مگر ان کا سب سے خوبصورت تہوار راکھی بندھن ہے جو ہر سال ساون کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کی ندرت کو میں ابھی تک نہیں بھول سکی ہوں۔ اس دن بہنیں اپنے بھائیوں کی کلائی پر راکھی باندھتی ہیں اور ان کی درازی عمر اور خوشیوں کے لیے دعائیں مانگتی ہیں۔ اس تقریب کا حسین ترین پہلو یہ ہے کہ سگی بہن کے علاوہ بھی اگر کوئی لڑکی چاہے تو راکھی باندھ سکتی ہے اور اسے حقیقی بہن کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب کسی قانونی حیثیت سے نہیں ہے لیکن اس رشتے کو سماج تسلیم کرتا ہے۔[۹]

مہمان نوازی کی روایت ایک صدیوں پرانی روایت ہے جو تقریباً ہر سماج کا اہم حصہ ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر سماج اور ہر دور میں اس کا ایک ہی طریقہ رہا ہو ادا جعفری نے چونکہ مختلف سماج دیکھے اور ان کی روایات و اقدار کا مشاہدہ کیا لہذا وہ یہ جانتی تھیں کہ یہ طریقے ایک دوسرے سے کتنے مختلف رہے ہیں ان کے مطابق ہندوستانی سماج میں مہمان نوازی عام طور پر پان سے کی جاتی تھی لیکن مہمان نوازی میں بھی مقام مرتبے کو لازمی ملحوظ رکھا جاتا۔

> پان تو ہر آئے گئے کو کھلانے کا دستور تھا لیکن اس تواضع میں حفظِ مراتب کی بڑی اہمیت تھی۔ بزرگوں اور دوستوں کو ہمیشہ تمام لوازمات کے ساتھ پورے پان کی گلوری بنا کر خاصدان میں رکھ کر پیش کی جاتی۔ برابر والوں کے لیے پورا پان نصف تہہ کیا ہوا تھالی میں رکھا جاتا۔ ایک طرف چھالیہ، دوسری طرف تمباکو الائچی وغیرہ۔ رتبے میں چھوٹے لوگوں کو کھلا ہوا آدھا پان حسبِ ضرورت چھالیہ تمباکو ڈال کر ہاتھ میں دے دیا جاتا۔ (۱۰)

اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ نائن اس سماج کا چلتا پھرتا، پر رونق اور ایک اہم حصہ تھی جس سے خواتین عموماً قاصد کا کام لیتی تھیں۔ مخصوص لباس میں ملبوس یہ نائن دور ہی سے پہچان لی جاتی۔ خوشی غمی کی خبر دیتی، دعوت نامے اور مٹھائی تقسیم کرتی ان عورتوں کا ہر کوئی احترام کرتا۔ اس سماج میں ان خواتین کے بارے میں کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی گئی۔ تہذیبی جھلکیوں سے مزین اس آپ بیتی پر سماجی روایات واقدار کی گہری چھاپ واضح طور پہ دیکھی جا سکتی ہے۔ سلسلہ جنبانی کی روایت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس سماج میں ایک روایت فوری اور براہ راست رشتہ نہ بھیجنے کی تھی۔ گھر کی بی بیاں تب تک رشتے کی بات کرنے نہ جاتیں جب تک انہیں فریقِ ثانی کی رائے معلوم نہ ہو جاتی۔ باقاعدہ رشتہ ڈالنے سے قبل یہ کام نائن کا تھا کہ اگلے کی مرضی ومنشا کا پتہ لگائے۔ تاہم نائن بھی یہ کام الفاظ کا سہارا لیے بغیر نہایت مہارت سے سرانجام دیتی۔ ادا جعفری نے جہاں اس سماجی رسم کو دلچسپ اور لطیف قرار دیا وہیں انہیں یہ احساس بھی تھا کہ اس طرح رشتہ ہونے میں مہینے لگ جاتے۔ نائن کو ویسے اس کے سماجی مقام کے مطابق آدھا پان دیا جاتا جس میں باقی لوازمات بھی پورے نہ ہوتے۔ لیکن یہی نائن جب ایک خاص مقصد کے تحت (سلسلہ جنبانی کے لیے) آتی تو جواب مثبت ہونے کی صورت میں اسے تمام لوازمات کے ساتھ الائچی والا پورا پان پیش کیا جاتا۔ جواب نفی کی صورت میں ہونے پر اس کی تواضع اس کے سماجی مقام ومرتبے کے عین مطابق ہی کی جاتی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ رشتے طے کرنے کے اس اہم ترین معاملے میں الفاظ کا سہارا لینے کے بجائے رمزیہ انداز اختیار کیا جاتا۔ نائن بھی زبانی کلامی مدعا بیان کیے بغیر اپنی کسی حرکت سے یہ باور کرا دیتی کہ آج اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ اور فریق ثانی کی رائے بھی اسی رمزیہ انداز میں جانچ لی جاتی۔ عام طور پر چونکہ الفاظ کا استعمال خال خال ہی تھا لہذا نائن کو پیش کیے جانے والے

اس پورے پان ہی کو رشتے کا عندیہ سمجھا جاتا۔ شادی بیاہ کی رسمیں اور سماجی طور طریقے بیان کرتے ہوئے ایک جگہ تورہ بندی کی روایت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> بدایوں میں شادی کا کھانا کبھی کبھی سات قسم کا ہوتا جسے تورہ بندی کہا جاتا تھا۔ یہ کھانا گھر گھر پہنچانا بھی نائنوں کی ذمہ داری ہوتی۔ طریقہ یہ تھا کہ دستر خوان بچھتا، مہمانوں کے سامنے ان کے افراد خانہ کے حصے بھی چنے جاتے۔ مہمانوں نے جو کھایا وہ کھایا، بقیہ تمام کھانا نائن ان کے گھر پہنچا دیتی۔ تورہ بندی کے لیے مٹی کی کوری رکابیاں اور پیالے استعمال ہوتے۔ (۱۱)

یہ ایک ایسا سماج تھا جہاں پہلے پہل مردوں کے لیے بھی ملازمت اور تعلیم کی کوئی روایت موجود نہ تھی۔ پہلے پہل جدید تعلیم کو معیوب خیال کیا جاتا تھا بعد ازاں ہندوؤں میں سماجی تحریکوں نے پہلا قدم اٹھایا اور ان کی دیکھا دیکھی مسلم معاشرے میں بھی سماجی تحریکیں وجود میں آنے لگیں جنہوں نے تعلیم کے حق میں بھی آواز اٹھائی۔ سماجی تحریکوں کی کوششوں سے جلد ہی مسلمان لڑکوں پر تو جدید تعلیم کے در وا ہو گئے لیکن لڑکیوں کے لیے جدید تعلیم اب بھی ایک شجرِ ممنوع تھی۔ اسی سماج کی روایات بیان کرتے ہوئے ادا جعفری ایک اور منفی پہلو کے بارے میں لکھتی ہیں:

> میرے ہوش سنبھالنے تک ٹونک والوں کی محدود دنیا اور بدایوں شہر میں قابلِ فہم تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اب یہ برداشت کر لیا گیا تھا کہ لڑکے علی گڑھ جا کر انگریزی تعلیم حاصل کریں لیکن کسی بھی محکمے میں کسی بھی عہدے پر ملازمت کا تصور اس خاندان کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ (۱۲)

دراصل سماجی تحریکوں کے زیرِ اثر تعلیم عام ہوئی تو لڑکے جدید تعلیم سے تو آراستہ ہوتے چلے گئے لیکن جاگیر دارانہ نظام کے حامل اس سماج میں ان کی ملازمت کا تصور اب بھی موجود نہ تھا۔ روایت سے انحراف کرتے ہوئے ملازمت اختیار کرنا خاندان اور برادری کی ناراضگی مول لینے کے برابر تھا۔ یہ کام گویا خاندان بھر کی ناک

کٹوانے کے برابر تھا۔ جس میں پورے خاندان کی رسوائی سمجھی جاتی۔ ادا جعفری نے ایسی روایات اوراصولوں کو خود ساختہ اور بے لچک قرار دیا ہے۔

> جو بدایوں میں نے دیکھا اور جتنا بھی دیکھا اس میں قدامت پسندی تھی۔ بے لچک اصولوں کی پابندی تھی۔ اور ایک طرح کی بے ساختہ سی خود ساختگی۔ ورنہ یہ وہی شہر ہے جو ایک زمانے میں ثقافت کا مرکز تھا۔ (۱۳)

ادا جعفری نے جاگیر دارانہ نظام کے حامل اس سماج کو ایک ایسا روایتی سماج قرار دیا ہے جہاں روایت کی پاسداری بہت ضروری تھی۔ اس سلسلے میں اکثر عورتوں کے ساتھ ساتھ مرد بھی بے بس تھے۔ اس سماج میں کچھ لگے بندھے اور طے شدہ اصول صدیوں سے چلے آرہے تھے۔

> ٹونک والا پھاٹک کے اندر رہنے والے ایک طے شدہ ضابطہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں روایت شکن قسم کے فیصلے مرد خود اپنے لیے نہیں کر سکتے تھے، وہاں عورتوں کے لیے تو سانس لینے کے آداب تک مقرر تھے۔ (۱۴)

ادا جعفری نے اس آپ بیتی سے مروجہ پردے کی روایت کی مخالفت کا کام بھی لیا۔ پردہ اس دور کے اہم مسائل میں سے ایک اہم ترین مسئلہ تھا۔ ادا جعفری کو پردے کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ان کے خیال میں پردے کو اس دور کا اہم ترین مسئلہ بنالیا گیا تھا۔ پردے کی اس مروجہ روایت کو خود ساختہ روایت قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ کیسی روایت تھی جس کے تحت عورت کا ہزار پردے میں بھی باہر نکلنا ممنوع تھا۔ عورت کا عورت سے بھی کچھ اس طرح کا پردہ تھا کہ غیر خاندان کی خواتین کے گھر آنے پر کنواری لڑکیوں پر ان سے پردہ کرنا ایک لازمی امر تھا۔

> اس خاندان کی لڑکیاں بڑے بوجھل نصیب قسامِ ازل سے لے کر آتی تھیں۔ سنا تھا کہ ایک زمانے میں تو اس گھر کی لڑکیوں کا بزرگ خواتین کی معیت میں اور ہزار پردوں کے ساتھ بھی گھر کی دہلیز سے قدم رکھنا ممنوع تھا۔ کسی رشتہ دار کے گھر تک نہیں جاسکتی تھیں۔ غیر خاندان کی خواتین جب گھر میں آتیں تو کنواریوں کے لیے ان سے بھی پردہ کرنا لازم

تھا۔ جو خاندان خود اپنی نگاہوں میں جتنا زیادہ معتبر تھا خواتین پر اتنی ہی زیادہ پابندیاں تھیں۔ (۱۵)

یہ ایک سماج تھا جہاں ولادت کے وقت بھی کئی ایک روایات بر قرار رکھی جاتی تھیں ولادت سے جڑی ایک روایت زچہ گیری کی روایت تھی جس کے تحت ہر ولادت کے موقع پر ڈھولک کی تھاپ پر مخصوص گیت گانے گائے جاتے۔ ادا جعفری کے بقول یہ زچہ گیریاں گانے کے لیے عام طور پر مراثنوں کی خدمات لی جاتی تھیں "ولادت کے موقع پر دنوں زچہ گیریاں گائی جاتیں۔ جن کے بول بہت دلچسپ ہوتے۔"(۱۶) ان کے مطابق بچے کی پیدائش پر یہ زچہ گیریاں کئی کئی دن گائی جاتی تھیں۔ اسی سماج میں ولادت کے موقع پر مزار پر حاضری کی ایک اور روایت دیکھنے کو ملتی ہے۔ بچہ جیسے ہی چالیس دن کا ہوتا فوراً قریبی کسی مزار پر حاضری دی جاتی۔

مجھے معلوم نہیں لیکن یہ دستور تھا کہ بدایوں میں جب کسی گھر میں ولادت ہوتی تو چلہ نہا کر ماں اور بچہ سب سے پہلے اس مزار پر حاضر ہوتے۔ یہ حاضری عشاء کی نماز کے بعد ہوتی تھی۔۔۔ عشاء کی نماز کے بعد ماں اپنے بچے کو لے کر کسی بزرگ خاتون اور بڑے بچوں کے ساتھ اس مزار پر آتی۔ ایک دونے میں بتاشے یا مٹھائی اور کبھی کبھی پھول بھی ہوتے جو وہاں رکھ دیا جاتا۔ مزار سے خالی ہاتھ واپس جاناماں اور بچے کے لیے برا شگون سمجھا جاتا۔ پھاٹک کے ساتھ جو پہلا دروازہ تھا، وہ بڑی حویلی کا تھا۔ اس لیے ساتھ آنے والا کوئی بچہ ایک کپڑا یا رومال ہاتھ میں لیے ڈیوڑھی سے اندر آتا۔ گھر کی کوئی بی بی باورچی خانے میں جاتی اور کٹورہ دان میں جتنی روٹیاں ہوتیں ان میں سے ایک برکت کے لیے بچا کر بقیہ اس رومال میں لپیٹ دی جاتیں، جسے لیکر بچہ واپس چلا جاتا۔ یہ تمام رسم انتہائی خاموشی سے ادا ہوتی۔ کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آنے والی کس گھر سے آئی تھی۔ مجھے یاد ہے شام کو میری نانی روٹی پکانے والے سے کہتیں۔ روٹیاں ذرا زیادہ ڈالنا۔ شاید کوئی مرادوں والی آئے۔ جس شام کوئی تقدیر والی نہیں آتی، صبح یہ روٹیاں پکانے والی کو دے دی جاتیں۔(۱۷)

اس سماج میں مزار پر حاضری کے متبادل کے طور پر ایک اور روایت بھی پائی جاتی تھی۔ یہ روایت چراغی کی رسم کہلاتی تھی۔ اس زمانے میں موذن کے لیے کھانا بھجوانے کے علاوہ مسجد کے چراغوں کے لیے تیل کی رقم تو ویسے بھی باقاعدگی سے ادا کی جاتی تھی لیکن خاص طور پر ولادت کے موقع پر چلہ نہانے کے بعد ماں اور بچہ قریب مسجد میں حاضری دیتے۔ اس موقع پر شکرانے کے نفل ادا کرتے ہوئے چراغی کی رسم ادا کی جاتی۔ ادا جعفری اس بارے میں لکھتی ہیں:

> ہمارے یہاں ایسے موقع پر دستور یہ تھا کہ گھر کی کوئی بزرگ خاتون عشاء کی نماز کے بعد ماں اور بچے کو لیکر کسی قریبی مسجد میں جاتیں۔ ٹھیلے کے ساتھ ساتھ ایک نوکر بھی ہوتا۔ وہاں بچے کی ماں دو رکعت شکرانے کی نماز پڑھتی۔ اور صندوقچی میں چراغی کی رقم ڈالتی۔[۱۸]

اسی سماج میں ایک اور اہم روایت منت ماننے کی تھی کسی بھی دلی امید کی صورت میں چالیس مسجدوں میں نوافل ادا کرتے ہوئے مسجد میں چراغی کی منت مانی جاتی۔ ”اس خاندان میں خاص خاص دعائیں مانگنے کے لیے عشاء کی نماز کے بعد چالیس مسجدوں میں نفلیں پڑھی جاتیں۔ منت عموماً مسجد میں چراغ جلانے کی مانی جاتی۔“[۱۹] اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایتی سماج میں یہ اہتمام صرف ولادت کے موقع پر ہی، دیکھنے کو نہیں ملتا تھا بلکہ ہر دوسری تقریب اسی جوش و خروش سے منائی جاتی۔ اور مراثن کی خدمات بھی صرف زچہ گیری تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ اس سماج میں ہر دوسری رسم کی ادائیگی پر مراثن کی موجودگی لازمی تصور کی جاتی۔

> خواتین کے لیے دل بہلانے کے اور بھی مشغلے موجود تھے۔ منگنی، شادی، چوتھی، چالے کے علاوہ عقیقہ، بسمہ اللہ، آمین، گود بھرائی، کن چھیدن وغیرہ کی تقاریب بڑے اہتمام سے منعقد ہوتیں۔ نائن ہفتوں پہلے گھر گھر بلاوہ دینے جاتی۔ تقریب کی رونق کئی کئی دن رہتی۔ میراثنیں ڈھولک پر گیت گاتیں۔[۲۰]

قدیم روایات بیان کرتے ہوئے گھر دامادی کی روایت کے بارے میں لکھتی ہیں کہ جاگیر دار طبقے میں گھر دامادی کی روایت ایک ایسی روایت تھی، جس کی پاسداری لازم تھی۔ ”یہ عجیب فیصلے تھے کہ شادی صرف خاندان کے اندر ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے بھی بہت سی شرائط موجود تھیں جن میں سے ایک کڑی شرط گھر

دامادی تھی۔" [۲۱]اس روایت کے تحت شادی کے بعد بیٹیوں کو رخصت کرنے کے بجائے داماد کو گھر کا ایک مستقل فرد تسلیم کیا جاتا تھا۔ "ٹونک والا خاندان میں بیٹیاں بیاہ کر سسرال نہیں بھیجی جاتی تھیں داماد آکر رہتے تھے یا پھر آتے جاتے رہتے۔"[۲۲] ادا جعفری کے ہاں اس روایت کے خلاف مزاحمتی رویے کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ادا جعفری کے خیال میں غیر شادی شدہ خواتین کی تو سماج میں کوئی حیثیت ہی نہ تھی لیکن شادی شدہ خواتین بھی سماج کے آگے بے بس اور مجبور تھیں۔ ان کی بھی اپنی کوئی رائے اور کوئی وقعت یا حیثیت نہیں تھی۔ گھر دامادی کی شرط کے حامل اس سماج میں داماد تو اپنی انا کو پس پشت ڈال کر سسرال میں رہنے پر مجبور تھے ہی، خواتین بھی ازدواجی زندگی کی خوشیاں اپنے میکے کی روایتوں اور رواجوں پر قربان کرنے پر مجبور تھیں۔ ان خواتین میں بھی علیحدہ گھر بسانے کی خواہش جنم لیتی لیکن سماج اور روایات کے مقابل آہستہ آہستہ دم توڑ دیتی۔ ادا جعفری کے مطابق اس سماج میں اگرچہ بیٹیوں کو رخصت نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم گھر داماد کو گھر کا ایک مکمل فرد تسلیم کرتے ہوئے پوری عزت دی جاتی۔ سماجی تغیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ آہستہ آہستہ سوچ اور عمل بھی تبدیل ہوتے گئے اور پرانے خیالات اور دلچسپیوں کی جگہ نئے خیالات اور نئی دلچسپیوں نے لے لی۔

> اپنی ہی روایات کے تانے بانے میں جکڑے ہوئے اس گھرانے میں زندگی بسر کرنے کے آداب طے شدہ تھے۔ یہ فیصلے بزرگوں نے کیے تھے جو قرنوں سے بغیر کسی تامل، قبول کیے جا رہے تھے۔ لیکن وقت کی رفتار جاری تھی منظر تبدیل ہو رہے تھے۔[۲۳]

وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے جو ہر سماج میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سماج میں تبدیلی کے اسی عمل کو سماجی تغیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تبدیلی کا یہ عمل تیز بھی ہو سکتا ہے اور سست بھی تاہم ہر انسان کی نظر میں سماجی تبدیلی کے اس عمل کا آنا ضروری نہیں۔ ادا جعفری کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف سماج بلکہ اس کی بدلتی ہوئی مختلف حالتوں سے بھی واقف تھیں۔

۲۔ قیامِ پاکستان کے بعد کا سماجی منظر نامہ

ادا جعفری نے قیامِ پاکستان سے قبل کا سماجی منظر نامہ تو نہایت تفصیل سے پیش کیا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد کا سماجی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے قدرے اختصار سے کام لیا۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کی سماجی

جھلکیاں پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ لوگ ہندوستان میں زمینوں، جاگیروں اور باغات کے مالک تھے ہر چیز کی فراوانی تھی بازار سے اناج اور پھل سبزی خریدنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ زیور کپڑا سب گھر میں منگوا کر پسند کیا جاتا۔ سنار خود ڈیوڑھی میں آکر زیورات کے ڈیزائن وغیرہ کے بارے میں ہدایات لیتا۔ انہی لوگوں کو جب پاکستانی سماج میں آٹا، دال بازار سے خریدنا پڑا تو انہیں سخت جھٹکا لگا۔ دیسی گھی کی جگہ بناسپتی گھی استعمال کرنے میں پہلے پہل تو بڑی قباحت محسوس ہوئی لیکن آہستہ آہستہ نئے حالات کو قبول کرنا پڑا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ادا جعفری بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گئیں۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے اس سماج کی بنیاد سے لے کر اس کے استحکام اور ترقی تک کے تمام زمانے پر روشنی ڈالی۔ ادا جعفری نے اس نئے وجود میں آنے والے سماج کے بارے میں لکھا کہ اس نئے سماج کے مسائل بھی نئے تھے جن کا پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ مثلاً وہی لوگ جو وہاں چالیس چالیس گاؤں کے مالک تھے، یہاں زمین کی الاٹمنٹ کے قضیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کسی کو سامان کی قلت کا سامنا تھا تو کوئی ابھی اس جذباتی دھچکے ہی سے نہیں نکل پایا، کھوئے ہوؤں کی جستجو ابھی جاری تھی۔ ادا جعفری کے بقول اس سماج کو استحکام تو نصیب ہوا لیکن بہت وقت لگا۔ ان کے خیال میں تقسیمِ ہند اور بھی کئی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد روایات واقدار میں تبدیلی کا عمل نہایت تیزی سے دیکھنے کو ملا۔ تقسیم ہند اور اس کے فوراً بعد یکے بعد دیگرے کئی مارشل لاء لگنے سے سماجی اور اخلاقی اقدار پر وہ پہلے سی گرفت نہ رہی۔ یہیں سے ہی بے پردگی، رشوت، سفارش اور ڈاکے جیسی کئی سماجی برائیوں نے جنم لیا۔

ادا جعفری کے ہاں پاکستانی سماج پر مغربی تہذیب کے اثرات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پاکستانی سماج کی روایات واقدار میں تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ وہی باتیں جو پہلے پہل مغربی ممالک میں ان پاکستانیوں کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیتیں تھیں آج ان کے لیے معمول کی بات بن کے رہ گئی ہیں مثلاً وہی پاکستان جس کے باشندے پہلے پہل کسی دوسرے ملک میں موجود اولڈ پیپلز ہوم کے بارے میں دیکھتے سنتے تو یہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتے کہ یہ بھی تو کسی کے ماں باپ ہوں گے۔ ان کے لیے یہ بات نہایت غیر معمولی اور عبرت ناک ہوتی، آج اسی پاکستان میں یہ چیز نہ صرف موجود ہے بلکہ اخلاقی اقدار کی کمی اور اولاد کی بے حسی نے اسے آباد بھی رکھا ہوا ہے۔

اس زمانے میں اور اس وقت کہاں یہ دھیان میں آسکتا تھا کہ صرف بیس پچیس سال کے بعد
ہی پاکستان میں بھی ایسے گھر وجود میں آجائیں گے اور اپنوں کی بے حسی انہیں آباد بھی رکھے
گی۔ خال خال ہی سہی (ابھی ہم باقاعدہ ترقی یافتہ کہلانے کے قابل کہاں ہو سکے ہیں) (۲۴)

ادا جعفری نے اس سماجی رویے پر خود اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے جذبوں اور سماجی رشتوں کی بے حرمتی قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اولڈ ہاؤس میں موجود یہ لوگ کسی بھی ذہنی یا جسمانی معذوری سے تو محفوظ ہوتے ہیں تاہم موت کا مسلسل انتظار ان کا مقدر بن چکا ہوتا ہے۔ ادا جعفری کا کہنا ہے کہ سماجی اخلاقیات کی جھلک تو اس اولڈ ہاؤس میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن یہ اخلاقیات صرف تجارتی بنیاد پر ہی برتی جاتی ہیں۔

اس آپ بیتی میں ادا جعفری نے پرانی مثبت روایات واقدار سے لگاؤ کا اظہار کیا ہے اور ان کے کھونے اور پامال ہونے پر وہ دل مسوس کر رہ جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں اخلاقی اقدار کے زوال کا بھگتان پورے سماج ہی کو بھگتنا پڑتا ہے جیسے پاکستانی سماج میں پہلے ائیر پورٹ پر پاسپورٹ چیک کرنے کا کوئی رواج نہ تھا لیکن منشیات سمگلنگ کا دھندہ پھیلنے سے عام مسافروں کے لیے بھی ویزے کا حصول بہت مشکل ہو گیا۔ ادا جعفری کے مطابق جس وقت سماج میں منشیات فروشی اتنی عام نہ تھی اس وقت ویزے کا حصول اتنا مشکل نہ تھا ویزہ عام طور پر ائیر پورٹ پہ ہی مل جاتا۔ اسی طرح مصنفہ کو راولپنڈی، اسلام آباد کی بڑھتی آبادی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ارد گرد سے بیگانہ ہو کر اپنے ہی گھروں میں مقید رہ جانے کا بھی قلق رہا۔ ان کے خیال میں یہ مکان اعلیٰ درجے کے قید خانے ہیں۔ ایک جگہ مبہم انداز میں ساس بہو کے تعلقات اور اس معاملے میں سماجی رویے پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ بہو کے بارے میں عام طور پر پاکستانی سماج میں یہی رائے پائی جاتی ہے: "بہو بے زبان ہی بھلی" تاہم انہوں نے خود کو اس کیٹیگری سے باہر رکھتے ہوئے اپنی بہو سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر کی رونق قرار دیا۔

اس آپ بیتی میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے سفر نامے بھی شامل ہیں۔ یہ آپ بیتی پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے سفر نامے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس آپ بیتی میں جمرود، ایبٹ آباد، مانسہرہ، ناران کاغان، سوات، کالام، گڑھی حبیب اللہ، بالاکوٹ، مدین اور بحرین کے سفر کی روداد پیش کی گئی ہے۔ پاکستان کے قبائلی

علاقے جمرود کی روایات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ وہاں تمام مرد ہمہ وقت مسلح رہتے۔ درج بالا اقتباس سے اس سماج کے درشت زدہ ماحول کا صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> وہاں دوردور تک کوئی عورت نظر نہیں آرہی تھی۔ بیٹھک سے ملحق جو مکان تھا وہ باہر سے پہاڑی کا حصہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ پتھروں سے بنی ہوئی چٹان سی دیوار جس کی اونچائی پر جگہ جگہ موکھے تھے۔ جو دشمن کو دیکھنے اور اس پر گولی چلانے کے لیے ان گھروں میں بنائے جاتے ہیں۔ گھر کے اندر جانے کا بظاہر کوئی دروازہ نہ تھا۔ (۲۵)

ادا جعفری کا کہنا ہے کہ یہ قبائلی لوگ بظاہر جتنے درشت نظر آتے تھے اتنے ہی نرم خو بھی تھے۔ خصوصاً اپنے مہمانوں کے سلسلے میں یہ لوگ بڑے مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ اس قبائلی سماج میں مہمانوں کی خاطر تواضع نہایت بہترین طریقے سے کی جاتی۔ یہ تواضع عام طور پر ایک بڑے طباق میں چاولوں پر بھنے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے پارچوں، قہوے اور طباق ہی کے فل سائز کی روٹیوں اور چپلی کباب سے کی جاتی۔ ادا جعفری نے اس سماج کو صدیوں پرانی روایات میں گندھا ہوا ایک نہایت خوش اطوار سماج قرار دیا ہے۔

ادا جعفری کے ہاں پاکستانی سماج کی روایات واقدار پر کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ ادا جعفری کی نظر زیادہ تر اس نوزائیدہ سماج کی زبوں حالی تک محدود رہی دوسری بات یہ کہ پاکستان جن حالات میں وجود میں آیا ان حالات میں روایات برقرار رکھنا ممکن ہی نہ رہا۔ جو روایات تھیں انہیں وقت کے بہاؤ اور گرد و خون نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ سہی تو کچھ وقت کے لیے اتنا ضرور دھندلا دیا کہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں۔ اس نوزائیدہ سماج کو کچھ وقت لگا اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے میں اور چند ایک پرانی روایات بھی زندہ وجاوید ہو کے دوبارہ سامنے آئیں ضرور لیکن زیادہ تر ان کی جگہ نئی روایات نے لی۔

۲۔ بین الاقوامی سماجی منظر نامہ

ورلڈ ٹور پہ جانے والی ادا جعفری بین الاقوامی سماجی منظر نامے سے بھی بخوبی واقف تھیں ادا جعفری کو خاوند کے ہمراہ لندن، امریکہ، جاپان، روم جیسے دیگر کئی ممالک بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ادا جعفری نے وہاں کے

لوگوں کے نظام زندگی کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا کہ ان لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے؟ ان کی روایات واقدار ہیں؟ اور ان کی سماجی خصوصیات کیا ہیں؟ اداجعفری نے اپنی آپ بیتی میں بھی ان تمام باتوں کو اجاگر کیا۔ اداجعفری کا تعلق جس سماج سے تھا وہاں آزادی اظہار نہ ہونے کے برابر تھی، مغربی سماج میں اس بات کا احساس انہیں شدت سے ہوا اور وہ مغربی سماج میں آزادی رائے کی معترف ہو گئیں لکھتی ہیں:

> مجھے علم تھا کہ مغربی معاشرے میں افراد کو قول و فعل کی آزادی حاصل ہے۔ کسی جملے سے مملکت پر آنچ نہیں آجاتی اور وہاں ہر شخص اپنے چال چلن کا ذمے دار بھی خود ہی ہوتا ہے، محتسب کا دستور ہی نہیں۔ (۲۶)

امریکہ کا سماجی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ امریکن سماج ہر آئے گئے سے مسکراہٹ کا تبادلہ کرنے والا اور اپنے کام سے کام رکھنے والا بڑا بے ضرر قسم کا سماج ہے۔ اس سماج سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر لوگ خوش اخلاق اور نرم مزاج ہیں جو چہرے پہ طمانیت اور خاص قسم کی بے نیازی کے چھاپ لیے ہوتے ہیں۔ اداجعفری کے مطابق اس سماج میں انسانی زندگی بہت قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ وسائل ہونے کے باوجود بیمار کا علاج نہ کرانے پر فوراً محکمہ صحت اور قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ اداجعفری نے امریکہ کی نیویارک، واشنگٹن، کیلی فورنیا ،میری لینڈ، میساچیوسٹس، کینس، ورجینیا، کولمبیا، نیوجرسی، پنسلوینیا، فلوریڈا، ورمانٹ اور ہوائی جیسی تمام ریاستوں کا سفر کیا۔ ان کے گہرے تجربے ومشاہدے سے یہاں کی روایات واقدار بھی چھپی نہ رہیں۔ فطرت کی حسن طرازیوں، انسانی ذہن کی فتح مندیوں کے ساتھ ساتھ انہیں وہاں کئی نہایت غیر معمولی مناظر بھی دیکھنے کو ملے۔

اداجعفری ان کی سائنس سے دلچسپی کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ ایک ایسا سماج ہے جہاں جگہ جگہ ایک ایسی نمائش گاہ ہو گی جہاں انسانی فتوحات اور سائنسی ایجادات کے ماڈل اور تدریجی مراحل کے نمونے رکھے ہوں گے۔ کہیں خلائی شٹل کا جدید ترین ماڈل رکھا ہو گا کہیں خلائی سفر کی متحرک تصویر۔ یہیں کہیں ان سائنسی کارناموں پر بنائی گئی فلمیں بھی دکھائی جارہی ہوں گی، جنہیں دیکھنے والے تھکتے ہیں نہ دکھانے والے۔ ان تمام عمارات میں ہر وقت میلے کا سماں رہتا ہے۔ ان عمارتوں میں داخلے کا کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ روایات واقدار کے لحاظ سے اداجعفری نے امریکن سماج دو حصوں میں بٹا ہوا پایا۔ ایک طرف ماڈرن اور جدید سوچ کے حامل وہ لوگ ہیں

جن کا اوڑھنا بچھونا ہی مشینوں اور جدید آلات میں ہے، یہاں تک کہ برتن دھونے کے لیے بھی مشین کا استعمال عمل میں لایا جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے ہاں سائنس اور جدید آلات کا استعمال مکروہ خیال کیا جاتا ہے۔ ادا جعفری اس دوسری نوعیت کے مخصوص سماج کو غیر معمولی قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ دلچسپ اور سادہ لوگ سائنسی ایجادات کے بالکل خلاف ہیں لہذا ان کے گھر موٹر ہوتی ہے نہ برقی بلب۔ یہ لوگ اگرچہ سڑک اور کھیتوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان سے مخاطب ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اجتماعیت کے حامل اس سماج میں کوئی فرد اپنا ذاتی حق یا انفرادی رائے نہیں رکھتا۔ اس سماج میں جدید دنیاوی علوم کے علاوہ دلکش و دیدہ زیب رنگ اور لباس بھی ممنوع ہیں۔ عورتوں کے لباس میں بجھے بجھے رنگوں کے ٹخنوں تک لمبے لمبے فراک استعمال کیے جاتے ہیں جس کے اوپر اسی رنگ کا ایپرن پہنا جاتا ہے۔ سر پر رومال یا گھر کی سلی ہوئی ٹوپی کا استعمال کیا جاتا ہے جبکہ مرد ڈھیلے ڈھالے پتلون اور کوٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ جس میں بٹن کا استعمال ممنوع ہے کیونکہ اس کا شمار بھی آرائش وزیبائش میں ہوتا ہے، اس کی جگہ ہک استعمال میں لایا جاتا ہے۔ لکھتی ہیں:

"آمش فرقے کے لوگ اپنی خاص وضع اور لباس کی وجہ سے فوراً پہچانے جاتے ہیں اور عام لوگوں کی جھانکتی کریدتی ہوئی نگاہوں کا مرکز بھی بن جاتے ہیں جو ان کے لیے یقیناً کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا۔" (۲۷) ادا جعفری کے خیال میں اگر ان کے لباس اس قدر مختلف نہ ہوتے تو چار اطراف لہلہاتے کھیتوں کے مابین، مرغبانی اور زراعت پر انحصار کرتے ان لوگوں پر پاکستانی باشندوں ہی کا گمان ہوتا۔ اسی قبیلے کی ایک اہم روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ان کی زندگی میں باورچی خانے کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ سلائی کا کام ہو یا بچے کی پیدائش کا کام ہمیشہ باورچی خانہ ہی کام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ گھر کے معمر اور بیمار افراد بھی باورچی خانے میں ہی آرام کرتے ہیں۔

ادا جعفری نے اس سماج کی عبادت شعاری، حقیقت پسندی، قناعت اور توکل کے نمونے بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ اس سماج میں ایک کمرہ ایسا ضرور ہوتا ہے جہاں آخرت کی دائمی زندگی کو یاد رکھنے کا اہتمام برتا جاتا ہے۔ یہ کمرہ ہر گھر میں لازماً ہوتا ہے جس میں ایک کھلا تابوت پڑا آخری سفر کی یاد دلاتا ہے۔ آمش قبیلے میں نسبت طے ہونے کے طریقے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس قبیلے میں لڑکا شادی کی

درخواست لڑکی کو خود پیش کرتا ہے چونکہ باورچی خانے کو خاص اہمیت حاصل ہے لہذا شادی کی درخواست کے لیے بھی باورچی خانے کا استعمال عمل میں لایا جاتا ہے۔ رات کو کسی وقت جب سب سونے کے لیے جا چکے ہوں، لڑکا باورچی خانے کی کھڑکی پر ٹارچ کی تیز روشنی ڈالتا ہے۔ لڑکی باورچی خانے میں لے جا کر اس کی خاطر تواضع کرتی ہے، یوں دونوں مل بیٹھ کر شادی کے موضوع پر بات چیت کرتے ہیں۔ اس طرح جواب مثبت ہونے کی صورت بات طے ہو جاتی ہے۔ تاہم بعد میں کوئی بزرگ یا مذہبی پیشوا باقاعدہ بات کرتا ہے اور پھر کسی مذہبی اجتماع میں اس نسبت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ ادا جعفری لکھتی ہیں کہ لڑکی چونکہ ایسے مذہبی اجتماع میں شامل نہیں ہوتی لہذا لڑکا ہی اسے جا کر یہ خوشخبری سناتا ہے۔ اور چونکہ اس سماج میں زیورات کا استعمال بھی ممنوع ہے لہذا لڑکی کو انگوٹھی بھی نہیں پہنائی جاتی۔ آمش قبیلے میں رائج شادی بیاہ کے مزید رسم ورواج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ شادی کی تقریب صرف نومبر اور دسمبر کے مہینے میں منگل اور جمعرات کو ہوتی ہے جس میں شادی شدہ مہمان گھر کے اگلے دروازے سے جبکہ غیر شادی شدہ مہمان گھر کے صرف پچھلے دروازے سے ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ کنوارے لوگ کھلی گھوڑا گاڑی استعال میں لاتے ہیں جبکہ شادی شدہ جوڑوں کے لیے یہ دستور ہے کہ آئندہ وہ کھلی گھوڑا گاڑی کے بجائے چھت والی بگھی استعمال کریں۔ ادا جعفری کو روم جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ روم کے عوام کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے رومیوں کے رسم ورواج، خوش اعتقادی، کھیلوں اور مذہب پسندی پر روشنی ڈالی ۔ روم کے بارے میں لکھتی ہیں روم ایک نہایت قدیم اور تاریخی شہر ہے جو دیکھنے میں بھی بالکل قدیم ہی نظر آتا ہے۔ اس میں ساری عمارات پرانے طرز تعمیر کی حامل ہیں جن کے درودیوار کی پرانی صورت برقرار رکھنے کی ازخود کوشش کی گئی ہے۔ ادا جعفری نے روم کو خوبصورت مجسموں اور فواروں کا شہر قرار دیا ہے۔ رومیوں کی خوش اعتقادی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ رومی نہایت خوش اعتقاد واقع ہوئے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اسی چیز سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک حوض کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ جو بھی اس میں ایک سکہ ڈالتا ہے زندگی میں کبھی نہ کبھی دوبارہ روم ضرور آتا ہے۔ روم کے سماجی رویے بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ زبان سے ناواقفیت کے باوجود یہ لوگ دوسروں سے نہایت اپنائیت کا اظہار کرتے ہیں۔ راستے میں دوسروں کو جہاں دیکھتے ہیں ٹھہر کر سلام کرتے ہیں ایک جگہ روم کے سماجی تناظرات پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ہر ملک میں کچھ مناظر وہاں کے لوگوں کے حسنِ ذوق کی علامت ہوتے ہیں اور کچھ مقامات تاریخ کے اوراق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ روم میں دو ہزار سال پرانا وہ کلوزیم ان کی تاریخ ہی کا حصہ ہے، جہاں حکمران اپنی تفریح کے لیے نہتے قیدیوں اور بھوکے شیروں کی لڑائی کا اہتمام کرتے تھے اور اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔[۲۸]

ادا جعفری کو جاپان جانے کا موقع ملا تو انہوں نے جاپان کے سماجی منظر نامے کو بھی آپ بیتی کا حصہ بنایا۔ جاپانیوں کی تہذیب و ثقافت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جاپانیوں کے ہاں چائے بنانے کی رسم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جاپانی ہر آنے والے غیر ملکی سیاح کو یہ رسم مکمل اداکاری اور تفصیل سے ضرور دکھاتے ہیں۔ اس رسم کو جاپانی سماج میں مذہبی فریضے جیسا تقدس حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اس آپ بیتی میں فصل کی کٹائی کے وقت ادا کی جانے والی تیوہار کی لوک رسم، شادی بیاہ کی رسمیں اور گیشا رقص کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس سماج کی اعتقاد پرستی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جاپانیوں نے ایسی مشینیں بھی متعارف کروائیں جو قسمت کا حال بیان کرتی ہیں۔ جاپان والوں کا ماننا ہے کہ اس مشین میں سکہ ڈالنے پر اس سے جو کارڈ برآمد ہوتا ہے اس پر قسمت کا حال بالکل ٹھیک ٹھیک لکھا ہوتا ہے۔ ایک جگہ جاپانی روایات و اقدار بیان کرتے ہوئے گیشا ہاؤس کے بارے میں لکھتی ہیں "گیشا" کے معنی فنکار کے ہیں طوائف خانوں کی طرح گیشا ہاؤس میں رقص و سرور اور جاپانی شراب کا دور چلتا ہے لیکن یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جاپان میں گیشا ہاؤس اور رقص کو تقدیس کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں ایک

بات قابلِ ذکر ہے کہ گیشا ہاؤس میں تصویر لینا یا جوتے پہننا منع ہے تاہم جاپان کے مقدس مذہبی مقامات پر ایسا کوئی تکلف نہیں برتا جاتا۔ کلس اور مندروں میں لوگ جوتوں کے ساتھ کھلے عام تصویریں بناتے پھرتے ہیں۔ گیشا ہاؤس کے اس تقدیس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ۴۰۰ سالہ پرانی تہذیب سے جڑی یہ گیشا خواتین دورِ جدید میں قدیم جاپانی تہذیب کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ خواتین اپنے رقص، گیتوں، اور باتوں سے مردوں کو صرف تفریح فراہم کرتی ہیں، جسم نہیں بیچتیں۔ گیشا ہاؤس میں آنے والی ان خواتین کو کئی سال تک گانے، رقص اور آلات موسیقی کی تربیت دی جاتی ہے اور انہیں میزبانی کے اطوار اور گاہکوں سے پر اثر اور بامعنی انداز میں گفتگو کرنے کے باقاعدہ طریقے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ لکھتی ہیں: "ان خواتین کا شمار اربابِ نشاط میں ہوتا ہے۔ گیشا ہاؤس کے

احترام کا یہ عالم تھا کہ یہاں ہر شخص دروازے پر جوتا اتار کر کمرے میں داخل ہو سکتا تھا۔"[۲۹] جاپان میں روٹی کے استعمال کی کوئی روایت نہیں۔ روٹی کی جگہ عام طور پر چاول ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان کے کیلنڈروں اور میڈیا پر بھی صرف چاول ہی کی فصل دکھائی دیتی ہے۔ ادا جعفری جاپانی کھانے کی تین سو سالہ روایت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس روایت کے تحت زمین پر بیٹھ کر جاپانی طریقے سے کھانا کھایا جاتا ہے۔ یہ خالص جاپانی کھانا ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ مختلف سبزیوں اور جھینگے پر مشتمل ہوتا ہے۔ جسے چینی کے رنگین پیالوں اور خوش رنگ چاپ اسٹک کے ہمراہ کھایا جاتا ہے تاہم کسی غیر ملکی کے لیے یہ تجربہ کچھ زیادہ خوش کن ثابت نہیں ہوتا۔ افریقہ کی روایات و اقدار بیان کرتے ہوئے ایک جگہ سماج میں ولادت کے موقع پر نومولود کے خالق سے تعارف کی روایت بیان کی ہے۔ لکھتی ہیں کہ اٹھارویں صدی میں افریقہ کے قبائل میں نوزائیدہ کا خالق سے تعارف کرائے جانے کا یہ طریقہ بڑا دلکش تھا۔ تعارف کی یہ رسم ہمیشہ پہلے چاند کی رات ادا کی جاتی جس کے تحت بچے کا سیاہ فام باپ اسے دونوں ہاتھوں پہ اٹھا کر تاروں بھرے کھلے آسمان تلے کھڑا ہوتا۔ تین بار بچے کے کان میں اس کا نام لیا جاتا پھر بچے کو دونوں ہاتھوں پر سر سے بلند کرتے ہوئے کہا جاتا دیکھو تم سے بڑی ایک ہی طاقت ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ آپ بیتی بین الاقوامی سماج کا رنگارنگ سماجی منظر پیش کرتی ہے۔ ادا جعفری نے ورلڈ ٹور کے دوران جن ممالک کی تہذیب و ثقافت کو دلچسپ یا مشرق سے ہم آہنگ پایا ان کا ذکر ضرور کیا۔ یوں عالمی منظر نامے نے اس آپ بیتی کی اہمیت دوچند کرتے ہوئے قاری کے لیے لطف و دلچسپی کا مزید سامان فراہم کیا۔

ii۔ نجی و عائلی تناظرات

یہ آپ بیتی بھولی بسری یادوں خاندانی طور طریقوں، رسم و رواج اور عادات و اطوار پر مشتمل ہے جس میں ادا جعفری ایک باہمت اور اپنے پیروں پہ آپ کھڑی ہونے والی خاتون کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ بے جا نمائش کے خبط، کسی طرح کی لاف زنی، دروغ گوئی یا اخفا کا شائبہ تک نہیں۔ اس آپ بیتی میں ادا جعفری نے اپنے گھریلو اور خاندانی حالات بیان کیے اور اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اپنی شادی اور ازدواجی زندگی کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی۔ ایک لحاظ سے یہ آپ بیتی ان کے ادبی سفر کی داستان بھی ہے۔

وہ جو بے چین اور بے خبر ہجوم میں تنہا لڑکی تھی یہ اس کی اور میری کہانی ہے۔۔۔ مڑ کر دیکھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ بدلتے موسموں کی دلداری اور دل آزاری دونوں پر یقین کرنے کے لیے کبھی کبھی بھولی بسری یادوں کو چھو لینا بھی اچھا ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک حیلہ یہ بھی تو ہے کہ لوگ میری ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھتے ہی رہتے ہیں۔[۳۰]

اس آپ بیتی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تنہائی اور اداسی ان کے مزاج کا حصہ تھی جو آخر دم تک ان کے ساتھ رہی۔ اپنی اسی تنہائی پسندی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ہجوم میں کبھی ان کا دل نہیں لگا وہ ہمیشہ ہجوم سے گھبراتی رہیں۔ جہاں کہیں زیادہ ہجوم ہوتا وہ گوشہ تنہائی منتخب کر لیتیں، لیکن چین وہاں بھی نہ آتا اور دل گھبراتا رہتا۔ ادا جعفری نے اپنے بچپن کے حالت قدرے تفصیل اور وضاحت سے لکھے ہیں۔ اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ ادا جعفری بچپن ہی سے نہایت علم دوست واقع ہوئی تھیں۔ "مجھے یاد ہے وہ بڑی باقاعدگی سے روزنامچہ لکھتی تھی اس کا تو رہن سہن ہی کتابوں میں تھا۔"[۳۱] اس آپ بیتی میں ان کے بچپن میں یتیم ہو جانے کا دکھ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے اور تعلیم میں رکاوٹوں پر بھی ان کے جذبات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اپنے بچپن کی دلچسپیوں اور کھیل کود کا ذکر کرتے ہوئے ادا جعفری نے ان حسرتوں کا بھی ذکر کیا جو تمام عمر حسرتیں ہی رہیں۔ لیکن ادا جعفری کی ان تمام حسرتوں کا تعلق خارجی دنیا ہی سے ہے۔ دل کی داخلی دنیا اور جوانی کے خاص جذبات کے معاملے میں ادا جعفری نے کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ بچپن میں ان کی دلی حسرت ہی رہی کہ وہ بھی لڑکوں کی طرح سڑک پر پیدل چل سکیں لیکن اس دور میں یہ ممکن نہ تھا۔

اسی طرح انہوں نے اپنی شادی اور پہلی بار ماں بننے کے عمل سے دوچار ہونے پر بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ شادی کے بعد ادا جعفری ایک مثالی بیوی اور ایک مثالی ماں اور ایک مثالی ساس کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ نجی و عائلی کوائف فراہم کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ شادی کے بعد ابتداً انہیں خانہ داری میں کتنی مشکلات کا سامنا رہا ۔ آٹا گوندھنے کے اوائل بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ایک دن میں نے روٹی پکانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ آٹا گوندھا تو اس میں گلٹیاں پڑ گئیں مایوس ہو کر ایک طرف رکھ دیا دوسرے دن دیکھا تو وہ اچھی طرح گندھے ہوئے آٹے کی شکل

اختیار کر چکا تھا۔ آئندہ اسی ترکیب پر عمل کرتی رہی۔ (۳۲)

اسی طرح گھر داری کے طریقوں سے ناواقفیت کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں کہ پہلے پہل روٹی بنانے میں بھی انہیں کیسے پاپڑ بیلنے پڑے ایک جگہ لکھتی ہیں:

> شروع میں یوں بھی ہوا کہ میں نے روٹی پکائی اور پاپڑ کی قسم کی کوئی چیز تیار ہو گئی جسے شوربے میں ڈال کر چمچے کی مدد سے کھایا جاسکتا تھا۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ ایک دن بڑا خوبصورت پھلکا تیار ہوا۔ خوش ہو کر اسے پکڑا تو انگوٹھا دونوں پرتوں کے درمیان چلا گیا۔ کئی دن چھالے کا علاج ہوتا رہا۔ (۳۳)

ادا جعفری کی آپ بیتی میں اگرچہ ان کی زندگی کے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں تاہم یہ قاری کی تسکین کے لیے ناکافی ہیں۔ آپ بیتی کے تقاضوں کو ایک طرف رکھ کے انہوں نے داخلی جذبات کے سلسلے میں قدرے اختصار سے کام لیا۔ خالص داخلی جذبات کی ان کے ہاں کمی ہے۔ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپ بیتی ایک روایتی، گھریلو اور مشرقی خاتون کی آپ بیتی ہے جس میں اسی کے موافق نجی و عائلی حالات و واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

iii۔ مذہبی و معاشی تناظرات

آپ بیتی میں مذہبی عقائد و نظریات سے مصنفہ کی مذہب پسند طبیعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ادا جعفری کے خیال میں مذہب کو سیاست سے پاک ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک اسلام پسند ہونے اور صاحبِ عمل ہونے میں بہت فرق ہے۔ ان کے نزدیک سچا دین وہی ہے جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا خیال رکھا جائے۔ ادا جعفری کا تعلق ایک رسم و رواج کے پابند اور قدیم روایتی گھرانے سے تھا جہاں تمام مذہبی تہوار و متبرک ایام نہایت جوش و خروش اور عقیدت و احترام سے منائے جاتے۔ بدایوں میں ماہِ رمضان کی آمد سے متعلق لکھتی ہیں:

> شعبان کے دوسرے، تیسرے ہفتے سے ہی رمضان کے خیر مقدم کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ سویاں اور کچھ دوسرے پکوان بڑے اہتمام سے تیار کروائے جاتے۔ ساتھ ہی روزہ

> کے فضائل کا تذکرہ رہتا، بزرگوں کی نمازیں طویل ہو جاتیں۔ رمضان عموماً گھر کے چھوٹے بڑے سب روزہ رکھتے۔ محلے کی مسجد میں روزانہ افطاری جاتی پورا مہینہ احترام اور رکھ رکھاو سے گزرتا۔ (۳۴)

مذہب سے عقیدت کے اس اظہار کے واضح اثرات ان کی آپ بیتی پر بھی مرتب ہوئے اور وہ بدایوں کے مزارات و مساجد، محرم، رمضان، شعبان اور دیگر مذہبی تہواروں کو بے ساختہ اپنی آپ بیتی کا حصہ بناتی چلی گئیں۔ رمضان کی طرح محرم کا مہینہ بھی اس سماج میں خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ اپنے دور کے مذہبی تناظرات پیش کرتے ہوئے ادا جعفری لکھتی ہیں کہ ماہ محرم کا احترام ہر خاص و عام کے لیے لازم تھا۔ اس مہینے خوشی کی کوئی تقریب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس مہینے نہ کوئی نیا کپڑا خریدا جاتا نہ پہنا جاتا۔ محرم کے عشرہ تک بزرگوں کی طرف سے شوخ رنگ لباس کے استعمال پر پابندی رہتی۔ جب تک محلے کے تعزیے نہ اٹھ جاتے کسی گھر میں چولہا نہ جلتا۔ ادا جعفری لکھتی ہیں کہ یہ تعزیہ داری بڑے اہتمام سے ہوتی جس میں دونوں عقیدے کے لوگ شامل ہوتے۔ ایسے موقع پر تعزیہ داری کرتے ہوئے جلوس نکالے جاتے جن کے گزرنے والے رستوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ شربت کی سبیلیں ہوتیں۔ محرم کی سات تاریخ کو سنی عقیدہ والوں کی طرف سے پلاؤ اور زردے کی دیگیں تقسیم کی جاتیں۔ یہ لنگر عموماً بیل گاڑیوں پر لاد کر گلی محلوں میں تقسیم کیا جاتا۔ اسی طرح مزید لکھتی ہیں کہ صاحب حیثیت افراد کی طرف سے نذر نیاز کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ بزرگ بچوں کو واقعہ کربلا کی اہمیت اور تفصیل بتاتے۔ شیعہ عقیدہ رکھنے والے لوگوں کے گھروں سے رات کو بھی نوحے اور ماتم کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں عقیدے کے اختلاف پر فساد ہونا ایک روایت بن چکی ہے۔ ادا جعفری لکھتی ہیں: ”مجھے یہ تو یاد ہے کہ کسی محرم میں لکھنؤ سے افسوسناک خبریں آتیں۔ لیکن جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، بدایوں میں مسلمانوں کے درمیان عقیدے کے نام پر کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔“(۳۵) ہم عصر مذہبی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس وقت لوگ مذہب کے بہت قریب تھے۔ مذہب سے یہ لگاؤ صرف اعتقاد کی حد تک نہ تھا بلکہ مذہب اگر تھا تو لوگوں کے دلوں اور عمل میں بھی شامل تھا۔ لب پر اگر ذکر تھا تو دل میں بھی خوفِ خدا تھا۔ اس دور کی مذہبی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ بچے کی پیدائش پر بھی بچے کی ماں دو

رکعت شکرانے کی نماز پڑھتی اور صندوقچی میں چراغی کی رقم ڈالتی۔ اس خاندان میں خاص خاص دعائیں مانگنے کے لیے عشاء کی نماز کے بعد چالیس مسجدوں میں نفلیں پڑھی جاتیں۔ منت عموماً مسجد میں چراغ جلانے کی مانی جاتی۔ ہر گھر سے موذن کے لیے کھانے کے علاوہ چراغ کے تیل کی رقم بھی پابندی سے جاتی تھی۔ لبوں پر اللہ رسول ﷺ کا ذکر تھا اور دلوں میں خوفِ خدا بھی۔ اس آپ بیتی میں جس خوبصورت انداز میں ہم عصر مذہبی صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس سے ادا جعفری کے مذہبی شعور کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ب۔ کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں عصری شعور کے سماجی تناظرات

کشور ناہید کی آپ بیتی ان کے گہرے اور عمیق تجربے کا نچوڑ ہے۔ یہ آپ بیتی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں زندگی کی حقیقی تصویر اپنے سماج کے جیتے جاگتے پیکر کے ہمراہ جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس آئینے میں ان کے عہد کا نظر آنے والا عکس بہت صاف اور بہت واضح ہے۔ کشور ناہید اپنے دور کے سماجی مسائل، رویوں اور عصری مسائل سے بے خبر نہ تھیں۔ انہوں نے جس طرح اپنی آپ بیتی میں اپنے دور کی سماجی عکاسی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کشور ناہید کی نظر ایک نقاد کی نظر ہے جس سے سماج کی چال اور اس کا ٹیڑھا پن چھپا نہ رہا۔ انہوں نے ہر اس سماجی عمل پر قدغن لگائی جسے انہوں نے باقی ماندہ سماج کے لیے باعث آزار پایا۔ "بری عورت کی کتھا" دراصل ایک مکمل دستاویزی فلم ہے جس میں سماجی جھلکیوں کی صورت ایک پورا دور اپنی تمام تر روشنیاں منعکس کرتا سامنے آن موجود ہوتا ہے۔ یہ چلتی پھرتی رنگین سماجی تصویریں نہ صرف قارئین کی دلچسپی کا ساماں ہیں بلکہ یہ قارئین کے لیے ایک مخصوص سماج سے واقفیت کا ایک نہایت موثر ذریعہ بھی ہیں۔

i۔ سماجی روایت واقدار کا تناظر

اس آپ بیتی میں ہم عصر روایات واقدار کے حسین مرقعے جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ کشور ناہید ہم عصر سماجی رویوں اور مسائل سے اچھی طرح آگاہ تھیں۔ کشور ناہید کی آپ بیتی میں سماجی روایات واقدار کو نہایت صراحت سے بیان کیا گیا۔ ان کی آپ بیتی میں بھجن گانے کی روایت، ستی کی روایت، باغوں کے بیاہ کی روایت اور پردے کی روایت جیسی کئی روایتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ آپ بیتی قدیم وجدید روایات کا ایسا حسین امتزاج ہے

جس سے سماجی تغیر کے عمل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

برصغیر کے معاشرے نے ۱۹۴۰ء سے لے کر اب تک جس طرح اپنے آپ کو بدلا ہے، ان تبدیلیوں نے کس طرح ہماری گلیوں، محلوں اور گھروں سے لے کر ذہن میں کہاں جالے بنے ہیں اور کہاں کھڑکیاں کھولی ہیں یہ سب احوال اپنا بیان چاہتا ہے۔ (۳۶)

کشور ناہید کی آپ بیتی میں تین طرح کا سماج پیش کیا گیا ہے جن میں تقسیمِ ہند سے پہلے کا سماجی منظر نامہ، قیامِ پاکستان کے بعد کا سماجی منظر نامہ اور بین الاقوامی سماجی منظر نامہ شامل ہیں۔

ا۔ تقسیم ہند سے پہلے کا سماجی منظر نامہ

کشور ناہید کی آپ بیتی میں ہندوستان کی تہذیب، وہاں کے رہن سہن اور مجلسی زندگی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ کشور ناہید نے کئی زمانوں کا مذاق دیکھا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتی ہیں کہ یہ زمانے اور ان کا سماج کس بنا پر ایک دوسرے سے جداگانہ اور مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب سے تعلق کی بنا پہ کشور ناہید کی آپ بیتی ہندو معاشرے کی سماجی روایت واقدار کی بھی گہری چھاپ لیے ہوئے ہے۔ ہندو کلچر میں عورت کا روپ، مرد کی محبوب کے روپ میں پرستش کرنا، بھجن گانا، ستی ہو جانا، یورپ کی تہذیب، عادات واطوار اور رہن سہن کو موضوع بنایا۔ ان کی آپ بیتی میں پورے معاشرے کا کرب سمٹ آیا ہے یہ صرف ان کی زندگی کی داستان نہیں ایک عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس آپ بیتی میں تقسیم ہند سے قبل کا ہندو مسلم مشترکہ سماج سامنے آتا ہے۔ اس سماج میں جابجا شمشان گھاٹ تھے جہاں ہندو اپنے مردے جلاتے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں کہ یہ شمشان گھاٹ ہر وقت سیاہ کالے اور کڑوے دھوئیں کی لپیٹ میں رہتے۔ ہندو مسلم سماج میں مسلمانوں نے اپنے بچوں کو اس گھاٹ کی طرف جانے سے سختی سے روک رکھا تھا۔ جن میں جاگیر دارانہ نظام کا حامل ایک ایسا سماج پیش کیا گیا ہے جہاں کہار، کہارنیں اور نائنیں تھیں، سقے، ماشکی تھے جنہیں بہشتی بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا سماج تھا جہاں مردانہ برتری کا احساس حاوی تھا۔ اپنے ابتدائی دور کو دیگر ادوار سے منفرد و ممتاز کرنے والے مشہور زمانہ نظام، نظامِ سقہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

گھروں میں پانی بھرنے کے لیے سقے ،مشکوں میں پانی لایا کرتے تھے،باہر دروازہ بجا کر اعلان کرتے پردہ کرلو سقہ آیا جی۔ساری عورتیں اندر پردے میں چلی جاتیں۔سقہ سارے گھڑوں میں پانی بھر کر چلا جاتا۔ (۳۷)

پردے کی روایت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ ایک ایسا سماج تھا جہاں صدیوں سے گہرے پردے کی روایت چلی آرہی تھی۔اس سلسلے میں ہندو مسلم کی بھی کوئی تخصیص نہ تھی۔عام طور پر سات سال کی عمر میں بچیوں کو پردہ کرانے کا رواج عام تھا۔ کبھی کوئی عورت ڈیوڑھی یا چلمن سے جھانکتی دکھائی دی،نہ ہی کبھی کوئی بے پردہ نظر آئی۔اس سماج میں اول تو کبھی کسی خاتون کے اکیلے سفر کی نوبت ہی نہ آتی،بحالتِ مجبوری چاروں اطراف پردوں سے مزین ڈولی کا استعمال عمل میں لایا جاتا۔ اس ڈولی میں پتھر رکھنے کی روایت بھی کافی عرصہ تک برقرار رہی۔پتھر رکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ڈولی چونکہ کہار اٹھاتے تھے لہذا یہ پتھر عورت کا اصل وزن چھپانے کے لیے رکھا جاتا۔مزید لکھتی ہیں کہ آہستہ آہستہ ڈولی کا استعمال ختم ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ تانگے کا سفر رائج ہوا لیکن پردے کا اہتمام یہاں بھی برتا گیا۔مزید لکھتی ہیں کہ آہستہ آہستہ ڈولی کا استعمال ختم ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ تانگے کا سفر رائج ہوا لیکن پردے کا اہتمام یہاں بھی برتا گیا۔

پردے کے سلسلے میں ہندو مسلم گھرانوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ہندو گھرانوں کی تمام عورتیں بھاری چادریں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ کبھی کسی خاتون کی شکل دروازے یا کھڑکی سے نظر نہیں آتی تھی۔جب ڈولیوں کا رواج کم ہوا تو تانگے پہ سفید چادر باندھی جاتی تھی۔ مسلمان ہندو عورتیں اسی طرح سفر کرتی تھیں۔گھر سے گلی تک آنے کے لیے بھی دونوں طرف سے سفید چادریں پکڑے لڑکے کھڑے ہوتے اور یوں بیبیاں ٹانگے میں سوار ہوتیں۔ (۳۸)

ایک جگہ لکھتی ہیں کہ شدید بیماری کی حالت میں بھی پردے کی روایت برقرار رکھی جاتی۔ حکیم کو نبض دکھانا مقصود ہوتی تو عورت ہاتھ آٹے میں لپیٹ کر دکھاتی۔کشور ناہید لکھتی ہیں کہ اگرچہ اس سماج میں ہر طرف

خوشحالی کا دور دورہ تھا لیکن تب بھی سماج میں ہر طرف کفایت شعاری کا فلسفہ اختیار دیکھنے کو ملتا۔ کفایت شعاری کو اس سماج کی ایک خاصیت قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> کوئی کپڑا چند دھلائیوں کے بعد ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔ مردانہ پاجاموں کو پیوند لگنا ایک عام بات تھی۔ پرانی چادروں کے تھیلے، تکیہ غلاف اور دستر خوان بننا بھی سگھڑاپے کی نشانیاں تھیں۔ عروسی کے دوپٹے، دولائیوں کے ابروں کی شکل میں اور غرارے گوٹ کی شکل میں استعمال کیے جاتے تھے۔۔۔ماچس کی تیلی کا استعمال تو خال خال تھا۔ صبح سویرے ہم چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں کرچھا پکڑا دیتے تھے کسی گھر سے آگ کا انگارہ لانے کے لیے۔ بس اس طرح آگ جلائی جاتی تھی۔ (۳۹)

جاگیر دارانہ نظام میں، جہاں زمینوں کے مالک کئی کئی باغوں کے بھی مالک تھے، ایک روایت باغوں کے بیاہ کی بھی چلی آرہی تھی اس بارے میں لکھتی ہیں کہ: "باغوں کے بیاہ ہونے کی رسم بھی یاد ہے۔ باغ پہ پہلا پھل آنے سے پہلے باغ کا بیاہ کیا جاتا اور سارے کا سارا پہلا پھل غریبوں میں بانٹ دیا جاتا۔"(۴۰) یہ ایک ایسا سماج تھا جہاں پسند کی شادی کو نہایت برا خیال کیا جاتا تھا۔ کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں پسند کی شادی کے اسی سماجی مسئلے کو اٹھایا۔ اس کے علاوہ کم عمری کی اور بے جوڑ شادی کے خلاف بھی ان کے ہاں مزاحمتی انداز ملتا ہے۔ کشور ناہید کی آپ بیتی میں عہد کے حالات و واقعات، جبر اور پابندیوں کا برملا اظہار ملتا ہے۔ کشور ناہید نے آپ بیتی کی شکل میں ادب سے سماج کی نقاب کشائی اور حقیقی ترجمانی کا کام لیتے ہوئے اس دور کی تہذیبی و معاشرتی حالت کا پتہ دیا ہے۔ کشور ناہید نے ہندوستانی سماج میں پھیلے توہم پرست اور سماجی نظریات وعقائد کی بھی بیخ کنی کی۔ خاتون ہونے کے ناطے کشور ناہید اپنے دور کی خواتین کے مسائل سے زیادہ اچھی طرح آگاہ تھیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عورت کی زندگی سے جڑے مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے انہیں معاشی، معاشرتی، سماجی، ازدواجی ہر سطح پر پیش آنے والے مسائل اجاگر کیے۔

خواتین کی خانگی وازدواجی زندگی کے مسائل سے لے کر روزمرہ زندگی کے اجتماعی مسائل تک تمام نوعیت کے مسائل سماجی مسائل کے زمرے میں آتے ہیں۔ کشور ناہید کے ہاں ان تمام مسائل کا اظہار ملتا ہے۔

مرد و عورت میں نابرابری کے رجحان، کم عمری کی یا بے جوڑ شادی، بیوہ کی دوسری شادی کی ممانعت، جہیز کا مسئلہ، ستی کی رسم، ازدواجی زندگی کے مسائل، چہار دیواری کے باہر پیش آنے والے مسائل، تعلیمِ نسواں، اخلاقی پستی، سماجی بگاڑ کی کہانی بیان کرتے ہوئے جسم فروشی اور عورت کے زبردستی جنسی استحصال جیسے مسائل کی شمولیت نے اس آپ بیتی کی اہمیت دوچند کر دی ہے۔ عورت کا سماجی مقام بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ عورت کو پیدا ہوتے

ہی یہ سبق حفظ کرایا جاتا ہے کہ اس کا کام صرف گھر داری، بچے پیدا کرنا اور گھر کو جنت بنانا ہے۔ انکے ہاں مردانہ سماج میں عورت کو صرف جنسی و جسمانی تسکین کا ذریعہ سمجھنے پہ شدید غم و غصے کا اظہار ملتا ہے۔ اس آپ بیتی میں ایک عام سماجی رویئے اور اس سے جنم لینے والے نفسیاتی مسائل کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ کشور ناہید کے مطابق ہمارے ہاں شروع ہی سے بیٹیوں کی مائیں ان کے مستقبل کے حوالے سے حد درجہ خوف زدہ اور نفسیاتی دباؤ کا شکار پائی گئی ہیں۔ جس کے نتیجے میں نجانے کتنی بیٹیاں تذلیل کا شکار ہو کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور کہیں کہیں تو نوبت خودکشی تک جا پہنچتی ہے۔ ان کی ہر ممکن یہی کوشش رہی ہے کہ کسی طور دنیا جہاں کی خوبیاں بیٹی میں انڈیل دیں انہیں اپنی بیٹی کا کوئی گن نظر نہیں آتا بھلے بیٹی کی تعریف نہ کریں لیکن اسے احساس کمتری کا شکار کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ یہ کہانی تقریباً ہر گھر میں دوہرائی جاتی ہے ماں بیٹی کو یہ کہتے نہیں تھکتی کہ تم سے کون کرے گا شادی؟ جس گھر جاؤ گی اسے بھی اجاڑ دو گی۔ کشور ناہید کے ہاں روایتی سماج میں جنم لینے والی لڑکی کے جذبات و تاثرات کی نہایت خوبصورت انداز میں عکاسی ملتی ہے۔

مصنفہ نے اپنے دور کے سماجی و معاشرتی حالات و واقعات کی عکاسی کرتے ہوئے سماجی سطح پر عورت کو درپیش مسائل کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ کشور ناہید کو اس سماج سے یہ شکایت ہے کہ یہ سماج مردانہ سماج ہے جو صرف مردوں کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مرد حضرات کا عورت کے تئیں سماجی و نفسیاتی رویہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سماج کا حصہ ہونے کے باوجود عورت کو مرد کی وساطت سے اس سماج میں کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی از حد مجبوری کے تحت حصولِ معاش کے لیے گھر سے نکلنے والی عورت کو بھی سماجی سطح پر معاشرے کے عیاش افراد کے ہاتھوں قیمتی متاع لٹانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ تاہم انہیں صرف مردوں سے ہی نہیں بلکہ عورت سے بھی شکایت ہے۔ کشور کے ہاں صرف عورت کے سماجی مسائل اور اس کی مظلومیت ہی کا

احساس نہیں ملتا بلکہ وہ سکے کے دونوں رخ پیش کرتی ہیں۔ ان کے ہاں سماج سے تعلق رکھنے والے طوائف اور ساس جیسے کردار بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں کشور ناہید مکمل غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے عورت کی کجی کوتاہیوں کا احتساب بھی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کشور ناہید کی آپ بیتی میں عورت کو کمزور بننے کے بجائے اپنا سہارا آپ بننے کی ترغیب ملتی ہے۔ کشور ناہید نے اس دور کی پتی ورتا قسم کی عورتوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور زیورات میں لدی پھندی عورتوں کو جاہل و بے وقوف قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق توہمات اور ٹوٹکوں پر از حد یقین رکھنے والی یہ عورتیں اپنے شوہر کو مطیع و فرماں بردار بنانے کے لیے بہت ٹوٹکے آزمایا کرتی تھیں۔ عورتوں کے سماجی رویے بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ عورتیں اپنے شوہر کے گھر پہنچنے کے وقت سر پہ پٹی باندھ کے ہائے ہائے کی گردان کرنے لگتیں۔ ناراض شوہر کو منانے کے لیے کالے مرغ کا صدقہ اور اسے رام کرنے کے لیے دم کی ہوئی چینی جیسے ٹوٹکے اس سماج میں ہر گھر کا لازمی حصہ تھے۔ جنسی مسائل بھی سماجی مسائل کا ایک حصہ ہیں ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں کیونکہ یہ بہت سے معاملات و مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ کشور ناہید کو سماجی سطح پر پائی جانے والی جنسی و جزباتی ناآسودگی کا اچھی طرح احساس تھا اور وہ اس کے محرکات سے بھی بخوبی آگاہ تھیں۔ لکھتی ہیں کہ نجانے کتنی ہی عورتیں سماجی جبر اور جزباتی ناآسودگی کے ہاتھوں خودکشی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی عورت کسی بنا پر بچے کی ماں بننے سے قاصر ہو تو سماج اس کا جینا دوبھر کر دیتا ہے۔ سماج ایک ناسور کی طرح آن کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے میں عورت کے پاس یہی راستہ بچتا ہے کہ شوہر سے اپنا رشتہ بچانے اور اپنے وجود کی تکمیل کے لیے اپنا دامن داغدار کرلے۔ دراصل یہ آپ بیتی کیا ہے مختلف سماجی رشتوں کا ایک جال ہے، جس میں طرح طرح کے سماجی رویے بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ قیامِ پاکستان کے بعد کا سماجی منظر نامہ

کشور ناہید نے پاکستان کے سماجی مسائل کا بڑی گہرا تجزیہ پیش کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ آزادی کے فوراً بعد اس سماج میں یکے بعد دیگرے کئی مسائل نے سر اٹھایا اور جنم لینے والے ان نئے مسائل نے مزید کئی سماجی مسائل کو جنم دیا۔ رہائش کے مسئلے سے رشوت اور سفارش اس سماج میں نہایت تیزی سے پھیلی۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

پاکستان آنے کے بعد بے سروسامانی کے دنوں میں، عجب آزادی واسیری تھی۔ بہت سے کنبے ایک گھر میں، نئے گھروں میں الگ الگ منتقل ہونے سے پہلے، باڑے کے جانوروں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ کسی بھی عم زاد ہم عمر سے ہم کلام ہونے پر پابندی تھی۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر انارکلی بازار کی دکانوں میں شوکیس میں بنے بت کے پہنے کپڑوں کو دیکھنے کو منع کیا گیا تھا۔ (۴۱)

کشور ناہید جو حقوقِ نسواں کی علمبردار ہیں حقوقِ نسواں کی تحریک پر سماجی رد عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ لوگ اس تحریک کے بارے میں نہایت منفی نقطہ نظر رکھتے تھے اور اپنی بہو بیٹیوں کو اس تحریک سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ ان کی آپ بیتی میں سماجی و تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سماجی و تہذیبی سطح پر بھی انقلاب برپا ہوا۔ کشور ناہید نے جب زندگی کے ورق پلٹے تو انہیں بات کا بھی احساس ہوا کہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ کیا تھا اور اب زمانہ کتنا بدل چکا ہے۔ روایت و اقدار کے حوالے سے در آنے والے اسی سماجی تغیر کے بارے میں لکھتی ہیں:

اشک آباد، ایک شام میں اور میرا ایک مصری دوست باتیں کر رہے تھے اپنے اپنے صحنوں اور ملکوں میں ہونے والی تبدیلیوں کی۔ وہ ہنس کر بولا، جو باتیں تم کر رہی ہو میں بھی اسی طرح باتیں کرتا تھا۔ میری ماں بھی برقعہ اوڑھتی تھی مگر اب میری بیٹی مکنی پہنتی ہے ۔۔۔ میں آج یہاں اٹلی میں بیٹھی اپنی کتھا لکھ رہی ہوں۔ اسپین میں میری ایک بیٹی شارٹس اور امریکہ میں دوسری بہو اسکرٹ پہنتی ہے۔ میری بھانجیاں امریکہ میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں اور میری ماں ڈولی میں بیٹھ کر سفر کرتی تھی۔ (۴۲)

تاہم اس سلسلے میں انہوں نے خود کو بھی شاملِ حال رکھا۔ ایک جگہ زنا اور جنسی زیادتی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ پاکستان میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب محض وراثت سے بچنے کے لیے باپ کی طرف سے بیٹی کو زنا کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ کشور ناہید نے ایسے واقعات پر نہایت حیرت اور غم و غصے کا اظہار کیا۔ دراصل کشور ناہید کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ روایات واقدار میں تبدیلی صرف ظاہری طور پر نہیں بلکہ انسان کے باطن نے بھی پلٹا

کھایا۔ روایات واقدار کی شکست وریخت اورانسان کے اخلاقی زوال نے ہی معاشرے میں کئی طرح کی سماجی برائیوں کو جنم دیا۔ کشور ناہید کے ہاں سماجی برائیوں کا ذکر بھی نہایت تفصیل سے ملتا ہے۔

۳۔ بین الاقوامی سماجی منظر نامہ

کشور ناہید کے ہاں نہ صرف قیامِ پاکستان سے پہلے اور قیامِ پاکستان سے بعد کا منظر نامہ ملتا ہے بلکہ ان کے ہاں بین الاقوامی منظر نامہ بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ کشور ناہید کو فلپائن، مصر، امریکہ اور کینیڈا جیسے کئی ممالک جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کی سماجی اور مجلسی زندگی کا انہوں نے بغور مشاہدہ کیا اور اسے آپ بیتی میں جگہ دیتے ہوئے آپ بیتی کو بین الاقوامی اور آفاقی بنیادوں پر لا کھڑا کیا۔ ان کی آپ بیتی میں مغربی سماج کے لباس، طور اطوار اور رہن سہن کا ذکر ملتا ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں کہ یورپ، امریکہ میں جگہ جگہ شیشوں کے پار نہایت مختصر لباس میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں آپ کو دعوتِ نظارہ پیش کر رہی ہوں گی۔ کشور ناہید نے انہیں طوائف ہی کا ایک نیا روپ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق ہندوستانی سماج کی طرح طوائف مغربی سماج کا بھی ایک اہم حصہ ہے اور کوٹھا ہی چلاتی ہے، جس کی بولی دس روپے سے لے کر سو روپے تک ہوتی ہے۔ فرق صرف ایک بات کا ہے کہ وہی عورت جو ہندوستان میں ایک گندے کمرے، چار میلے کچیلے پردوں اور پلنگ کے درمیان ایک چارپائی جتنی جگہ پر اپنی خدمات سرانجام دیتی تھی آج وہی عورت شیشے کے شوکیس میں باریک سی انگیا پہنے بلاوہ لیے کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے پاس موجود چمک دمک اور شوکیس اسے وقتی طور پر جاذبِ نظر تو بناتا ہے لیکن انجام اس کا بھی وہی ہوتا ہے۔ اور آخر میں مردوں کو نہال کرنے والی یہ عورت بھی کسی خطرناک بیماری کا شکار ہو کر خون تھوکتی مر جاتی ہے۔ ہندوستانی سماج میں لوگ طوائف کے پاس منہ چھپاتے ہوئے جاتے تھے کہ کوئی دیکھ نہ لے، لیکن اس جدید سماج میں یہ تردد بھی ختم ہو چکا ہے۔ کشور ناہید کے مطابق یہ سماجی برائی فیشن کی حد سے گزر کر اب ایک باقاعدہ کاروبار کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> فلپائن اور تھائی لینڈ میں تو قومی آمدنی کا بڑا وسیلہ وہی لڑکیاں ہیں جو زیادہ سے زیادہ شراب اور رات کے ٹھیکے کروا سکتی ہیں۔ ابھی رات اتری نہیں کہ یہ بادہ خانے کھل جاتے ہیں۔

لڑکیوں کے ہجوم دروازے کے پاس سے گزرنے والے کو اسیر کرتے ہیں اور کمیشن پاتے ہیں۔ان کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی ہے۔یہی کمیشن ان کا روزگار الاؤنس ہوتا ہے۔ (۴۳)

کشور ناہید نے ان عورتوں کو پاکستانی ہوٹلوں میں کام کرنے والے "چھوٹوں" سے تشبیہ دی ہے جو ہوٹل پر رات رات بھر کام کرتے ہیں اور ٹپ کے طور پر دس دس روپے کمیشن پاتے ہیں۔

ii۔ نجی وعائلی تناظرات

آپ بیتی میں اکثر اس بات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ مصنف اپنی ذات کے بارے میں کس حد تک سچائی کا دامن تھامے رکھتا ہے اور اپنی جوانی کے رنگین زاویے کس حد تک پیش کرتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے کا مقصد ہی انکشافِ ذات ہے۔ آپ بیتی لکھنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں دراصل یہ سرعام احتساب والا ایک ایسا عمل ہے جو ہمیشہ سچ کا متقاضی رہا ہے لیکن اس کے باوجود جرات اظہار کی کمی نہیں۔ کشور ناہید کی آپ بیتی پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے بھی نہایت جرات اظہار سے کام لیتے ہوئے اپنے نجی وعائلی معاملات بیان کیے۔ کشور ناہید نے اپنی کمزوریاں چھپا کے اپنی خوبیاں اجاگر کرنے کی کوشش کی، نہ ہی ان کے ہاں کسی طرح کی

پردہ داری کے آثار ملتے ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں ان کی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہیں۔ سچائی کا بیان اگرچہ کڑوا گھونٹ پینے کے مترادف ہے، تاہم کشور ناہید میں یہ کڑوا گھونٹ پینے کی ہمت موجود تھی۔ کشور ناہید نے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کی کہ ان کی کمزوریاں ظاہر ہونے سے ان کی شخصیت مسخ ہو گی۔ اپنے بارے میں بہت کچھ بتا کر جرات مند ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ "ایک اچھی آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ نہ چھپائے اور بیرونی ملامت و تحسین سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ دے جو اس کے کردار اور اس کی شخصیت کی ہو بہو نقل بن جائے۔"(۴۴) کشور ناہید اس آپ بیتی میں ایک نڈر خاتون کے طور پر متعارف ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے سماجی و معاشرتی بندشیں اور شدت پسند روایتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ ان کے ہاں ظاہری و باطنی اظہار کے معاملے میں صاف اور واشگاف انداز ملتا ہے۔ ان کی آپ بیتی عشق کی پہنائیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک اور روپ جو ان کے ہاں ابھرتا ہے وہ ایک اداس، غمزدہ اور دکھیاری عورت کا ہے جس کے سارے خواب آنسوؤں میں بہہ نکلے ،اور جسے ہر طرف سے طنز و ملامت کا سامنا کرنا پڑا۔ کشور ناہید کا حلیہ، پسند ناپسند، جوانی کے قصے، زمانہ روزگار،

شادی، ازدواجی زندگی، ادبی دنیا غرض کیا ہے آپ بیتی میں کشور ناہید کی ہر دلعزیزی اور محبوبیت کے قصے بھی سامنے آتے ہیں۔ اپنے نام پیار کا پہلا خط آنے کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتی ہیں کہ گیارہ بجے دوپہر ڈیپارٹمنٹ کے سامنے لان میں ہم سب مل کر وہ خط پڑھتے جو یونیورسٹی کے مختلف ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے لکھا کرتے اور پھر ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے ان لڑکوں کو جا کر خوب چھیڑتے۔

> ان سارے لڑکوں میں ایک لڑکا بہت خوبصورت تھا، تھا بھی انوکھا، میں کالج کے لیے گھر سے نکلتی وہ دس قدم آگے کھڑا، سائیکل لیے، انتظار کر رہا ہوتا، میں لائبریری جاتی، پھر باہر نکلتی وہ کھڑا ہوتا، میں مشاعرے میں جاتی، بالکل سامنے آ کھڑا ہوتا مسکراتا، سینکڑوں۔ (۴۵)

اپنے عاشقوں کے مزید قصے سناتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایک آدمی تیس سال مسلسل ان کی محبت کا دم بھرتا رہا، اس نے ان کے بغیر تاعمر شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ اسی آپ بیتی میں نیند میں ان کا نام بڑبڑانے والا ایک عاشق بھی سامنے آتا ہے۔ ان کے عاشقوں میں ایک شادی شدہ عاشق ایسا بھی تھا، جس نے محض ایک کانفرنس میں ان کی تقریروں سے متاثر ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اپنے گھر کی دیواریں ان کی تصویروں سے آراستہ کر لیں۔ "وہاں سے آنے والے بتاتے ہیں کہ اس نے بیوی کو طلاق دینے کے بعد میری تصویریں کمرے میں سجا کر، اپنا کمرہ آراستہ کیا تھا۔"(۴۶) کشور ناہید نے اس عاشق کے بارے میں ایک پورا صفحہ تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے اس عاشق کی طرف سے کی جانے والی آؤ بھگت اور طرفداریوں کا ذکر کیا ہے۔ اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح سویرے کشور ناہید کی آنکھ اس کے فون کی گھنٹی سے کھلتی، کشور ناہید تیار ہو کر باہر جانے کے لیے دروازہ کھولتیں تو وہ دروازے پہ موجود ہوتا۔ کشور ناہید بیٹھنے لگتیں تو وہ سامنے کرسی لیے کھڑا ہوتا۔ یہ عاشق ان کا سامان اٹھانے اور انہیں بس میں سوار کرانے والے عاشق کے طور پر سامنے آتا ہے جو ہال میں ڈائس پر بھی ان کے استقبال کے لیے موجود رہتا۔ کشور ناہید لکھتی ہیں:

> اس نے تو جیسے ساری عمر کے چاؤ، سارے نخرے، سارے برتاؤ ان چند دنوں میں، بغیر کچھ اظہار کیے، بغیر کچھ جتائے، بغیر کچھ توقع کیے، یوں بتائے کہ مجھے جہاز میں سوار کرانے بھی نہیں آیا۔ کہا، میں تمہیں جاتے نہیں دیکھ سکتا۔ (۴۷)

کشور ناہید نے "بے ناقوسِ لیلیٰ" نامی ایک پورا باب اپنے ان عاشقوں کے لیے مختص کر رکھا ہے۔ اور ان عاشقوں میں شادی شدہ بھی شامل ہیں اور غیر شادی شدہ بھی۔ صرف زمانہ عشق اور نوجوانی کے قصے ہی نہیں ان کی آپ بیتی میں زندگی کے ہر دور کی داستان ملتی ہے۔ کشور ناہید نے بچپن کی کھیل کود، زمانہ طالب علمی، پہلا حیض آنے پر اپنی نفسیاتی کشمکش، اور بطور ایک بیوی اور ماں خاوند اور اولاد کی بے رخی کی صورت میں اپنی زندگی کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں ان کی زندگی کے تمام ادوار کھل کر سامنے آتے ہیں جن میں ان کی پوری زندگی کا مکمل اور واضح عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آپ بیتی ان کے ذاتی و خاندانی حالات کی ایک مکمل روداد ہے جس میں انہوں نے کسی کی پروا کیے بغیر آپ بیتی کا پورا حق ادا کیا۔

iii۔ مذہبی و معاشی تناظرات

کشور ناہید ہم عصر مذہبی صورتحال کا مکمل شعور رکھتی تھیں اور ہم عصر مذہبی صورتحال پہ خود انہوں نے اپنا بے لاگ تبصرہ بھی پیش کیا۔ مذہب کے بارے میں ان کے خیالات ترقی پسندانہ ہیں۔ ان کے ہاں عیسائیت، ہندومت، اسلام سبھی مذاہب کے حوالے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں مذہب پرستی کے بجائے انسان دوستی اور قومی یکجہتی کا احساس ملتا ہے۔ کشور ناہید کے ہاں دو قسم کے مذہبی منظر نامے ملتے ہیں۔ پہلا منظر نامہ تقسیمِ ہند سے قبل کا ہندو مسلم مشترکہ مذہبی منظر نامہ ہے جس کے تحت انہوں نے ہندوستان کا مذہبی ماحول پیش کیا ہے۔ اس منظر نامے کے مطابق اس زمانے میں ہندو مسلمانوں میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں تھا۔ ہندو مسلم سب لڑکیاں اکٹھی جھولے جھولتی، چھتوں کی منڈیر سے باتیں کرتی اور اکٹھی ہی سکول جاتیں۔ کشور ناہید لکھتی ہیں کہ اس وقت مشنری سکول تھا جہاں زیادہ تر عیسائی مشنری استاد تھے۔ ہندو، عیسائی اور مسلمان لڑکیاں انہی کے پاس پڑھتیں اور مل کر کھانا کھاتیں۔ مزید لکھتی ہیں کہ مسلمان لڑکیاں ہندی سیکھتی تھیں جبکہ ہندو لڑکیوں کو اردو سکھائی جاتی۔ الغرض کسی طرح کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اسی طرح مذہبی تہواروں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ سیوالی، دسہرہ اور ہولی بھی سب مل کر مناتے اور عید، بقر عید پر بھی عیسائی اور ہندو سب مبارک باد دینے آتے۔ مذہبی مہینے محرم کے حوالے سے لکھتی ہیں محرم بھی سب کے لیے محترم تھا۔ لکھتی ہیں کہ محرم کی آمد پر بھی مذہبی یکجہتی کا مظاہرہ کیا جاتا۔ کونڈے اگر ایک گھر میں ہوتے تو لڑکیاں محلے بھر کی مل کر پکوان بنانے میں مصروف رہتیں۔ اسی طرح

ان کے ہاں مسلمانوں کے ہاں تعزیہ داری، نویں دسویں محرم کے روزے کا بھی بیان ملتا ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں کہ اس ملک میں ہندوؤں کے شمشان گھاٹ اور مندر بھی تھے اور مسلمانوں کی مساجد بھی۔ اس دور کی کھوکھلی مذہب پرستی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "قرآن کو معنی کے ساتھ پڑھنا منع تھا کہ اس طرح ثواب ضائع ہوتا ہے۔ جو ان پڑھ تھے۔ انہیں کہا جاتا تم بس آیات کی سطروں پر انگلیاں پھیرتے رہو تمہیں قرآن پڑھنے کے برابر ثواب ملے گا۔"(۴۸) ہندوستانی مسلمانوں کے ہاں نماز روزے کی پابندی اور مذہب سے والہانہ لگاؤ پایا جاتا تھا تاہم کشور ناہید کے ہاں اس مذہبی صورتحال پر بھی طنزیہ لہجہ ملتا ہے۔ لکھتی ہیں:

> میں سوچتی ہوں میرے پورے گھرانے کے بچے بڑے، سب کے سب بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے جاتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ پنج گانہ ادا کرتے ہیں۔ بہشتی زیور کھول کر اس میں لکھی آیات پڑھ کر قربانی کرتے ہیں۔ خواتین میلادِ اکبر پڑھتی ہیں۔ وہ دعائیں مانگتی ہیں جس میں ثواب اتنے ہزاروں لاکھوں فرشتوں اور آئمہ سے ہوتا ہوا، کسی مسکین تک مشکل ہی سے پہنچتا ہو گا۔(۴۹)

کشور ناہید کے ہاں یہ پہلا مذہبی منظر نامہ ہندوستان کا تھا۔ دوسرا سماجی منظر نامہ ان کے ہاں قیامِ پاکستان سے بعد کا ملتا ہے جب بھٹو اور ضیاء الحق کے زیرِ انتظام مذہبی سزاؤں کا نظام رائج کیا گیا جس کے تحت سماج پر سزاؤں کی صورت قصاص، قانونِ شہادت اور دیت قانون کا اطلاق کیا گیا۔ قصاص یعنی جان بوجھ کر کیے جانے والے قتل، قتلِ عمد کی صورت میں جان کے بدلے جان ہی تھی۔ قتل خطا یعنی غلطی سے ہونے والے قتل کی صورت میں دیت کا اطلاق ہوتا تھا۔ غلطی سے ہونے والے قتل کے بدلے رقم دے کر اپنی جان چھڑائی جا سکتی تھی۔ تاہم قتلِ خطا کی صورت میں اسلام میں عورت کے لیے جو دیت مقرر کی گئی ہے وہ مرد کی دیت کے مقابلے میں نصف ہے۔ اسی طرح اسلام میں قانونِ شہادت کے مطابق دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے یعنی مرد کے مقابلے میں عورت کی گواہی آدھی قرار دی گئی۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ایک کے بعد ایک قانون آنے شروع ہوئے۔ حدود آرڈیننس کے بعد قانونِ شہادت آیا کہ عورت کو مارو تو پچاس ہزار روپے اور مرد کو مارو تو دیت ایک لاکھ روپے ہو گی اس کے بعد قصاص اور دیت قانون آ گیا۔ پھر قانونِ شریعت آ گیا۔(۵۰)

کشور ناہید اس مذہبی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے اس پر قدرے جزبز بھی دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اپنے مذہبی خیالات کے اظہار میں بھی کسی طرح کی پردہ دری اختیار نہیں کی بلکہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اپنی اس آپ بیتی میں بے جا مذہب پرستی پر مزاحمتی انداز اختیار کرتے ہوئے انہوں نے قدرے مذہب بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

> جب کبھی جمعہ کو مجھے مال روڈ سے گزرنا ہو تو میں مسجد شہدا کے پاس گاڑی آہستہ کر دیتی ہوں، کبھی کبھی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہو جاتی ہوں مائیکروفون سے خوفناک آواز میں الفاظ نکل رہے ہوتے ہیں میں سڑک بدل دیتی ہوں۔ (۵۱)

کشور ناہید کا خیال ہے کہ ان کے دور میں تو کیا ہر مذہب میں ہی مذہب کے نام پر عورت کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ "مذہب کے نام یہ بھی عورت کا مقدر ٹھہرے کہ مذہب، تہذیب اور انسانیت کو مرد کے حق میں اور عورت کے خلاف استعمال کیا جائے۔"(۵۲) کشور ناہید کے مطابق خدا کی جب بھی شناخت کی گئی تو ہمیشہ مرد ذات کے انداز میں کی گئی اور خدا کو ہمیشہ مرد ہی بنا کر پیش کیا گیا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ صلیب پہ عیسیٰؑ چڑھے تو دمِ عیسیٰؑ کہلائے لیکن وہ مریم، جس نے اس عیسیٰؑ کو جنم دیا، اس کا کہیں نام نہیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ انہوں نے وہاں کی عورتوں کے بارے میں منفی تاثر دیتے ہوئے رسول ﷺ سے یہ شکایت کی کہ یہ عورتیں یہ ورغلانے والی ہیں اور یہ تو میری بیوی کو جواب دینا سکھا رہی ہیں۔ کشور ناہید کے مطابق مذہب کو ہمیشہ عورت کے خلاف استعمال کرتے ہوئے اس کا درجہ گھٹانے کی کوشش کی جاتی رہی۔

> دانہ گندم کھلانے کی شرارت آمیز غلط کہانی کو مزید تقویت دینے کے لیے کبھی جی میں آیا تو عورت کو سراسر فتنہ کہہ دیا اور جی میں آیا تو عورت کو محض فریب گر دانا۔ کبھی اس کے پیروں کے نیچے جنت تو کبھی اس کی عقل گٹوں میں۔ (۵۳)

اسی طرح انہوں نے دین اسلام میں پائے جانے والے ایسے روایتی خیالات پر بھی اعتراض اٹھایا کہ اماں حوا یعنی عورت کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے بنایا گیا۔ دین اسلام میں بیوی کے لیے حکم ہے کہ خاوند کے

گھر کو اس کے لیے جنت بنائے اور خاوند جب بھی بستر پہ بلائے بیوی خواہ کتنا ہی ضروری کام کر رہی ہو، جانا چاہیے۔ کشور ناہید کے ہاں خاوند کے مقرر کردہ ان حقوق کے خلاف مزاحمتی رویہ پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> عورت، مرد کے رشتے کے بارے میں تو ہر مذہب نے مرد کو فوقیت دی ہے کہ ہر مذہب مردوں کا لایا ہوا اور مردوں نے اس کی تشریح کی تو گویا عورت کے بارے میں مرد کی رائے یا قانون، خدا کا قانون سمجھا جاتا ہے اسی لیے عورت کا دل کرے نہ کرے، جس مرد سے اس کی شادی معاشرہ کر دے، اس کی یہ قانونی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اسی مرد کا حکم مانے اور جنس کے لیے جب مرد حکم کرے، حاضر اور پیش ہو۔ (۵۴)

دین اسلام میں عورت کے بارے میں ایک تاثر ورغلانے والی عورت کا بھی پایا جاتا ہے، کشور ناہید کے ہاں اس تاثر پر بھی مزاحمتی رویہ پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں: "حوا نے اپنی کہانی کسے سنائی تھی آدم کو اس نے مشہور کر دیا میں اس کی پسلی سے نکلی تھی، تو مجھے ورغلانے والی اور مجازی خدا کو سجدہ کرنے والی بنا دیا۔"(۵۵) دراصل حقوقِ نسواں کی علمبردار کشور ناہید کے مذہبی خیالات پر بھی تحریک نسواں کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر مذہب یا تو پہلے ہی مرد حضرات کا لایا ہوا ہے یا بعد میں اسے مرد حضرات کی منشا و مرضی کے موافق ڈھال لیا گیا۔ قارئین کا کشور ناہید کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں تاہم یہ سچ ہے کہ مذہبی خیالات کے اظہار میں انہوں نے قدرے سختی سے کام لیا۔

کشور ناہید کی اپنے دور کے معاشی مسائل پر بھی نظر رہی وہ حصولِ معاش کے لیے دردر کی کھائی جانے والی ٹھوکروں سے خوب اچھی طرح واقف تھیں اور اس سلسلے میں پیش آنے والے مسائل سے بھی بخوبی آگاہ تھیں خاص کر عورتوں کو حصولِ معاش کے لیے درپیش معاشی مسائل کا ذکر بھی نہایت تفصیل سے کیا۔ خاوند کی وفات کے بعد عورت کے مالی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اسے نہایت شدید مالی تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں حصولِ معاش کے لیے رشوت اور جسم فروشی کا سہارا لینے والوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور رات رات بھر محنت مزدوری کر کے حلال کی کمائی کرنے والے لوگوں کا ذکر بھی۔ ان کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہم عصر سماج معاشی طور پر عدم استحکام کا شکار ایک ایسا سماج تھا جہاں ایک طرف دولت اور نوکر چاکروں کی ریل پیل تھی تو دوسری طرف معاشی حالات اتنے دگرگوں تھے کہ اکثر نوبت خودکشی پہ آ پہنچتی، کئی

لوگ سرکاری افسروں اور وزیروں مشیروں کی گاڑیوں کے آگے لیٹ کر نوکری کی بھیک مانگتے بھی پائے گئے۔ ان کے ہاں ملک کی ایسی صورتحال پر افسوس کا اظہار پایا جاتا ہے۔ کشور ناہید نے آپ بیتی میں ہم عصر سماج کی عکاسی کرتے ہوئے اسے ایک عہد سے واقفیت کا بہترین ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے ہم عصر سماجی صورتحال کا پتہ دیتی یہ آپ بیتی ان کے عصری شعور کی گہرائی کا یقین دلاتی ہے۔

ج۔ اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے سماجی تناظرات کا تقابل

اداجعفری اور کشور ناہید دونوں آپ بیتی نگاروں نے ہم عصر سماج کو دیکھا اسے مختلف زاویوں سے جانچا پرکھا اور اسے اپنی آپ بیتی کا حصہ بھی بنایا۔ ان کے ہاں ہم عصر سماج کی پیش کش کے سلسلے میں کئی اشتراکات بھی پائے جاتے ہیں اور غور کیا جائے تو ان کے ہاں کئی افتراقات بھی سامنے آتے ہیں۔

ا۔ اشتراکات

اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں "جو رہی سو بے خبری رہی" اور "بری عورت کی کتھا" میں کئی قدریں مشترک پائی جاتی ہیں۔ ان دونوں خواتین کا تعلق ایک ہی سماج سے تھا دونوں پہلے ہندوستانی سماج کا حصہ رہیں اور پھر دونوں خواتین پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر کے پاکستانی سماج میں شامل ہو گئیں یہی وجہ ہے کہ ہم عصر سماج کی پیشکش میں ان کے ہاں زیادہ بہت سی باتیں ایک جیسی ہیں۔

اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ ان دونوں خواتین کے ہاں سماجی منظر ناموں کی پیشکش میں رنگا رنگی اور تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے ہاں کئی طرح کے سماجی منظر ناموں کی پیشکش ملتی ہے۔ انہوں نے برصغیر پاک و ہند کا سماجی منظر نامہ بھی پیش کیا اور دیگر کئی ملکوں کی سماجی زندگی کو بھی بیان کیا۔ اداجعفری اور کشور ناہید کی ذاتی زندگی دوادوار میں منقسم تھی، تقسیم ہند سے قبل اور قیامِ پاکستان کے بعد۔ اور انہیں دیگر کئی ممالک کا سماجی نظام بھی دیکھنے کو ملا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تقسیمِ ہند سے قبل، مابعد اور بین الاقوامی سماجی منظر نامے جیسے کئی طرح کے سماجی منظر ناموں کی تفصیل پائی جاتی ہے۔ ان آپ بیتیوں میں شامل سماجی منظر ناموں نے ان کی رونق میں اضافہ کرتے ہوئے انہیں مزید دلچسپ بنا

دیا ہے یوں ان آپ بیتیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کی آنکھوں کے سامنے نادیدہ بستیاں گھوم جاتی ہیں۔ کشور ناہید کے ہاں یورپ، فلپائن، مصر، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کے سفر کا احوال ملتا ہے جبکہ ادا جعفری کے ہاں برطانیہ ،امریکہ ،روس، فرانس، جاپان، ترکی، روم اور پاکستان کے سفر کی روداد ملتی ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک قدر یہ مشترک ہے کہ ان دونوں آپ بیتی نگاروں نے ہم عصر سماجی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے آپ بیتی میں مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان دونوں نے آپ بیتی میں صرف "میں" کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ سماج کا ایک نمائندہ اور ایک حساس ادیب ہونے کا حق بھی ادا کیا۔

دونوں آپ بیتیاں ہم عصر تہذیب و ثقافت اور روایت و اقدار کے عروج و زوال کی ایک مکمل اور لازوال داستان ہیں۔ دونوں کے ہاں قدیم اور جدید روایات کا حسین امتزاج ملتا ہے اور یہ دونوں آپ بیتیاں اپنے ماضی کو سمیٹتی حال سے قدم ملاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان دونوں خواتین کے ہاں ہم عصر سماجی نظریات، عقائد و توہمات، افکار و خیالات، آداب، برتاؤ وغیرہ سب پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ ادا جعفری اور کشور ناہید نے سماج کی مجموعی ذہنی و فکری حالت کا پتہ دیتے ہوئے نا صرف تہذیبی شعور کا ثبوت دیا بلکہ سماجی زندگی کی مجسم تصویر میں خوبصورت تمدنی رنگ بھی بھرے۔ ڈاکٹر شاہدہ حسن لکھتی ہیں:

> جولائی ۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والی ادا جعفری کی خود نوشت " جو رہی سو بے خبری رہی" اک ایسی تحریر ہے جو اردو زبان میں اچھی نثر کی تازہ تر لطافتوں اور دل کشی کے ساتھ سپرد قلم کی گئی ہے۔ اور ایک خاص زمانے کی تہذیب، طرز فکر اور طرز معاشرت کی عکاس ہے۔ تقسیم ہند سے قبل کے مسلمان معاشرے کی دیرینہ روایات میں پلی بڑھی ادا جعفری سفر در سفر، مختلف معاشروں کے تنوع اور رنگا رنگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ان کی بخشی ہوئی مسرتوں سے زندگی کی حرارتیں کشید کرتی رہی ہیں۔ (۵۶)

ادا جعفری کی طرح کشور ناہید کی آپ بیتی بھی تہذیبی رنگوں سے مزین ہے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے کئی طرح کی تہذیبوں کا مشاہدہ کیا یہ مطالعہ و مشاہدہ ان کی آپ بیتی سے بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ کشور ناہید نے خود

بھی اپنی اس آپ بیتی میں مختلف تہذیبوں کے مشاہدے کا دعویٰ کرتے ہوئے لکھا کہ میں نے دنیا بھر کی گلیوں میں بہنے والی تہذیب کو دیکھا اور محسوس کیا۔ اور ہر لمحے کو موتیوں کی طرح تجربے کی لڑی میں پرو کر بیان کیا۔ حقوقِ نسواں کی علم بردار یہ خاتون ایک نہایت متحرک خاتون رہی ہیں۔ انہوں نے رنگارنگ تہذیبوں کا مطالعہ کیا اور اسے آپ بیتی کا حصہ بنایا۔ ان دونوں آپ بیتیوں کے مطالعے سے قاری اس دور کے ملبوسات، طرزِ تعمیر، مصوری ،سنگ تراشی، موسیقی اور ادب سے واقف ہوتا ہے۔ یہاں ایک بات ان دونوں میں مشترک ہے کہ دونوں خواتین نے کسی ایک تہذیب پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے آپ بیتی کو کئی طرح کی تہذیبوں سے سجایا۔

ایک اور بات جو ان دونوں آپ بیتیوں میں مشترک ہے وہ سماجی رشتوں کے نظام کی عکاسی ہے سماج کی مختلف قسمیں ہیں اور ہر سماج کا اپنا رہن سہن اپنا نظامِ زندگی ہوتا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کی جاتی ہے فرد سماج کی بنیادی اکائی قرار دیا جاتا ہے اور مختلف افراد سے مل کر ہی کوئی سماج تشکیل پاتا ہے۔ سماجی ماحول کی بنیاد ان افراد کے مابین تعلقات پر ہوتی ہے۔ ان افراد کے مابین تعلقات کی نوعیت سے ہی سماجی ماحول بنتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر سماج میں پائے جانے والا رشتوں کا یہ نظام ایک جیسا ہی ہو۔ کہیں نظام کی ساخت میں فرق ہے تو کہیں رشتوں کی نوعیت جدا جدا ہے ادا جعفری اور کشور ناہید کے ہاں مشرقی سماج میں رشتوں کے نظام اور ان کی نوعیت بھی اجاگر ہوتی ہے اور ان دونوں آپ بیتی نگاروں نے مغربی سماج میں پائے جانے والے رشتوں کے نظام اور اس کے کھوکھلے پن کو بھی عیاں کیا۔ ان کے ہاں عورت کے بھی مختلف سماجی روپ دکھائی دیتے ہیں عورت محبوبہ، بہن، بیوی، ماں، بیٹی، ساس اور طوائف ہر روپ میں اپنا سماجی کردار نبھاتی دکھائی دیتی ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں سماجی نابرابری اور اقتصادی ناہمواری کی نشاندہی کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ ادا جعفری اور کشور ناہید دونوں کے ہاں اس سماجی ناہمواری کے احساس کے ساتھ ساتھ اس پر گہرے دکھ کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کا دور بھی ایک ایسا دور تھا جو سماجی ناہمواری کا شکار تھا۔ ان دونوں آپ بیتی نگاروں کی آپ بیتی میں اپنے دور کی اسی سماجی ناہمواری پر گہرے دکھ کا اظہار ملتا ہے۔ دونوں آپ بیتی نگاروں کو اس بات کا احساس تھا کہ سماج اعلیٰ و ادنیٰ دو طبقوں میں بٹ کے رہ گیا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ انسان کو عزت ہمیشہ سماج میں اس کے مقام اور ذریعہ معاش کے مطابق دی جاتی ہے۔

ان دونوں آپ بیتی نگاروں میں ایک قدر یہ بھی مشترک ہے کہ ان دونوں کے ہاں سماجی تغیر کا گہرا احساس پایا جاتا ہے ان دونوں آپ بیتی نگاروں نے اپنے عصر سے تحریک حاصل کی اور سماجی تغیر و تبدل کا جائزہ لیتے ہوئے نئے نئے موضوعات اخذ کر کے انہیں آپ بیتی کا حصہ بنایا۔ کہتے ہیں وقت میں تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے وقت اور زمانہ بدل جاتا ہے دراصل بات یہ ہے کہ سماج اور انسانی اقدار بدلتی رہتی ہیں ان کے تغیر کو ہی وقت میں تبدیلی کا نام دیا جاتا ہے۔ یوسف جمال لکھتے ہیں:

> مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں سوچنے کا ڈھنگ مختلف رہا ہے۔ دنیا اتنی متنوع اور رنگارنگ ہے۔ سوچنے کے طریقے اور فیشن وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلتے چلے آئے ہیں کہ کل جو چیز خوبی کہلاتی تھی ممکن ہے کہ آج برائی نظر آئے۔ (۵۷)

یوسف جمال کا کہنا بالکل بجا ہے بلاشبہ مذاقِ زمانہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے یہ ضروری نہیں کہ جو ایک دور کی پسند رہی ہو، دوسرے دور کے لوگ بھی اسے ہی پسند کریں۔

ادا جعفری اور کشور ناہید دونوں کو سماج کے بدلتے رنگوں کا بخوبی احساس تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ سماجی سطح پر کہاں کہاں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ ان دونوں خواتین کے مطابق وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی پسند ناپسند، معیار اور قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ ان دونوں خواتین نے ڈولیوں اور کہاروں کا ذکر کرتے ہوئے پردے کے زمانے کا ذکر کیا جب پردے کی اتنی سختی تھی کہ کبھی کوئی عورت برقعے کے بغیر نہیں دیکھی گئی۔ سخت بیماری کی صورت میں بھی پردہ داری کی روایت برقرار رکھتے ہوئے ہاتھ آٹے میں لپیٹ کر حکیم کو دکھایا جاتا۔ لیکن پھر زندگی نے انہیں بغیر برقعے کے گلی محلوں میں نعرے لگاتی عورتیں بھی دکھائیں اور ہکنی پہنے نیم برہنہ گھومتی لڑکیاں بھی۔ اسی طرح انہوں نے اور بھی بہت سی مثالوں سے جابجا سماجی تغیر کی نشاندہی کی۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ ان دونوں آپ بیتیوں میں تنہائی کا احساس پایا جاتا ہے دونوں خواتین کے ہاں یہ احساس ملتا ہے کہ ایک مکمل سماج اور انسانی بھیڑ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی انسان تنہا ہے۔ دراصل یہ دونوں آپ بیتیاں انسان کی جذباتی ناآسودگی کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں عورت کے سماجی مقام کا بیان بھی ملتا ہے جس سے سماج میں عورت کے مروجہ مقام کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ دونوں آپ بیتیوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں آپ بیتی نگاروں نے مرد کے مقابلے میں عورت کے بے مقام ہونے کی نمائندگی کی اور اس کے خلاف احتجاج ریکارڈ کرایا۔ ان آپ بیتیوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عورت کو سماج کی طرف سے کن رویوں کا سامنا رہا؟ وقت اور حالات میں تبدیلی کے ساتھ عورت کے خیالات و نظریات میں کیا تبدیلی آئی؟ اور عورت نے کس طرح اپنے آپ کو بدلتے حالات کے مطابق ڈھالا۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں نسائی جذبات واحساسات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ اور سماجی و معاشرتی رویوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے نہ صرف عورت کے ساتھ روا رکھے گئے مردانہ رویوں کی عکاسی کی گئی بلکہ عورت کی حمایت کرتے ہوئے اس کے حق میں بھی آواز اٹھائی گئی۔ دونوں شاعرات نے سماجی سطح پر پائے جانے والی مردانہ بالادستی کو نہ صرف رد کیا بلکہ وہ اس کے خلاف غم و غصے کا بھرپور اظہار بھی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں عورت ایک الگ اور اپنا مکمل وجود رکھنے والی شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ان کے مطابق عورت ایک ایسی ہستی ہے جو احساسات و جذبات سے قطعاً عاری نہیں بلکہ اپنا ایک الگ وقار واہمیت رکھنے والی بھرپور صلاحیتوں کی مالک ہے۔ مختلف ممالک کی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار یہ آپ بیتیاں قارئین کو بین الاقوامی سطح پر طرح طرح کے تہذیب و تمدن سے روشناس کرواتی ہیں۔ دونوں آپ بیتیوں میں روایات واقدار کا نہایت موزوں اور برمحل اظہار ملتا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک قدر خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کی بھی مشترک ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں مختلف سماجی شخصیات کے خاکے ایک تواتر سے مسلسل پیش کیے گئے ہیں غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

> خاکہ نگاری کے حوالے سے بھی اس کتاب کی خاص اہمیت ہے کہ انہوں نے مختلف شخصیتوں کے خاکے اختصار مگر جامعیت سے تحریر کیے ہیں۔ ادا جعفری کی یہ خودنوشت ہمارے نزدیک پاکستان میں لکھی جانے والی خودنوشتوں کا نقطہ کمال ہے یہ ایک بھرپور ادبی شخصیت کی بھرپور ادبی سرگزشت ہے۔ (۵۸)

نفسیاتی اعتبار سے بھی یہ دونوں آپ بیتیاں ایک نہایت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان آپ بیتیوں کے ذریعے انسان کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ دونوں خواتین یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ سماج میں تمام ذہن ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی سماج میں کئی طرح کی سوچ اور عقیدے کے حامل افراد پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ ان دونوں خواتین نے سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے ہوئے مختلف سماجی ناسوروں پر نشتر کاری کا فریضہ سر انجام دیا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں سماجی برابری اور چھوت چھات کے مسائل کو مختصراً واضح کیا گیا۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ان دونوں آپ بیتیوں میں بہت سے اشتراکات پائے جاتے ہیں۔

۲۔ افتراقات

ان دونوں آپ بیتیوں میں جہاں اتنے اشتراکات پائے جاتے ہیں وہیں یہ آپ بیتیاں کئی افتراقات کی حامل بھی ہیں۔ ایک ہی دور سے تعلق رکھنے کے باوجود دونوں خواتین آپ بیتی نگاروں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چونکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے اور یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ ہر ادیب کی تحریر میں اس کے مزاج کی تاثیر محسوس کی جاسکتی ہے، کسی کے ہاں یہ تاثیر گرم ہو گی تو کسی کے ہاں سرد جذبات کی فراوانی ہو گی۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کے مزاج کی یہ الگ الگ تاثیر ہی ہے جو ان دونوں میں حدِ امتیاز قائم کرتی ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں کا انداز جدا جدا ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک اور فرق مدح یا ذم کا پایا جاتا ہے۔ ادا جعفری اپنی آپ بیتی میں ہر چھوٹے بڑے کی تعریف میں رطب اللسان دکھائی دیتی ہیں جبکہ کشور ناہید اپنے عزیز، رشتہ داروں اور دوستوں وغیرہ سبھی سے شکوہ کناں دکھائی دیتی ہیں۔ ادا جعفری کو اگر کسی سے شکایت تھی یا انہیں کسی نے برا بھلا کہا بھی تو وہ یہ کہتے ہوئے آگے گزر جاتی ہیں کہ: ”ایسا نہیں تھا کہ مجھے کبھی کسی سے دکھ نہ پہنچا ہو دوستوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں سے واسطہ رہتا تھا مگر جن باتوں نے دل دکھایا انہیں اپنی یادوں میں کیوں شریک رکھا جائے۔“[۵۹] دراصل ادا جعفری کے مزاج کی اپنائیت اور خلوص ہی تھا کہ انہیں کسی سے کم ہی گلہ رہا ان کی فطرت کی نرمی انہیں لبوں تک شکوہ لانے سے دور رکھتی ہے۔ انہیں اگر کسی سے شکوہ تھا بھی تو انہوں نے دل ہی میں رکھا زبان پر نہ لائیں۔

لائیں۔ اور سب اچھا ہے کی گردان پیش کی۔

> اداجعفری نے کسی شخص کے ذکر میں تلخی اور عیب جوئی سے کام نہیں لیا۔ اس آپ بیتی میں اداجعفری نے کسی شخص کے تذکرے کے ضمن میں تلخی، عیب جوئی اور طنز واستہزا کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ زندگی میں اچھوں اور بروں، بہی خواہوں اور بدخواہوں سبھی سے واسطہ پڑتا ہے بلکہ برے کچھ زیادہ ہیں، راستہ کاٹتے ہیں مگر اداجعفری کو کسی شخص میں کوئی کمی یا خامی نظر نہیں آئی۔ (۶۰)

اگرچہ کشور ناہید کی جذباتی رویے کی حامل اس آپ بیتی میں دوسروں کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ کشور ناہید نے پچھلی روایت دہراتے ہوئے ایسی کوئی وصیت نہیں کی کہ یہ آپ بیتی میرے مرنے کے بعد شائع ہو۔ کشور ناہید سچائی کا بلاخوف اور جیتے جی اظہار کر کے دوسروں کو بھی افہام و تفہیم کا موقع دینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے آپ بیتی کو ذاتی جلوہ نمائی، نمود و نمائش اور چھپ کر حملہ کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔

سماجی تناظرات کے حوالے سے بھی اداجعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں یہ فرق بہت واضح ہے کہ سماجی روایت واقدار پیش کرتے ہوئے اداجعفری کا رویہ زیادہ تر مثبت رہا جبکہ کشور ناہید کے ہاں منفی تاثر زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ سماجی رویوں کے اظہار کے سلسلے میں اداجعفری کے ہاں دھیما دھیما جمہوری انداز جبکہ کشور ناہید کے ہاں انقلابی لہجہ اور باغیانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ اداجعفری کھلم کھلا بغاوت کرنے سے ہچکچاتی ہیں ان کے ہاں دبا دبا سا احتجاج ملتا ہے۔ بقول نرگس بانو:

> اداجعفری جس ماحول اور زمانے کی پروردہ ہیں اس میں عورت کے آزادانہ اور باغیانہ الفاظ وخیالات کو اخلاق، تہذیب اور سماجی اقدار کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اداجعفری نے جدید دور کے خیالات کے اظہار کے لیے بھی بلند آہنگ لہجہ اختیار نہیں کیا۔ اداجعفری کا اندازِ بغاوت انھیں زمانہ وماحول کی قابلِ مذمت روایتوں اورروا جوں کے خلاف اکساتا اور شاعری پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن ان کا باغیانہ طرزِ فکر ان کی فطری نسائی نرمی اور طرزِ بیان میں چھپ جاتا ہے۔ (۶۱)

نرم رویئے کی حامل ادا جعفری کی آپ بیتی میں شدت اور تلخی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادا جعفری کے برعکس کشور ناہید کا لہجہ بلند آہنگ اور ان کا رویہ باغیانہ ہے۔ کشور ناہید کے ہاں سخت رویہ اور طنز کی کاٹ پائی جاتی ہے۔ سماجی اظہار کے سلسلے میں کشور ناہید نے محتسب کا کردار ادا کرتے ہوئے سخت انداز اپنایا۔

اپنے عہد کے شعور کو زبان دیتے ہوئے آپ بیتی میں روایت پسندی کی طرف مائل دکھائی دیتی ہیں جبکہ کشور ناہید کے ہاں روایت سے بغاوت کا احساس ملتا ہے۔ ادا جعفری کی گرفت روایت پہ بھی مضبوط ہے اور وہ سماجی میلانات سے بھی قریب تر نظر آتی ہیں۔ ادا جعفری کے مقابلے میں ایجاز و اختصار اور جامعیت کشور ناہید کی آپ بیتی کی اہم خصوصیات ہیں۔ وہ کم الفاظ میں مکمل بات کہنے کے فن سے آشنا ہیں۔ ان کی نثر فصاحت بلاغت اور تنوع کی دولت سے مالا مال ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ پایا جاتا ہے کہ سماجی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کشور ناہید نے خواتین میں گراوٹ اور اخلاقی پستی کے مسائل کو بھی اجاگر کیا جبکہ ادا جعفری اس سے پہلو تہی کر گئی ہیں۔ اس سلسلے میں کشور ناہید کے ہاں نابرابری کی شادی، بے اولادی کی صورت میں اولاد کے دباو پر ایک نیا راستہ نکال لینے والی خواتین کی نشاندہی ملتی ہے۔ کشور ناہید نے خاتون ہونے کے باوجود صنفی جانبداری سے کام لیا نہ ہی انہوں نے زمانے کی پرواہ کی۔ ادا جعفری کی آپ بیتی میں شعوری یا لاشعوری طور پر صنفی جانبداری کا احساس پایا جاتا ہے۔ تاہم کشور ناہید اس معاملے میں مکمل انصاف سے کام لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ جیسا کہ مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ان کی خطابت کا موضوع وہ بدسلوکیاں ہیں جو مردوں نے عورتوں کے ساتھ کیں۔ ان بدسلوکیوں کو وہ ایسے موثر اور دلگداز انداز میں بیان کرتی ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس آنکھیں ہوں۔ عورتوں کے حقوق کی پامالی پر ایسے ایسے مضمون باندھے کہ انہیں پڑھ کر دل دکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کشور کی منصف مزاجی بھی داد کے لائق ہے کہ انہوں نے عورتوں کی ریاکاریوں کی داستانیں بھی خوب نمک مرچ لگا کر بیان کی ہیں۔ بعض چھ خصمی اور دس خصمی عورتوں کا ذکر کتاب کے ادبی حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ (۶۲)

کشور ناہید نسوانیت کے بے جا اظہار سے خائف دکھائی دیتی ہیں اور نسوانیت کو ایک ڈھونگ قرار دیتی ہیں۔ ان کے یہاں عورت کے نسائی حربوں سے کام لینے کے خلاف غم وغصے کا اظہار پایا جاتا ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق احساسِ کمتری کا ہے۔ ادا جعفری کے برعکس کشور ناہید کے ہاں سماجی رویوں کے دین خود ترسی اور کم مائیگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ کشور ناہید کو پہلے معمولی شکل وصورت اور پھر پسند کی شادی پر سخت سماجی رویئے برداشت کرنے پڑے۔ ان کی حساس طبیعت پہ لعن طعن کا یہ بار، بارِ گراں ثابت ہوا جس کا ان کی آپ بیتی پہ بھی گہرا اثر مرتب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی میں خود ترسی اور احساسِ محرومی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔

ادا جعفری کے ہاں زیادہ تر معاشی، سیاسی اور تہذیبی مسائل سامنے آتے ہیں جبکہ کشور ناہید کی آپ بیتی میں سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی مسائل کے علاوہ جنسی ونفسیاتی مسائل کا بیان بھی ملتا ہے۔ ادا جعفری کے ہاں عام گھریلو عورت کی جذباتی کشمکش کا بیان ملتا ہے، وہ عشق ومحبت کے رنگین پہلو سے پہلو تہی کر گئی ہیں اس کے برعکس کشور ناہید نے آپ بیتی میں عشق محبت کی پہنائیوں کو سمیٹے عورت کی جنسی کیفیات پر بھی روشنی ڈالی۔ کشور ناہید نے سماجی مسائل بیان کرتے ہوئے ازدواجی زندگی کے مسائل کو بھی آواز دی ان کے ہاں میاں بیوی میں پیار محبت کی کمی، خاوند کی دوسری عورتوں سے دلچسپی اور اس سے جنم لینے والے سماجی ونفسیاتی مسائل سامنے لائے گئے۔ کشور ناہید کے ہاں مختلف سماجی جرائم کے ذکر کے ساتھ ان پر عائد جرم وسزا کے قوانین کے خلاف بیان ملتا ہے۔ کشور ناہید کے برعکس ادا جعفری کے ہاں تنہائی کا احساس نمایاں ہے جو ان کی نفسیات پر بھی اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان کے ہاں یہ احساس مایوسی اور قنوطیت کی حد کو چھونے نہیں پاتا بلکہ ان کے ہاں امید زندہ رہتی ہے۔

ادا جعفری اور کشور ناہید کے ہاں ایک فرق خلوص نیت، بے نیازی اور بے باک اظہار کا پایا جاتا ہے۔ سماجی ونجی اظہار کے معاملے میں کشور ناہید لوگوں کی پرواہ نہیں رکھتیں۔ ان کے ہاں اظہار کی جو تمنا اور سچائی دیکھنے کو ملتی ہے وہ ادا جعفری کے ہاں مفقود ہے۔ آپ بیتی ایک ایسی چیز ہے جس میں مواد کے تانے بانے خود اپنی ذات سے بنے جاتے ہیں۔ کشور ناہید کی آپ بیتی پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں جرات اظہار کی

فراوانی ہے ان کے ہاں بیرونی ملامت و تحسین سے بے نیاز ہر اس بات کا اظہار ملتا ہے جو ان کی شخصیت و کردار کی گواہی ہے۔ ادا جعفری کے برعکس کشور ناہید کے ہاں نہایت بے باک اور دبنگ انداز دیکھنے کو ملتا ہے انہوں نے اپنی شخصیت کے ان پہلوؤں کا اظہار بھی کیا جن کو احاطہ تحریر میں لانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کشور ناہید نے ایک عورت ہوتے ہوئے بھی نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے آپ بیتی کے تمام تقاضے پورے کیے۔ اس آپ بیتی میں ان کی زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ ریحانہ خانم نے لکھا ہے:

> ایک جاندار آپ بیتی میں لکھنے والے کے ماتھے کی تیوریاں اس کا تبسم زیرِ لب بھی نمایاں ہو سکتا ہے اور اس کے ذہن کی وسیع دنیا میں سمائے ہوئے خیالات بھی۔ اس کے علاوہ دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے یعنی کل خارجی و داخلی زندگی کی عکاسی آپ بیتی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مگر سب سے بڑی شرط وہی سچائی پھر خلوص اور بے باکی ہے مگر ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ ہر طرح کی خصوصیات ایک آپ بیتی میں نظر آسکیں۔ (۶۳)

کشور ناہید کی آپ بیتی، آپ بیتی کی تمام تر خصوصیات پر پوری اترتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ بیتی نگار کی نفسیات تک پہنچنا ویسے ایک مشکل امر ہے تاہم آپ بیتی نگار چاہے تو خود اپنے جذبات واحساسات اور ذہنی و جذباتی کیفیات سامنے لا سکتا ہے۔ کشور ناہید کے ہاں داخلی جذبات کی بھی فروانی پائی جاتی ہے۔ اور یہ آپ بیتی ایک ایسی کھلی کتاب کی مانند ہے جس میں ہر چیز نہایت صراحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ ہے کہ ہم عصر سماج کی عکاسی کے لیے ادا جعفری نے سادہ اسلوب کو ترجیح دی جبکہ کشور ناہید کی آپ بیتی میں جمالیاتی رنگ پایا جاتا ہے۔ نرگس بانو ادا جعفری کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ان کے اندازِ تحریر میں کسی بناوٹ، تصنع اور تکلف کا شائبہ محسوس نہیں ہوتا جو سادگی، بے ساختگی، محویت اور اطمینان ان کی شخصیت میں ہے وہی ان کی تحریر کا خاصا ہے۔ ان کی سادگی میں بھی پرکاری ہے۔ (۶۴)

ہمہ جہت شخصیت کی مالک کشور ناہید کی رنگا رنگ اور متنوع مثالوں سے مزین آپ بیتی اپنے اندر مختلف رنگ سموئے ہوئے ہے۔ کہیں ہمہ رنگ استعاروں سے اظہار ملتا ہے تو کہیں اساطیری رنگ پہ مشتمل یہ آپ بیتی تجریدی آرٹ کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ بقول شبانہ سلیم: ”بری عورت کی کتھا ایک صاحبِ طرز شاعرہ اور صاحبِ

اسلوب نثر نگار خاتون کشور ناہید کی خود نوشت ہے جس کی نثر میں تجریدی آرٹ کا ذائقہ ہے۔" (۶۵)کشور ناہید نے عالمی سطح پر مشہور اساطیری حوالوں کو ذریعہ اظہار بناتے ہوئے دنیا کی مختلف تاریخی شخصیات اور فنونِ پر بات کی ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ہم عصر سماج کی مذہبی صورتحال کی عکاسی کے حوالے سے ایک قدر یہ مختلف ہے کہ اداجعفری اپنی آپ بیتی میں مذہب پرستی کی طرف مائل دکھائی دیتی ہیں جبکہ کشور ناہید ایک مذہب بیزار عورت کے طور پر سامنے آتی ہیں ان کے ہاں مذہب پر بھی تیکھے وار پائے جاتے ہیں۔ کشور ناہید کے ہاں بے جا مذہب پرستی کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق خود پسندی یا نرگسیت پسندی کا بھی پایا جاتا ہے۔ کشور ناہید کے ہاں نرگسیت پسندی اور خود نمائی کا احساس پایا جاتا ہے۔ کشور ناہید اپنی ذات کی محبت میں گرفتار دکھائی دیتی ہیں ان کے برعکس اداجعفری کے ہاں اس طرح کا کوئی احساس موجود نہیں۔ کشور ناہید کے ہاں جابجا احساس تفاخر ملتا ہے اور انانیت پسندی کے احساس کا اندازہ ان کے مداحوں اور عاشقوں کے بیان سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

ایک ادیب ہونے کے ناتے اداجعفری اور کشور ناہید کو اپنی سماجی ذمہ داریوں کا اندازہ تھا یہی وجہ ہے ان دونوں خواتین نے سماج کے صرف رنگین پہلو ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سماج کو درپیش مختلف مسائل کو اجاگر کرنے میں اپنا کردار بھی ادا کیا۔ ان کی آپ بیتیوں میں جاگیردارانہ نظام، عورت کی سماجی حیثیت، تعلیم نسواں، بے جوڑ شادی، فرقہ واریت، مذہبی تعصب، توہم پرستی، معاشی ابتری اور بے روزگاری وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان دونوں خواتین نے اپنی آپ بیتیوں سے یہ بات باور کرائی کہ وقت کبھی ٹھہرتا نہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ سماجی روایات واقدار بھی بدلتی چلی جاتی ہیں۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ دونوں آپ بیتیاں نجی وعائلی زندگی پر روشنی ڈالتی سماجی گوشے اس طرح روشن کرتی ہیں کہ ایک ایک منظر روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان مناظر کی روشنی میں بالخصوص ہندوستان کی سماجی زندگی کی تصویریں نہایت واضح، چمکدار اور روشن ہیں۔ سماجی حقیقت نگاروں کی طرح انہوں نے وقت کی آواز کو سنا اور سماجی زندگی اور اس کے مسائل سے چشم پوشی نہیں کی۔

حوالہ جات

۱۔ سماج، wikipedia.org/wiki، ۲۵ دسمبر ۲۰۱۹، ۳۰:۳pm

۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۹

۳۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۶ء، ص ۴۰

۴۔ یوسف جمال انصاری، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں (مضمون)، مطبوعہ: نقوش (آپ بیتی نمبر)، لاہور، ۱۹۶۴ء، شمارہ ۲، ص ۶۸

۵۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۷

۶۔ نورالحسن جعفری، ڈاکٹر، جو رہی سو بے خبری رہی (مضمون)، مطبوعہ: نگار (ادا جعفری نمبر)، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۷

۷۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۴۲

۸۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۳۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۴۔۳۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۱۔ ایضاً، ص۵۴

۲۲۔ ایضاً، ص۱۵

۲۳۔ ایضاً، ص۵۷۔۵۶

۲۴۔ ایضاً، ص۲۶۹

۲۵۔ ایضاً، ص۲۰۳

۲۶۔ ایضاً، ص۲۶۸

۲۷۔ ایضاً، ص۱۷۵

۲۸۔ ایضاً، ص۲۸۹

۲۹۔ ایضاً، ص۲۴۵

۳۰۔ ایضاً، ص۷

۳۱۔ ایضاً، ص۸

۳۳۔ ایضاً، ص۲۵۹

۳۴۔ ایضاً، ص۳۷

۳۵۔ ایضاً، ص۳۹

۳۶۔ ایضاً، ص۹

۳۷۔ ایضاً، ص۸

۳۸۔ ایضاً، ص۸

۳۹۔ ایضاً، ص۷

۴۰۔ ایضاً، ص۸

۴۱۔ ایضاً، ص۱۷

۴۲۔ ایضاً، ص۹

۴۳۔ ایضاً، ص۳۸

۴۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، آپ بیتی (مضمون)، مطبوعہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء، ص۶۳

۴۵۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۰
۴۶۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۱۱۶
۴۷۔ ایضاً، ص ۱۱۶
۴۸۔ ایضاً، ص ۲۸
۴۹۔ ایضاً، ص ۲۸
۵۰۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۹
۵۱۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، ص ۲۸
۵۲۔ ایضاً، ص ۵۵
۵۳۔ ایضاً، ص ۵۵
۵۴۔ ایضاً، ص ۱۳۶
۵۵۔ ایضاً، ص ۳
۵۶۔ شاہدہ حسن، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، www.iqbalcyberlibrary.net، ۲۰۰۵ء، ۴:۱۰
۵۷۔ یوسف جمال انصاری، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں (مضمون)، مطبوعہ: نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۷۹
۵۸۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب۔ شناخت کی نصف صدی، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۲
۵۹۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۶
۶۰۔ محمد نوشاد عالم، اردو خود نوشت سوانح حیات: آزادی کے بعد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۹۵ء، ص ۱۹۹
۶۱۔ نرگس بانو، ادا جعفری شاعر و نثر نگار، انجمنِ ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۷
۶۲۔ مشفق خواجہ، شعلہ سا لپک جائے ہے الفاظ تو دیکھو، مطبوعہ: ہفت روزہ تکبیر، کراچی، ۳۰ مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۶۵
۶۳۔ ریحانہ خانم، آپ بیتی کیا ہے (مضمون)، مطبوعہ: نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۴
۶۴۔ نرگس بانو، ادا جعفری شاعر و نثر نگار، انجمنِ ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۳
۶۵۔ شبانہ سلیم، ڈاکٹر، اردو میں خواتین کی خود نوشت سوانح عمریاں؛ تجزیاتی مطالعہ، باب العلم پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۰۴

باب سوم:

ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور: سیاسی تناظرات

سیاست عربی زبان کا لفظ ہے انگریزی میں اس کے لیے Politics کا لفظ مستعمل ہے جو یونانی زبان کے لفظ Polis سے مشتق ہے اس کے معنی شہر یا ریاست کے ہیں۔ سیاست کے لغوی معنی نظم و نسق، حفاظت، نگہبانی، تنبیہہ، رعب، دبدبہ، حکومت یا انتظام کے ہیں۔

عام طور پہ سیاست کو Knowledge Of The Government and State کہا جاتا ہے اصطلاح میں سیاست سے مراد عوام اور ایک خاص گروہ کے مابین ایک ایسا معاہدہ ہے جس کے تحت اس خاص گروہ کو کچھ اختیارات دیتے ہوئے اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ ملک کا نظم و نسق چلاتے ہوئے عوام کو بنیادی حقوق فراہم کرے۔

> حکومت سازی کی سائنس جو کہ کسی بھی قوم یا ریاست کے قوانین کا حصہ ہو جس میں حفاظت، امن خوشحالی اپنی بقا کی کوشش اور بیرونی دباؤ اور کنٹرول کے خلاف دفاع، ایسی طاقت اور ذرائع کا استعمال، شہریوں کے حقوق کی حفاظت ان کے اخلاقیات کی بہتری اور بقا شامل ہوتے ہیں۔ (۱)

سیاست دراصل بادشاہت کرنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جس کے تحت عوام کی نگہبانی کرتے ہوئے امن وامان برقرار رکھا جائے، خواہ اس کے لیے قصوروار کو اس کے جرم کے مطابق سزا ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

ادب اور سیاست

ادب اور سیاست کے مابین تعلق کی نوعیت پر بھی دو قسم کے رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو ادب میں سیاست کی شمولیت کے خلاف ہیں ان کا کہنا ہے کہ طالب علموں کی طرح ادیب کو بھی سیاست سے دور رہنا چاہیے۔ ان کے خیال میں سیاست سے بے نیاز ادیب کی تمام تر توجہ صرف اور صرف تخلیق پر ہونی چاہیے۔ ادب اور سیاست کے متعلق دوسری رائے یہ پائی جاتی ہے کہ ادب اور سیاست کا آپس میں براہ راست رشتہ

ہے جسے منقطع کرنا بظاہر ایک ناممکن سی بات ہے۔ فکر و فلسفہ، مذہب اور اخلاق کی طرح سیاست کا شمار بھی ادب کے اہم موضوعات میں ہوتا ہے۔ لیکن ادب کو چاہیے کہ مصلحت کوشی اور پروپیگنڈہ سے کام نہ لے۔ ایسا نہ ہو کہ ادب حکمران جماعت کا آلہ کار بن کے ان کے سیاسی نظریات کی ترویج واشاعت کرتا پھرے۔ ادب کا کام انسانیت کی خدمت ہے۔ ادب اور سیاست کے حقیقی تعلق سے مراد یہ ہے کہ جب سیاسی ریشہ دوانیاں عروج پر ہوں اور انسانیت سسک سسک کر مر رہی ہو تو ادب کو ہاتھ باندھے کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔

جہاں تک ادب اور سیاست کا تعلق ہے تو ان کے مابین تعلق کی نوعیت پر پائی جانے والی دوسری رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ ادب اور سیاست ویسے تو زندگی کے دو الگ الگ شعبے ہیں لیکن ان کے مابین گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ادب کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی ۔ ادب برائے ادب کی حد تک تو سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی جاسکتی ہے تاہم ادب برائے زندگی کا کام ہی زندگی کی ہر سطح پر پائے جانے والے بگاڑ کی اصلاح و نشاندہی کر کے عوام کی زندگیوں کو مزید بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ سیاست کا کام ملک کا نظام چلانا، امن وامان قائم رکھنا اور عوام کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے ان کی زندگی بہتر بنانا ہے لیکن سیاسی میدان میں پائی جانے والی رسہ کشی اور تناؤ کی کیفیت اس مقصد کے آڑے آتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی سیاسی میدان میں بگاڑ کی کوئی صورت پیدا ہوئی ادب نے فوراً محاسبے کے فرائض سر انجام دیتے ہوئے حالات سدھارنے میں اپنا کردار نبھایا۔ اسی طرح ادب میں مثالی ریاست کو سراہنے کی روایت بھی عام ہے۔ وارث علوی نہایت خوبصورت انداز میں اس تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فن کار کا اپنی عصری زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اور اگر اس کے عصری زندگی کے مسائل بنیادی طور پر سیاسی ہیں تو یہ مسائل بھی اس کے ادب میں جھلکتے ہیں۔ انسانوں سے الگ سیاست کا کوئی وجود نہیں اور ادب کا تعلق انسانوں سے ہے اور اس لیے ادب میں سیاست بھی انسانوں کے وسیلے ہی سے آتی ہے۔ (۲)

سماجی حالات وواقعات کی طرح سیاسی اتار چڑھاؤ بھی ادب پر گہرے اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کے لیے خام مال فراہم کرتے ہیں۔ ہر دور کے ادب نے معاصر سیاسی صورتحال کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے اپنے دور کے

سیاسی رویوں کی بھرپور وضاحت کی۔ کسی بھی دور کے ادب سے اس دور کے سیاسی ماحول کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

الف۔ ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" میں عصری شعور کے سیاسی تناظرات

سماج کا ایک حصہ اور ایک ذمہ دار ادیب ہونے کی بنا پر ادا جعفری نے ہم عصر سیاسی صورتحال سے چشم پوشی اختیار نہیں کی بلکہ مکمل ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ ادا جعفری اپنے دور کے سیاسی عمل اور عوام اور ریاست کے مابین تعلق کی نوعیت سے مکمل آگاہ تھیں، نہ صرف آگاہ تھیں بلکہ اس کے واضح اثرات ان کے شعر و ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ ادا جعفری کی آپ بیتی سے بھی سیاست کے اتار چڑھاؤ، عوام اور ریاست کے تعلقات اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ادا جعفری نے اپنی زندگی میں کئی حکومتوں کی تبدیلی دیکھی ان میں برطانوی سامراج بھی تھا اور پاکستان کے پے در پے لگنے والے مارشل لاء بھی۔ "فیلڈ مارشل ایوب خاں، جنرل یحییٰ خاں، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق۔ کیا دیکھا اور کیا دیکھنے کی خواہش ہی رہی یہ سب پاکستان کی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔"(۳) تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ ان کی توجہ سیاسی سطح پر ہونے والے تغیر و تبدل پر بھی رہی۔ انہوں نے ہر دور کی سیاست کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا اور آپ بیتی میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ادا جعفری کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ سیاسی مسائل کا تعلق بھی سماج سے ہے جو عصری مسائل کا ایک اہم حصہ ہیں۔ پس انہوں نے عصری شعور کا ثبوت دیتے ہوئے سیاسی حالات و مسائل سے بھی پردہ اٹھایا۔

I۔ سیاسی نظریات و افکار

ادا جعفری نے عملی طور پر تو سیاست میں حصہ نہ لیا لیکن معاشرے کا ایک حصہ ہونے کی بنا پر اپنے دور کی سیاسی ہلچل سے متاثر ضرور رہیں۔ اس آپ بیتی میں ادا جعفری نے اپنی زندگی کے دوران سامنے آنے والی تمام حکومتوں کا جائزہ لے کر سیاست کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پاکستان کی رنگا رنگ سیاست کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ پاکستان کے لیے جمہوریت سے زیادہ بہتر کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔ ادا جعفری کا خیال ہے کہ صدر ایوب خان کے دور میں ہی سقوط مشرقی پاکستان کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ ان کے خیال میں بنگلہ دیش کی بنیاد کا پہلا پتھر اسی وقت رکھا جا چکا تھا جب صدر ایوب خاں نے سختی کا مظاہرہ کیا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کی جانب پہلا قدم وہی تھا جب ایوب خاں نے ملک کے اندر سیاست پر پابندیاں عائد کی تھیں۔ ملک کے دونوں حصوں میں سیاسی عمل رک جانے کی بنا پر ہی ایسی خلیج حائل ہوئی جس سے علاقائی سیاست نے جنم لیا۔ وہ وحدتِ عمل ختم ہو گئی جس نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ان حالات میں جب ۱۹۷۰ء میں یحییٰ خاں نے عام انتخابات کرائے تو مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان جو دوری پیدا ہو گئی تھی وہ نوشتہ دیوار کی طرح سامنے آئی۔ (۴)

موجودہ دور میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ایک عالمی مسئلہ بن چکا ہے خاص کر ترقی پذیر ممالک میں یہ مسئلہ میں اپنی پوری شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ پاکستان بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں غربت وامارت کے مابین ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ غریب، غریب تر ہوتا چلا جارہا ہے اور امیر کے خزانے مزید بھرتے جارہے ہیں۔ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم اور اقتصادی ناہمواری کا آغاز کہاں سے ہوا اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ بعض افراد اسے مختلف حکومتوں سے وابستہ کرتے ہیں تو بیشتر اسے تقسیمِ ہند اور ہجرت کے ساتھ جوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی مسئلے پر ادا جعفری نے اپنا نکتہ نظر پیش کرتے ہوئے اسے جنرل یحییٰ خاں کے دور سے منسوب کیا۔ ان کے خیال میں دولت اور غربت کے مابین یہ خلیج جنرل یحییٰ خاں کے دور میں حائل ہوئی۔ ”دولت اور غربت کے درمیان قد آدم اونچی دیوار بھی انھیں کے دورِ حکومت میں وجود میں آئی۔ وہ تو اپنے وقت پر رخصت ہو گئے لیکن یہ دیوار اونچی اور اونچی ہوتی گئی۔“(۵) ادا جعفری کا خیال ہے کہ ایک ملک کے سیاسی حالات کی خرابی کا فائدہ ہمیشہ اس کے دشمنوں کو ہوتا ہے۔ ایسے میں مذکورہ ملک کے سیاسی حالات کی خرابی کی رپورٹ نہایت تحقیر بھرے انداز میں شائع کر کے دنیا بھر میں اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ ادا جعفری کے مطابق ایسی رپورٹس غیر ممالک میں مقیم افراد کے لیے اذیت کا باعث بنتی ہیں۔ عام طور پر سیاست کا مقصد عوام کی خدمت، مذہبی اقدار، جمہوری روایات اور ذاتی مفادات و حقوق کا تحفظ ہے لیکن اب یہی سیاست صرف ذاتی مفاد کے لیے مختص ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے خیال میں سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے چلائی گئی گولی کا سفر ابھی تک جاری ہے۔ ادا جعفری کے مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے لیے چلائی گئی گولی اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

کرائے کے قاتل کو توافشائے راز کے خوف سے اسی وقت مار دیا گیا تھا مگر جو گولی اس کے پستول سے نکلی تھی، اس کا سفاکانہ سفر جاری رہا۔ اقدار مجروح ہوتی رہیں، آدرش دم توڑتے رہے، انسانیت قتل ہوتی رہی۔ اور پاکستان میں سیاست کرسیوں کی تقسیم تک محدود ہو کر رہ گئی۔ (۶)

ادا جعفری کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں سیاست اپنا اصل مقصد کھو چکی ہے سیاست کو اب اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سیاسی دوڑ میں حصہ لینے والوں کے لیے اپنی منزل یا ہدف کو پالینا اتنی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ نوبت جھوٹے مقدموں سے ہوتے ہوئے قتل تک بھی جا پہنچتی ہے۔ ادا جعفری نے ریاست ہائے متحدہ میں الیکشن کا زمانہ دیکھا تو دنگ رہ گئیں۔ آزادی اظہار کی تو وہ قائل تھیں ہی لیکن اظہار کی ایسی آزادی ان کے وہم گمان میں بھی نہیں تھی۔ اس پر ادا جعفری نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ٹی وی پر دیے جانے والے بیانات وہاں مقیم ہم پاکستانیوں کے لیے نہایت حیرت انگیز تھے۔ صاحبِ اقتدار صدر کے لیے بلاخوف اور بے جھجک ہر طرح کا اظہار سامنے آ رہا تھا۔ انہیں کسی دھمکی کا خوف تھا نہ کسی دشمنی کا۔ ادا جعفری کے بقول پاکستانی قوم ایسی آزادی اظہار کی ہمیشہ آرزومند ہی رہی ہے۔

ii۔ مفاہمت و مزاحمت کے رویے

ادا جعفری کے ہاں ہمعصر سیاسی رویوں پر کہیں مفاہمتی انداز پایا جاتا ہے تو کہیں مزاحمتی انداز۔ بات دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سیاست کو جہاں کہیں عوامی مفاد سے متصادم پایا، مزاحمتی رویہ اپنایا۔ تاہم سیاسی طبقے کے اختیارات کو متوازن انداز میں عوام کے حق میں استعمال کیے جانے پر انہوں نے بخل یا ذاتی تعصب سے کام لینے کے بجائے اس کے لیے تائید و تحسین میں حصہ لیا۔ ایک وقت تک سیاست میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ مذہب کی آڑ لی جانے لگی۔ لوگوں کے مابین مذہبی تعصبات کی آگ بھڑکا کر سیاسی مقاصد پورے کیے جانے لگے۔ خاص طور پر سادہ لوح پاکستانی مسلمانوں کے سامنے خود کو اسلام کا چیمپیئن بنا کر پیش کرنے کی روایت کو فروغ حاصل ہوا۔ ادا جعفری کا خیال ہے کہ مذہب کسی کی جاگیر نہیں اس کا ٹھیکدار بننے کی

اجازت کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔ ادا جعفری کے مطابق پاکستانی سیاست میں مذہب کو سیاسی پروپیگنڈے کے طور پہ استعمال کرنے کی روش عام پائی جاتی ہے۔ تاہم انہوں نے ایسے مذہب کارڈ کھیلنے کی نہایت صریح مذاحمت کی ہے۔

دہشت گردی ایک ایسا ناسور ہے جو کسی بھی معاشرے میں امن وامان کے نفاذ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ دہشت گردی کا ناسور ہے کہ ایک معمول بن کر پھیلتا ہی چلا جارہا ہے۔ دہشت گردی کی ہر کاروائی پر مذمتیں بھی بہت ہوتی ہیں اور وقتی طور پر اس کے خلاف آوازیں بھی بہت اٹھائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا کوئی مستقل حل نہیں ملتا۔ حکمران طبقہ بھی دہشت گردی کے اس سیلِ بے پناہ کو روکنے میں ناکام رہتا ہے۔ یوں قیمتی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان کا شمار بھی دہشت گردی کا شکار ہونے والے ممالک میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے شہر کراچی کے حالات اس حوالے سے خاصے دگرگوں رہے ہیں۔ ادا جعفری کراچی کے ماحول پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> مگر آج میرے شہروں کو کیا ہو گیا ہے۔ تدریسی اداروں کو زندگی بخشنے والی ہواؤں میں زہر کس نے گھول دیا ہے۔ میری آنکھوں میں آج کراچی کا تعلیمی ماحول بھی ہے جہاں نوخیز ہاتھوں سے قلم چھین کر خوں آشام ہتھیار تھما دیے گئے ہیں۔ جہاں سال میں آٹھ مہینے فسادات کی وجہ سے درسگاہیں بند رہتی ہیں۔ سلامتی اور آشتی کی وراثت کے امین دھوئیں اور شعلوں میں اپنا چہرہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ آج ہمارے بچوں کی آنکھوں سے خوبصورت خواب تک چھین لیے گئے ہیں۔ (۷)

ادا جعفری نے کراچی کو زخمی اور آسیب زدہ شہر قرار دیا ہے جہاں ہر سُو اداسی اور خوف کا عالم طاری رہتا ہے۔

> آج لہولہان کراچی میں بیٹھ کر قیامِ پاکستان کے تاریخ ساز دنوں کو یاد کر رہی ہوں۔ کیسے یقین آئے کہ ایک عالمگیر برادری سے تعلق رکھنے والے وہی لوگ جو آج بھی ایک عظیم فلسفہ حیات کے داعی اور پیروکار ہیں، جو دنیا کے نقشے پر ایک غیر معمولی اور نظریاتی ملک کے معمار ہیں صرف چالیس برسوں میں طمع ان کے دلوں کو تاراج کر سکتی ہے۔ قائداعظم اوران کے جلیل القدر ساتھیوں اور تمام جانبازوں، سرفروشوں نے کب اور کیوں سوچا ہو

گا کہ حصولِ آزادی کے بعد اسلام کے نام لیوا اپنی خوشی سے قبائلی نظام کے اسیر ہو جائیں گے۔ (۸)

ادا جعفری کے ہاں پاکستانی سیاست دانوں کے رویوں پر غم وغصے کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے مطابق پاکستان میں جو بھی سیاست دان آیا اس نے اپنی ہی من مانیاں کیں، پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھا۔

iii۔ سیاسی حالات وماحول پر اظہارات

ادا جعفری کا دور سیاسی کشاکش کا دور تھا جس میں حکومتیں بننے اور ٹوٹنے کا عمل تیزی سے جاری تھا۔ ادا جعفری نے ہندوستان کے سیاسی اتار چڑھاؤ دیکھے اور اس کے نتیجے میں تقسیمِ برصغیر اور فسادات میں ہونے والی خون کی ہولی بھی دیکھی۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ادا جعفری کو نوزائیدہ مملکت میں سیاسی عدم استحکام دیکھنے کو ملا۔ ایک کے بعد ایک لگنے والے مارشل لاء نے بھی ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اسی دور میں سقوطِ ڈھاکہ جیسا دلدوز سانحہ وقوع پذیر ہوا جو پوری پاکستانی عوام کے لیے ایک ذہنی وجذباتی دھچکا تھا۔ ان حالات کے نتیجے میں ہر طرف سیاسی بیداری دیکھنے کو ملی۔ سیاسی بصیرت کی حامل ادا جعفری کے لیے بھی ان حالات سے پہلو تہی ممکن نہ رہی۔ ہم عصر سیاسی ماحول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دور کی بے شمار سیاسی جھلکیاں پیش کیں اور اس پر اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں اُردو ہندی تنازعہ ایک نہایت اہم موڑ تھا۔ ادا جعفری نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اُردو زبان اور مسلمانوں کی شناخت ختم کرنے کی شعوری کوشش تھی۔ دراصل تیرہویں صدی میں اُردو زبان کی ترقی اور ترویج واشاعت کا کام شروع ہوا اور اُردو زبان نہایت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی ہندوستان کی ایک نمائندہ زبان بن کر ابھری ۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُردو زبان حیدر آباد دکن، شمالی ہند، دہلی اور لکھنؤ کی اہم زبان کا درجہ اختیار کر گئی۔ اُردو کی اس بڑھتی ہوئی اہمیت کو بھانپتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کے ذریعے انگریزوں نے بھی اُردو کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ تاہم اُردو کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف کچھ ہندو رہنماؤں نے اس کی مخالفت شروع کر دی، یہیں سے اُردو زبان پر حملے شروع ہوئے۔ ہندو رہنماؤں کی طرف سے مطالبے زور پکڑنے لگے کہ اُردو اور فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کر کے اس کی جگہ

ہندی زبان اور ہندی یا دیوناگری رسم الخط رائج کیا جائے۔ اعتراض یہ پیش کیا گیا کہ اُردو عربی اور قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ ادا جعفری لسانی اور مذہبی تعصب کی آڑ لیے اصل سیاسی عزائم سے آگاہ تھیں۔ ملک کی اسی تعصب زدہ فضا کو پیش کرتے ہوئے اس اُردو ہندی تنازعے کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے اعلان کیا کہ ہندوستان کی زبان "ہندی اتھوا ہندوستانی" ہو گی اور دیوناگری رسم الخط اختیار کیا جائے گا کیونکہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآنی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جس کو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے رائج کیا تھا۔ ادھر سی پی کی حکومت نے ودیا مندر اسکیم کے تحت مسلمانوں کی زبان اور شناخت دونوں کو ختم کرنے کی کوشش شروع کی۔ (۹)

ادا جعفری اس لسانی جھگڑے پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ رخنے اتنے طویل ہوتے گئے کہ نوبت اُردو زبان کے خلاف باقاعدہ ہفتے منانے تک آ پہنچی اور بالآخر آگے چل کر یہی جھگڑے تقسیمِ ہند کی بنیاد بنے۔ ۱۹۴۴ء میں ہندو مہاسبھا کے صدر سوارکر کی جانب سے اُردو کے خلاف ہفتہ منانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جب یہ ہفتہ منایا گیا تو مسلمان شاعر و ادیب اور رہنما خاموش تماشائی نہیں بنے بلکہ انہوں نے اپنی زبان کا بھرپور دفاع کیا۔ ادا جعفری نے مولوی عبدالحق کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے جس طرح اُردو کی اس مخالفت کا جواب دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ادا جعفری نے مولوی عبدالحق کی جانب سے منعقد کی جانے والی انجمن ترقی اردو کانفرنس کو نہایت مفید اور کامیاب قرار دیا۔ ان کے خیال میں مولوی عبدالحق کی کاوش اتنی کامیاب رہی کہ ناگ پور کو بیداری مسلم کی بنا پر جاگ پور کہا جانے لگا۔ ادا جعفری کے خیال میں آگے چل کر ان مذہبی و لسانی جھگڑوں نے دلوں میں ایسی دراڑ پیدا کی کہ ہندو مسلمانوں کا ایک ساتھ رہنا ناممکن دکھائی دینے لگا۔ اور پھر انسانی تاریخ کا ایسا الم ناک سانحہ وقوع پذیر ہوا جس میں ہزاروں انسانی جانوں کا ضیاع شامل ہے۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو گئے جگہ جگہ لاشوں کے انبار لگ گئے۔

> تقسیم ہند کے دوران ہوئے ظلم و بربریت کا جائزہ لیں تو اوراق کی ایک لامنتہا کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس واقعہ سے لوگوں کو نقل مکانی کرنی پڑی، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی، انسانی جان و مال تباہ کر دی گئی، ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے، لوگوں نے انسانی کشت و

خون کا بازار گرم کر دیا۔ یہ اس تقسیم کا ہی اثر تھا کہ جنگِ آزادی میں کندھے سے کندھے ملانے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ (۱۰)

ادا جعفری ان فسادات پر قلم فرسائی کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ قیامِ پاکستان کے وقت جو قتل وغارت گری ہوئی اس سے سبھی واقف ہیں۔ یہ ایسا وقت تھا جب قاتل، مقتول اور ظالم، مظلوم کا فرق ہی مٹ گیا۔ جب ہجرت شروع ہوئی تو بلوائیوں کی زد سے ٹرینیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔

زندگی آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ زمانہ کروٹ بدل رہا تھا مگر کتنی بے رحمی کے ساتھ۔ فسادات کی آگ وقت کا ہاتھ تھامے آگے پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ ۴۶ء میں پہلے بہار میں اور پھر میرٹھ کے قریب گڑھ مک ٹیئر کے میلے میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اور پھر پورا ملک ایک سیلِ بے پناہ میں گھر گیا۔ انتقام در انتقام کا ایک ایسا دائرہ تھا جس میں انسانیت سر برہنہ اور محبت سرمہ در گلو تھی۔ ۴۷ء میں انسان، آگ اور خون، نفرت اور خوف کے جس عفریت سے دوچار ہوا اس کی یاد بھی اذیت ناک ہے۔ شہر شہر گاؤں گاؤں مذہب کے نام پر فسادات ہو رہے تھے۔ مذہب جس کا دوسرا نام انسانیت ہے، محبت ہے۔ موت ارزاں تھی اور کسی مذہب کو پہچانتی بھی نہیں تھی۔ ایک دریائے خوں تھا جسے پار کرنا تھا اور ایک جذبہ تھا جو ہارا نہیں تھا۔ (۱۱)

ادا جعفری ہندوستان کی اس کشیدہ صورتحال پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ کئی علاقے ایسے بھی تھے جہاں ابھی فساد پھوٹے نہیں تھے لیکن خوف وہراس کا عالم وہاں بھی ہر طرف چھایا تھا۔ لوگ حالات سے باخبر رہنے کے لیے ریڈیو سنتے، تاہم سر پر منڈلاتے خطرے کے تحت ریڈیو کی آواز مدھم رکھی جاتی۔ آپس میں باتیں بھی سرگوشیوں کے انداز میں کی جاتیں۔ ادا جعفری کے مطابق اس وقت دوسرے شہروں سے ہندو مسلم فسادات کی خبریں آ رہی تھیں جس کی وجہ سے ان محفوظ علاقوں میں بھی اندیشے جنم لینے لگے۔ خوش اخلاقی، ہمدردی اور خلوص کی جگہ دلوں میں خوف، بدگمانی اور بے اعتباری نے ڈیرے ڈال لیے۔ سر اٹھاتے نئے وسوسوں اور خدشات سے ہندو مسلمانوں کی رفاقتیں بدلنے لگیں۔ لوگ اگلی ہر صورتحال کے لیے تیار رہنے لگے۔ گاندھی کا قتل تو ایک معمہ تھا ہی، لیکن اس قتل کے اعلان نے بھی لوگوں خاص طور پر مسلمانوں کو چونکا کر رکھ دیا۔ جواہر

لعل نہرو کی طرف سے کیے جانے والے اعلان میں قاتل کے لیے استعمال کیا جانے والا پاگل کا لفظ ذو معنی تھا جس پر کئی طرح کا ردعمل سامنے آیا۔ کسی کا خیال تھا کہ حالات کے پیش نظر یہ لفظ ملک کو مزید فساد سے بچانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے تو کسی کا کہنا تھا کہ اعلان کرنے والا کا اشارہ کسی مسلمان کی طرف ہے۔

> پھر ۳۰ جنوری (۱۹۴۸ء) کا دن آ گیا گاندھی جی کے قتل کا دن۔ ریڈیو پر پہلا سرکاری اعلان جو جواہر لعل نہرو نے کیا اس کے الفاظ تھے، باپو کو کسی پاگل نے قتل کر دیا ہے۔۔۔ نہرو نے قاتل کے لیے پاگل کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ کیا کوئی احتیاط مد نظر تھی۔ کیا بھارت کے وزیر اعظم فسادات کی آگ میں مزید ایندھن جھونکنے سے گریز کی کوشش کر رہے تھے۔ کیا واقعی وہ کوئی مسلمان شخص ہی تھا۔ اگر ایسا ہے تو اب انتقامی کاروائی کا سیل بلا کہاں جا کر رکے گا پے در پے سوال جو ہونٹوں تک نہیں آئے ایک بڑے لیڈر کی سفاکانہ موت کے احساس کو بھی دھندلا گئے۔ (۱۲)

فسادات اور ہجرت کے دوران عورت کا دکھ ایک ایسا دکھ تھا جسے اس دور کے ہر ادیب نے بیان کیا۔ عورت نے جہاں اپنوں سے دوری اور ہجرت کا درد برداشت کیا وہیں اسے اجتماعی زیادتی اور آبروریزی کا دکھ بھی سہنا پڑا۔ مسافر قافلوں پر بلوائیوں کے جتھے حملہ کرتے تو قافلے میں موجود مردوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی عورتیں آپس میں تقسیم کر لیتے۔ عورت کا شمار صنفِ نازک میں ہوتا ہے جو ایک کمزور ہونے کی بنا پر ایک نہایت آسان ہدف ہے۔ اور پھر یہ بھی انتقام کی ایک صورت تھی کہ دشمن کی عورتوں کے ذریعے ان کی آئندہ ساری نسلیں ہی اجاڑ دی جاتیں۔

> اس شام بھی آٹھ دس بڑی چھوٹی لڑکیاں ایک عمر رسیدہ عورت کے ساتھ اپنے اپنے گھر واپس پہنچنے کے لیے جلدی جلدی گلی سے گزر رہی تھیں کہ اچانک گلی کے موڑ پر ایک بپھرے ہوئے ہجوم نے انھیں گھیر لیا اور پھر روتی دھوتی، چیختی چلاتی لڑکیاں کرپانوں اور خنجروں کی نوک پر آپس میں تقسیم کی جانے لگیں۔ چادروں کی دھجیاں پاؤں تلے روندی جا رہی تھیں۔ (۱۳)

ان بدنصیب عورتوں کی واپسی نے انہیں ایک نئے دکھ سے ہمکنار کیا۔ غیروں سے تو گلہ تھا ہی لیکن یہ اپنوں کی طرف سے برتی جانے والی بے مروتی اور غیریت بھی تھی جس نے انہیں ایک نئے دکھ سے دوچار کیا۔ دیگر بہت سے ادیبوں کی طرح اداجعفری کے ہاں بھی ان عورتوں کے اس دکھ کا اظہار واضح طور پر ملتا ہے۔ اداجعفری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ان عورتوں نے کئی دکھ برداشت کیے لیکن یہ اپنوں سے دوبارہ ملنے کی چاہت تھی جس نے انہیں زندہ رکھا۔ لیکن پھر دشمنوں کے کئی وار سے بچ نکلنے والی یہ عورتیں اپنوں کے جذباتی وار کو نہ سہہ سکیں۔

> قیامِ پاکستان کے کچھ عرصے کے بعد جب فسادات میں اغوا ہونے والی بدنصیب بیٹیوں کی بازیابی کا سلسلہ شروع ہوا تو حساس دلوں نے کچھ صدمے اور سہے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ غیروں کے ہاتھوں زخموں سے چور چور نڈھال معصومیت کو ایک آخری زخم بھی نصیب ہوا اور یہ آخری بھرپور وار کرنے والے ہاتھ اپنوں کے تھے۔ (۱۴)

اداجعفری کے مطابق سیاسی انقلاب اور ہندو مسلم فسادات کے اسی زمانے میں انسانیت اور انسان دوستی کی بھی بے شمار مثالیں سامنے آئیں۔ جب ہندو بلوائیوں نے دھاوا بول دیا تو فسادات میں گھرے مسلمانوں کو اپنی معیت میں خطرے سے نکال کر محفوظ مقام تک پہنچانے والے ہندو بھی سامنے آئے اسی طرح کئی ایسے ہندو ڈاکٹر سامنے آئے جنہوں نے تعصب سے بالاتر مسیحائی کا فریضہ انجام دیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ سناتے ہوئے لکھتی ہیں کہ فسادات کے اس زمانے میں جب باہر نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا، ایک آٹھ ماہ کے بچے کی طبیعت شدید خراب ہوگئی۔ رات گئے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے ڈاکٹر کا نمبر ملانے پر ایک ہندو ڈاکٹر دستیاب ہوا۔ ڈاکٹر کے پاس بچے کو لانے کی اجازت چاہی گئی تو اس مسیحا نفس انسان نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان حالات میں آپ کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں، میں خود گھر چیک کرنے آرہا ہوں۔ یوں مسلمانوں کو خطرناک صورتحال سے بچانے کے لیے اس نے رات ایک بجے دواؤں اور انجکشن سمیت خود گھر آکر مسیحائی کا فریضہ انجام دیا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اس نوزائیدہ مملکت کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن میں رہائش کا مسئلہ اور سامان کی قلت وغیرہ شامل ہیں بے شمار قربانیوں اور مسائل کے باوجود پاکستانی قوم کے حوصلے بلند تھے۔ اداجعفری نے اسی صورتحال پہ اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دن بڑی بے سروسامانی کے دن تھے۔ ایک نئی مملکت کی اساس رکھی جارہی تھی اور مسائل صف بہ صف سامنے کھڑے تھے جن کے مقابل ایک قوم تھی جس کے حوصلے اور عزم کو مولا کے فضل وکرم نے نصرت بھی عطا کی تھی اورآبرو بھی مشکلات قدم قدم تھیں مگر پیشانیاں شکرانے کے سجدوں سے منور تھیں۔ (۱۵)

آزمائش کے ان دنوں میں پاکستانی قوم کی ہمدردی، خلوص اور بھائی چارے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اداجعفری نے ان جذبات کی تعریف کی ہے۔ اداجعفری کے مطابق رہائش کے مسئلے کے دو حل نکالے گئے:

جب رہائش کے لیے جگہ کا سوال سامنے آیا تو مقامی آبادی نے اپنے گھروں میں بھی جگہ دی اور دلوں میں بھی۔ دست گیری بھی کی گئی اور دل داری بھی۔ رہائش کا مسئلہ ان عارضی ٹھکانوں سے حل ہوا جو جنگ کے زمانے میں فوج کے لیے بنائے گئے تھے۔ ایک ایک کمرے میں پورے پورے خاندان رہائش پذیر تھے۔ (۱۶)

پاکستانی عوام کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اداجعفری نے یہ بات بھی باور کرائی ہے کہ اس ملک میں کتنے عرصے تک دستور سازی کا کام پس پشت ہی رہا۔ آئین کی کمی پر عوام میں بے چینی واضطراب کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ عوام آئین کے منتظر تھے لیکن یہ ایسا مسئلہ بن گیا کہ اگلے کئی سال تک حل ہی نہیں ہو سکا۔ جیسے جیسے آئین سازی میں تاخیر ہوتی گئی مسائل بڑھتے گئے اور عوام حکومت سے بد دل ہوتے چلے گئے۔ پہلے مارشل لاء کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ نوزائیدہ مملکت ابھی سانس بھی نہیں لینے پائی تھی کہ اس پر ایک نئی افتاد ٹوٹ پڑی۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے جمہوری روایات کے حامل ملک میں مارشل لاء کا نفاذ یقیناً ایک ذہنی وجذباتی دھچکے سے کم نہیں تھا۔

ایوب خاں کے مارشل لاء کا دور ۵۸ء میں شروع ہوا۔ ملک کا آئین منسوخ ہو چکا تھا اور طاقت وجبروت کے مظاہرے کے لیے پہلا ہدف پرانے تجربہ کار آئی سی ایس افسران کو بنایا گیا تھا۔ ان کی ملازمت کے قوانین میں تبدیلی کی گئی اور پھر ان کی کارکردگی کا جائزہ لینے

کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے سربراہ جنرل برکی اور ممبران میں محمد شعیب اور جنرل شیخ تھے۔ (۱۷)

ادا جعفری کے خیال میں اس معاملے میں نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے کچھ غیر قانونی فیصلے بھی کیے گئے۔ اس کمیٹی نے ملازمین کی کارکردگی کا جائزہ لے کر بہت سے لوگوں کو نااہل کیا۔ اس بارے میں ادا جعفری اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ کچھ لوگوں کی نااہلی کے فیصلے رسمی کاروائی سے بہت پہلے ہی ہو چکے تھے۔ ادا جعفری کے خیال میں ظفر الاحسن لاری جیسے اہم سینئر ابو طالب نقوی، عباس خلیلی تھی اور فضل احمد کریم فضلی جیسے اہم سینئر بھی شامل تھے، جن پر بغیر ثبوت کے نااہلی اور عہدے کے ناجائز استعمال کا الزام عائد کر کے انہیں برطرف کر دیا گیا۔ ادا جعفری نے اس احتساب پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے خاموش احتساب قرار دیا ہے۔ دراصل بعد میں آنے والی حکومتوں میں احتساب کم اور چرچا زیادہ ہوا لیکن صدر ایوب خاں کے احتساب میں صرف احتساب ہی پر توجہ مرکوز کی گئی۔ ادا جعفری نے رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا احتساب تھا جس نے آئندہ حکومتوں کے لیے بھی احتساب کی ایک باقاعدہ روایت بنا دی۔ ادا جعفری نے صدر ایوب خاں کے دور حکومت پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے معاشی ترقی اور امن وامان کا دور قرار دیا۔ ادا جعفری صدر ایوب خاں کے دور کی اقتصادی ترقی کی معترف ہیں۔ ان کے مطابق جس وقت ایوب خاں نے مارشل لاء لگایا، ملک میں معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا، حکومت قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اور غیر ملکی زرمبادلہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن صدر ایوب کے پنج سالہ معاشی منصوبے اور موثر اقدامات کی وجہ سے ملک کے حالات کافی بہتر ہوئے۔ اس مارشل لاء کی وجہ سے صنعتی پیداوار میں دس فیصد اضافہ ہوا، اس کے چھوٹی صنعتوں اور زرعی پیداوار کو بڑھانے پر بھی توجہ مرتکز کی گئی اور ٹیوب ویلوں اور بڑے ڈیموں کی تعمیر پر بھی ایک بڑی رقم مختص کی گئی۔ اسی دور میں دیہی علاقوں کو شہروں سے ملانے کے لیے سڑکوں کی تعمیر کا کام عمل میں لایا گیا اور صنعتی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے منگلا، وارسک، تربیلا اور سوئی گیس پاور اسٹیشن ملتان جیسے اہم منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچائے گئے۔ لکھتی ہیں:

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانے میں بہر حال اقوامِ عالم میں ہمارے ملک کا وقار قائم رہا تھا۔ ان کے دور میں ملکی صنعتوں کو بھی فروغ ملا جس کے ساتھ ہی کسی ملک کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ وقتی طور پر امن وامان بھی تھا اور لوگ خوش بھی تھے۔۔۔ ایوب خاں کا دورِ حکومت امن وامان کے لحاظ سے یقیناً اچھا رہا تھا۔ (۱۸)

اداجعفری کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کیونکہ صدر ایوب خاں کا دور معاشرتی برائیوں کے خلاف جنگ کا دور سمجھا جاتا ہے جس میں معاشرے کی متعدد برائیوں کے خاتمے کے لیے نہایت اچھے اقدامات کیے گئے۔ اس سے قبل لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور ایک دوسرے کا مال ہضم کرنے میں مصروف تھے۔ ملک میں غیر قانونی اسلحہ کی فراوانی تھی۔ ہر طرف ٹیکس چوری، سمگلنگ اور ملاوٹ کا دور دورہ تھا اپنے کالے دھن کو چھپانے کے لیے رشوت سے کام لیا جاتا تھا۔ صدر ایوب خاں نے ملکی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے پہلا کام معاشرتی برائیوں کے سدباب کا کیا۔ ملاوٹ کرنے والوں کو جرمانہ عائد کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اسماعیل سمگلر اور قاسم بھٹی جیسے بدنام زمانہ ڈاکوؤں کی فوراً گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ صدر ایوب خاں کے دور میں بنیادی جمہورتوں کا ایک نظام تشکیل دیا گیا تاہم عوام اس برائے نام جمہوریت کی حقیقت سے واقف تھے اور اسے زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔

خود صدر ایوب خاں اس جمہوریت کے بارے میں لکھتے ہیں:

حالات کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مغربی پارلیمانی طرز کی جمہوریت یہاں نہیں چل سکتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بنیادی جمہوریت کی شکل قائم کی، جس میں وہی نمائندے اوپر آسکتے ہیں جو عوام کے سچے خادم ہوں اور ان کے اعتماد کے اہل ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ کچھ ملک اسے اپنا رہے ہیں۔ (۱۹)

صدر ایوب خاں سے پہلے ملک میں پارلیمانی نظامِ حکومت رائج تھا جس کے تحت عوام ووٹوں کے ذریعے نمائندے منتخب کرتے۔ لیکن صدر ایوب خاں نے ایک نیا نظام رائج کیا جو بنیادی جمہورتوں کا نظام کہلاتا ہے۔ بنیادی جمہورتوں کا نظام دراصل چند مخصوص مقاصد کی خاطر عمل میں لایا گیا تھا، جس کے تحت بنیادی جمہورتوں کو

انتخابی ادارے کی حیثیت دیتے ہوئے نیم عدالتی اختیارات دے دیئے گئے۔ اس نظام پر یہ اعتراض سامنے آیا کہ اس میں ایک تو اختیارات مرتکز ہو گئے ہیں، دوسرا اس نظام میں بے جا سرکاری مداخلت نے اس کی کارکردگی کو بہت متاثر کیا۔ ادا جعفری اس نظام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "اپنی حکومت کو قیام و دوام بخشنے کے لیے ایوب خاں نے جمہوریت کا خود ساختہ ڈانواں ڈول ڈھانچہ بھی بنیادی جمہوریت کے نام سے متعارف کیا تھا۔ جسے لوگوں نے دل سے کسی وقت بھی قبول نہیں کیا۔" (۲۰) بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ادا جعفری نے صدر ایوب خان کے دور کا ہر لحاظ سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس دور کی سیاست کا جائزہ لیتے ہوئے سیاست کے معیشت سماج وغیرہ اثرات بیان کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ادا جعفری نے اس حکومت کی کارکردگی پر عالمی دنیا میں قائم ہونے والے تاثر پر بھی روشنی ڈالی۔ یہ تمام باتیں ادا جعفری کے سیاسی شعور پر دلالت کرتی ہیں۔ ادا جعفری کے مطابق صدر ایوب خان کے دور میں اقتصادی اور معاشی ترقی تو خوب ہوئی امن وامان بھی رہا لیکن اس مارشل لاء کے آخری دن مار دھاڑ اور خونریزی کے ثابت ہوئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عوام اس دس سالہ طویل مارشل لاء سے بیزار ہو چکے تھے، دوسرا ملک کی امن وامان کی صورتحال خراب کرنے میں ملک دشمن عناصر کا بھی بڑا ہاتھ رہا۔ لوگ صدر ایوب خاں کے اس قدر خلاف ہو چکے تھے کہ نوبت باقاعدہ مظاہروں تک آچکی تھی۔ لکھتی ہیں:

> تھوڑے ہی دنوں بعد وطنِ عزیز سے انتشار اور بدامنی کی خبریں آنا شروع ہوئیں جو ہمارے صاحبانِ اقتدار کی بے ضمیری اور بے ہنری دونوں کا آئینہ بن کر پوری دنیا کے سامنے آئیں ۔ جن کی انتہا بصد سامان رسوائی ایک اور مارشل لاء کی ابتدا تھی۔ اس وقت یہ اندازہ تو کسی کو نہیں تھا کہ آمریت کے اندھیرے اہانت، نفرت اور خوں ریزی کے ساتھ ہزیمت بھی اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ (۲۱)

صدر ایوب خاں ایک صاحبِ نظر اور صاحبِ بصیرت حکمران تھے جو ملکی حالات سے ہر وقت باخبر رہتے۔ وہ جان چکے تھے کہ عوام کی اکثریت ان کے خلاف ہو چکی ہے۔ انہیں جیسے ہی اپنے خلاف ہونے والے مظاہروں اور اکا دکا فساد کی اطلاع ملی انہوں نے عوام کے جان ومال کے لیے فوراً استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح اس حکومت کا خاتمہ ایک اور مارشل لاء پر ہوا۔

ایوب خاں کو انسان کی زندگی اور اس کی قدر و قیمت کا پاس لحاظ بھی اتنا تھا کہ جب عوام نے ان کے خلاف مظاہرے کیے اور ان مظاہروں میں جاں کازیاں بھی شامل ہو گیا تو انہوں نے فوراً مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ (۲۲)

ادا جعفری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ صدر ایوب نے مستقی ہونے کا فیصلہ تو کر لیا لیکن دستور کے مطابق اسپیکر کو اختیارات تفویض نہیں کیے بلکہ ملک ایک اور مارشل لاء کے حوالے کر دیا۔ ادا جعفری نے دوسرے مارشل لاء کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ صدر ایوب خاں نے ملک جنرل یحیٰی خاں کے حوالے کیا جن کے مشاغل کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ دراصل جنرل یحیٰی خاں ایک بھاری شرابی کے طور پر جانے جاتے تھے جن کی عورتوں میں دلچسپی بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ادا جعفری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جب صدر ایوب خان نے جنرل یحیٰی خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خاص کر جب سقوطِ ڈھاکہ کا اندوہ ناک سانحہ وقوع پذیر ہوا تو ان کی معزولی اور اس نئے تقرر پر تمام لوگوں میں یہ تاثر دیکھنے میں آیا جیسے صدر ایوب خاں نے پوری قوم سے اپنے معزول ہونے کا انتقام لیا ہو۔ خود ادا جعفری نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ملک جنرل یحیٰی خاں کے حوالے کرتے ہوئے صدر ایوب خاں نے کسی انتقام یا بد دیانتی کا ثبوت نہیں دیا۔ دراصل انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور ملک ان کی سیاسی بے بصیرتی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یوں صدر ایوب خاں کے دور میں جو ترقی ہوئی تھی وہ خود انہی کے ہاتھوں تنزلی میں بدل گئی۔

ایوب خان کی خارجہ پالیسی نے بے شک ملک کو عالمی سطح پر قابلِ ذکر حیثیت تک پہنچا دیا تھا لیکن حیثیت کو جو استحکام حاصل ہوتا وہ انہی کی سیاسی بے بصیرتی کی نذر ہو گیا۔ اس میں بد دیانتی کا دخل نہ سہی، لیکن اپنے دورِ حکومت میں ایوب خاں وطنِ عزیز کی پاک مٹی میں کچھ ایسے بیج بو گئے جن کا تلخ پھل بعد میں ہمارا مقدر بنا۔ سب سے بڑی بد نصیبی تو ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل کی ہوئی اس نظریاتی مملکت کا دو ٹکڑے ہو جانا ہے۔ (۲۳)

ایک مارشل لاء کی حد تک تو بات کسی قدر قابلِ قبول تھی لیکن اسلامی جمہوریہ کے نام پہ حاصل کیے گئے نئے ملک میں آغاز ہی سے پے در پے لگنے والے مارشل لاء دنیا بھر میں پاکستان کی جگ ہنسائی کا باعث بنے۔ اس پر

مستزاد یہ کہ نوزائیدہ مملکت کو سالوں آئین کی کمی کا سامنا رہا۔ جنرل یحییٰ خاں نے آتے ہی آئین کا خاتمہ کر کے ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ کر دیا اور مرکزی کابینہ اور قومی اسمبلیوں کو توڑ دیا۔ اس پر عوام کی طرف سے بار بار یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو دوبارہ بحال کیا جائے لیکن یحییٰ خاں نے اسے بحال کیا نہ ہی نئی آئین سازی کی۔ یوں وہ اپنی من مانی کرتے ہوئے ملک کو بغیر کسی آئین کے ہی چلاتے رہے۔ پاکستان کی اس سیاسی صورتحال پر عالمی دنیا کے رد عمل کی نشاندہی بھی کی ہے ایک جگہ لکھتی ہیں:

> یحییٰ خان کے لائے ہوئے مارشل لاء کی خبر ہم نے واشنگٹن میں سن لی تھی۔ اور پھر نیو یارک ٹائمز میں ان کی نجی زندگی اور مشاغل کے بارے میں جس تحقیر آمیز لہجے میں تفصیل شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی پڑھی تھی لکھنے والے نے کیا کچھ نہیں لکھ دیا تھا۔ سب سے بوجھل حقیقت تو یہی تھی کہ جیسے تیسے جمہوریت کے لیے راہ نکلتے نکلتے ملک ایک بار پھر ایک آمر کے شکنجے میں تھا اور آئین منسوخ ہو چکا تھا۔ (۲۴)

ایک زمانے میں "نوکر شاہی" کا لفظ زبان زد عام تھا۔ یہ اصلاح برطانوی دور حکومت کی پیداوار ہے۔ نوکر شاہی ایک خاص ذہنی کیفیت کا نام ہے، جس کے تحت تمام سول سرونٹس ایک دباؤ کا شکار تھا اپنا کام ایمانداری سے کرنے کے بجائے ان کی تمام تر کوششیں اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے ہوتیں۔ اسی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے قائداعظم نے قیامِ پاکستان کے وقت فرمایا کہ اب کسی سول سرونٹ کو کسی کے رعب میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پاکستان کی عظمت اور وقار کی سربلندی کے لیے سول سرونٹس کو ملک اور عوام کے حقیقی خادم کے طور پر کام کرنا ہو گا۔ بعض ازاں "نوکر شاہی" کا یہی یہ لفظ جنرل یحییٰ خان کے دور میں بہت مقبول رہا۔ اس لفظ کا استعمال ان بیوروکریٹس اور سرکاری ملازمین کے لیے ہوتا تھا جو اپنی ذمہ داری سے زیادہ شاہ کی وفاداری نبھانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے یہ سرکاری ملازمین سیاستدانوں سے وابستگی کی بنا پر کئی دھڑوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ سیاسی پسند و ناپسند کی بنا پر ان کے کئی گروہ وجود میں آ چکے تھے۔ یہ وہ ملازمین تھے جو مفاد پرستی اور سیاسی دباؤ کا شکار تھے اور اعلیٰ عہدوں پر تقرری کی خاطر سیاسی دلچسپیوں اور چاپلوسی کی آڑ لیتے۔

> یحییٰ خاں ہی کا دورِ آمریت تھا جب اخباروں میں "نوکر شاہی" کا لفظ خاص طور پر بڑے تسلسل اور تواتر سے استعمال ہونا شروع ہوا۔ کسی جماعت یا گروہ میں تمام لوگوں کے اعمال

وافعال یکساں نہیں ہوتے۔ ہو ہی نہیں سکتے مگر یہاں تمام آئینوں میں ایک ہی رخ دیکھنے پر اصرار تھا۔ (۲۵)

یحییٰ خان کے دور میں "تھری ناٹ تھری" نامی ایک اصطلاح بہت مشہور ہوئی۔ تھری ناٹ تھری ویسے ایک مشہور زمانہ رائفل کا نام ہے۔ انگریزی زبان میں تین کے لیے تھری اور صفر کے لیے ناٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے چونکہ اس رائفل کی نالی کے دہانے کا قطر بھی اعشاریہ تین صفر تین (۳۰۳) انچ کا ہوتا ہے لہذا اسے تھری ناٹ تھری کا نام دیا گیا۔ لیکن بعد میں یہی نام ایک خاص اصطلاح بن کے ابھرا جس کا اطلاق احتساب پر کیا جانے لگا۔ جیسے تھری ناٹ تھری معاشرے سے ناسوروں کا خاتمہ کرتی تھی اسی طرح حکومتِ وقت نے بھی معیشت کو کرپٹ لوگوں سے پاک کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت بھی چونکہ ۳۰۳ افراد کو احتساب کے لیے گھیرے میں لیا گیا، لہذا اسے "تھری ناٹ تھری" سے تعبیر کیا گیا۔ ادا جعفری اس مشہور زمانہ اصطلاح اور احتساب پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> یحییٰ خاں کے زمانے میں سرکاری عہدیداروں کو برطرفی کے حکم نامے رمضان کے آخری عشرے میں عید سے چند روز قبل وصول ہوئے۔ اس برطرفی کے لیے تین سو تین کی گنتی مقرر ہوئی تھی۔ (تھری ناٹ تھری جو ایک قسم کی رائفل کو کہتے ہیں) ایک مطلق العنان آمر کی طاقت کی علامت۔ ان لوگوں کو پنشن کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ (۲۶)

ادا جعفری لکھتی ہیں کہ احتساب جس کا آغاز ایوب خاں کے دور سے ہوا، بعد میں آنے والی حکومتوں میں بھی نہایت شد و مد سے جاری رہا لیکن یہ صورتحال ہر دور میں ہی اعصاب شکن رہی۔ اس احتساب نے عوام کو ذہنی اور جذباتی طور پر نہایت دکھ اور تکلیف میں مبتلا کیے رکھا۔ ادا جعفری لکھتی ہیں کہ احتساب کی وجہ سے لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ ملازمتوں کا رہا سہا تحفظ بھی ختم ہو گیا۔ بچے کھچے لوگوں کے سر پر بھی یہ اندیشے منڈلانے لگے کہ ہمارا نام بھی جانے کب اس فہرست میں شامل ہو جائے۔ ادا جعفری لکھتی ہیں کہ اس احتساب کے لیے کرپٹ لوگوں کے ساتھ ساتھ دیانت دار اور صاحب کردار لوگ بھی منتخب کر لیے گئے جس سے ان شریف النفس لوگوں کی عزتِ نفس مجروح ہوئی۔

ادا جعفری کے ہاں جنرل یحییٰ خان کے احتساب پر مزاحمتی انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ ادا جعفری نے خاص طور پر جنرل یحییٰ خاں کے احتساب کو ایک زہریلا دکھ قرار دیتے ہوئے اسے ان کی آزار پسند ذہنیت کا آئینہ قرار دیا۔ ادا جعفری کے خیال میں جنرل یحییٰ خاں کی نخوتِ حکمرانی کے آگے انسان کی عزت نفس کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ ادا جعفری جنرل یحییٰ خاں کے دور سے مطمئن نظر نہیں آتیں۔ ان کے خیال میں جنرل یحییٰ خان کا دور تاریکیوں اور اندھیرے کا دور تھا۔ تاریکیوں اور اندھیروں بھرے اس دور کا خاتمہ سقوطِ مشرقی پاکستان پر ہوا۔ اس آپ بیتی میں تقسیمِ بنگال کے حالات و واقعات، مسائل اور اس کے نتیجے میں در آنے والے ذہنی خلفشار کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے سقوطِ ڈھاکہ کے حالات و محرکات کے مطالعے و محاسبے میں ادا جعفری نے نہایت دلسوزی سے کام لیا ادا جعفری سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے نہایت حزن کا شکار رہیں جس کے واضح اثرات ان کی آپ بیتی پہ بھی مرتب ہوئے "جو رہی سو بے خبری رہی" میں لکھتی ہیں کہ ابھی تو پہلی تقسیم کا غم تازہ تھا کہ ایک اور صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ادا جعفری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ مشرقی پاکستان میں غربت زیادہ تھی جو گلیوں کوچوں اور چہروں سے ہی صاف عیاں تھی ، پھر انہیں آئے دن موسمی آفات کا سامنا رہتا۔ وہاں کے عوام سیاسی طور پر بھی بیدار تھے لہذا اپنی زبوں حالی کا احساس بھی موجود تھا۔ ادا جعفری کا کہنا ہے احساسِ محرومی کا شکار ان لوگوں کو جب سیاست دانوں نے ایک بھرے پیٹ، اچھے مستقبل اور بہتر زندگی کے خواب دکھائے تو انہوں نے تمام حدیں پار کر لیں اس کے لیے بھی بنیاد زبان کو بنایا گیا۔ لسانی تعصب کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"بنگالی اصحاب اُردو بولنا تو درکنار اُردو سمجھنا تک نہیں چاہتے تھے۔ ہم پاکستانی جب ان محفلوں میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے یا کھڑے ہوتے تو آپس میں گفتگو انگریزی زبان میں ہوتی۔"[۲۷] ادا جعفری کو تقسیمِ پاکستان کے پیچھے کارفرما عوامل کا بھی مکمل اندازہ تھا سقوطِ ڈھاکہ کی وجوہات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> بنیاد بھوک تھی ۔ بے یقینی تھی اور ہر قسم کی ناانصافی کا احساس تھا۔ بدقسمتی سے وہ مفاد پرست طبقہ آج بھی ہمارے ملک میں موجود ہے لیکن اس وقت مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے اکثریتی حصہ تھا اور یہاں کے مقابلے میں عام سیاسی بیداری بھی وہاں زیادہ تھی۔ ان کا احتجاج سیاسی اور اقتصادی تسلط کے خلاف تھا مگر قضیہ زبان کے نام پر شروع ہوا۔ وہی

زبان جس کا وجود-وجودِ پاکستان کے جواز میں شامل تھا۔ اسی زبان کے نام پر دلوں میں میل آنا شروع ہوا۔ (۲۸)

ان کے خیال میں زبان کو تو صرف ایک وسیلہ بنایا گیا، اصل وجہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کی غربت اور حقوق سے محرومی تھی جس نے ان لوگوں میں محرومی کا احساس پیدا کیا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

یہ مشرقی پاکستان کا احساس محرومی اور اپنی حق تلفی کا یقین تھا جو اظہار پر مجبور ہو رہا تھا اور اس کے لیے بہانے تراش رہا تھا۔ ہمارے بسے بسائے گھر میں زبان یہ بہانہ بن گئی۔ جس کا پہلا مظاہرہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مشرقی پاکستان میں ہوا تھا۔ ورنہ اُردو، اُردو تو آج تک موجودہ پاکستان میں بھی سرکاری زبان نہیں بن سکی ہے۔ (۲۹)

ادا جعفری سقوطِ ڈھاکہ پہ دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ چمن آرائی خاصا مشکل کام ہے خاص کر وطن کی چمن آرائی نسلوں کی محنت، لگن اور ایثار مانگتی ہے جبکہ اسے خاکستر کرنے کو ایک چنگاری ہی کافی ہوتی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے سیاسی ماحول پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک نہایت کشیدہ اور تناؤ بھرا ماحول قرار دیا ہے۔ ادا جعفری کے مطابق رویوں میں پہلے سی اپنائیت نہ رہی اور برتاؤ میں واضح غیریت برتی جانے لگی:

میں ڈھاکہ جاتی رہتی تھی یہ وہی ڈھاکہ تھا جہاں ملنسار دوست تھے جہاں سیدھے سادے محنت کش عوام رہتے تھے۔ لیکن اب بنگالی دوستوں کے طرزِ تپاک اور عام دوستوں کے اندازِ فکر میں کئی سال سے بہت واضح فرق نظر آ رہا تھا۔۔۔ اب ان تمام دوستوں اور ساتھیوں کے برتاؤ میں جو نمایاں تبدیلیاں آ رہی تھیں انہیں محسوس کرنے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔ بظاہر ملاقات بھی رہتی اور درمیان میں نوکِ خنجر کی طرح چبھتی ہوئی ایک غیریت بھی کہیں سے آ گئی تھی۔ (۳۰)

ادا جعفری ماحول پر اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ مشرقی پاکستان کے تعلیمی ادارے اور درسگاہیں بھی اس تعصب کی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔ لوگ تعلیمی اداروں اور درسگاہوں کے قریب سے گزرنے اور طالب علموں کا سامنا کرنے سے گریز کرنے لگے۔ بالخصوص عورتوں اور بچوں کے معاملے میں خاص احتیاط برتی جانے لگی اور

متبادل کے طور پر ایسے راستے اختیار کیے جانے لگے جہاں ان کی مد بھیڑ طالب علموں سے نہ ہو۔ ادا جعفری کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کیونکہ مشرقی پاکستان میں ہندو مسلمان دونوں رہائش پذیر تھے لیکن وہاں کے ۹۵ فیصد تعلیمی ادارے ہندوؤں کی ملکیت میں تھے۔ ان اداروں میں ایک باقاعدہ مقصد کے تحت مسلمانوں کی برین واشنگ کی جاتی تھی۔ ان اداروں میں مسلمان بچوں کو روحانی تعلیم کے بجائے مادیت پرستی کی طرف مائل کیا جاتا۔ ہندوؤں کی ساز باز سے یہ مسلمان نہایت تھوڑی تعلیم حاصل کر کے تلاشِ معاش کے لیے نکل جاتے۔ کم تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر سرکاری نوکری کا حصول مشکل ہوا تو ان میں اشتعال پیدا ہوا، جس نے سقوطِ ڈھاکہ کے وقت اپنا رنگ دکھایا۔

> کیا مائیں اپنے بچوں سے خوفزدہ ہوتی ہیں۔ یہ درسگاہیں ہیں۔ کیا تعلیم و تہذیب کا جنازہ بھی یہیں سے اٹھے گا؟ ان مقامات کا درجہ تو عبادت گاہوں سے کم نہیں ہوتا۔ اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ اس ملک میں اور خصوصاً کراچی میں اقدار اور انسانیت کے جنازے اتنے تسلسل اور تواتر سے نکلیں گے کہ لوگ حیران ہونا بھی چھوڑ دیں گے۔ وہ ۱۹۷۰ء تھا۔ (۳۱)

ادا جعفری نے سیاسی کشاکش کے اس ماحول میں بھی پاکستان سے محبت رکھنے والے بنگالیوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان کے مطابق نفرت بھری اس فضا میں ایسے بنگالی بھی موجود تھے جو اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک کو اب بھی حقیقتاً عطیہ خداوندی سمجھتے تھے۔ یہ لوگ اب بھی اس ملک کو اپنی دعاؤں کے نتیجے میں عطیہ خداوندی گردانتے تھے۔ نظریہ پاکستان پر یقین رکھنے والے اور پاکستان ہی کو اپنا گھر سمجھنے والے یہ لوگ وقت کی چارہ گری کے انتظار میں تھے لیکن ملک کے معاشی اور سیاسی حالات کے آگے بے بس ان لوگوں کی ایک نہ چلی۔ ادا جعفری کے مطابق مجبوراً انہیں بھی بپھرے ہوئے مشتعل ہجوم کا ساتھ دینا پڑا۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ادا جعفری نے جنرل یحییٰ خاں کے دور کے صرف تاریک پہلو بیان کیے ہیں۔ جنرل یحییٰ خاں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے اس دورِ حکومت کو اندھیروں اور تاریکیوں کا دور قرار دیا ہے۔ جس میں سب سے بڑا، دل دہلا دینے والا اور اندوہ ناک سانحہ، سانحہ مشرقی پاکستان سامنے آیا۔ جنرل یحییٰ خاں کے بعد ادا جعفری نے جنرل ضیاء الحق کا دور بھی دیکھا جسے انہوں نے ایک نہایت بے رحم حکمران قرار دیا ہے۔ ادا جعفری ان کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ضیاء الحق بظاہر چہرے پر

ایک گہری مسکراہٹ سجائے رکھنے والا ایسا گہرا انسان تھا، جس کی زیرِلب مسکراہٹ کے پیچھے چھپے عزائم جاننا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ادا جعفری ضیاء الحق کی خوش اخلاقی کی قائل دکھائی دیتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ جنرل ضیاء الحق میں بظاہر تکبر اور گھمنڈ نہیں تھا، نہایت خوش اخلاقی سے ملتے۔ اسی طرح ضیاء الحق حکومت کے مسائل اور افسران کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ میٹنگ کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح ان کی ایک اور عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ضیاء الحق ایمان دار افسران کی امانت داری کا اعتراف بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے اور یہ اعتراف وہ عام طور پر بھری محفل میں ہی کرتے۔ ادا جعفری نے ضیاء الحق کی طرف سے ذوالفقار علی بھٹو کو دی گئی پھانسی کا سرسری سا ذکر کیا ہے یا پھر ضیاء الحق کی شخصی خصوصیات پر اپنی رائے پیش کی۔ تاہم جنرل ضیاء الحق کے دور پر سیاسی نکتہ نظر سے اپنی رائے کا زیادہ اظہار نہیں کیا۔

ب۔ کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں عصری شعور کے سیاسی تناظرات

کشور ناہید اپنے عہد کی سیاست اور اس کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھیں۔ قلمی میدان میں انہوں نے سیاسی موضوعات پر کھلم کھلا لکھا اور بے تکان بات کی۔ یہاں تک کہ مارشل لاء میں بھی قلمی اظہار پر جمود طاری نہ ہونے دیا۔ اس سلسلے میں انہیں حکومت وقت کی طرف سے سختیاں بھی جھیلنی پڑیں ان پر کڑی نظر رکھی جانے لگی اور ملنے جلنے والے یہ کہہ کر ملنے سے کترانے لگے کہ آپ سے میل جول کی بنا پر اب ہم بھی نظروں کے تعاقب میں آتے ہیں۔ کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں معاصر سیاسی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے بالکل غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز واقعات، طبقاتی کشمکش کے تناظرات، ہجرتوں کے احوال، زوال پذیر فیوڈل معاشرہ، ہر عہد اور سماج کا نقش جس کامیابی سے بٹھایا ہے وہ ان کے سیاسی شعور کا بہترین ثبوت ہے۔

i۔ سیاسی نظریات وافکار

کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" ان کے سیاسی نظریات وافکار کی مکمل آئینہ دار ہے۔ اس آپ بیتی سے تقسیمِ ہند کے المیہ کی صدا بھی آتی ہے اور مشرقی پاکستان کے المیے، بربریت اور وحشت کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ کشور ناہید کا خیال ہے کہ انسانیت کا تعلق سرحدوں سے نہیں انسانیت کسی کی بھی معراج ہو سکتی

ہے۔ کشور ناہید سیاست میں جمہویت کی قائل ہیں۔ ان کے خیال میں مارشل لاء ایک بدترین نظامِ حکومت ہے۔ کشور ناہید کو مختلف ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں انہیں آزادی رائے کے حق نے بہت متاثر کیا ان کے خیال میں یہ حق ہر فرد کا بنیادی حق ہے ۔اس آپ بیتی میں کشور ناہید نے ہر دورِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے ذاتی افکار وخیالات کا اظہار کیا جو ان کی سیاسی بصیرت کی گواہی دیتا ہے۔

ii۔ مفاہمت ومزاحمت کے رویے

کشور ناہید کے ہاں پاکستانی سیاست کے عدم استحکام پر مزاحمتی رویہ پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی سیاست عدم استحکام کی نظر ہوگئی جس سے عالمی سطح پر پاکستان کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ کشور ناہید کی بات بالکل بجا ہے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک چار گورنر جنرل (قائداعظم محمد علی جناح، خواجہ ناظم الدین، ملک غلام محمد، سکندر مرزا) اور ۴ وزیر اعظم (لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین محمد علی بوگرہ اور چودھری محمد علی) مسند اقتدار پر متمکن ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء کے مختصر عرصے میں یکے بعد دیگرے تین حکومتیں اس طرح تبدیل ہوئیں کہ ایک بھارتی لیڈر نے طنز کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا کہ میں اتنے عرصے میں اتنی دھوتیاں نہیں بدلتا جتنے عرصے میں پاکستان میں وزیر اعظم بدلے جاتے ہیں۔ کشور ناہید نے بار بار بدلتی حکومتوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے ملکی ترقی کے لیے ایک بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ کشور ناہید لکھتی ہیں کہ جس معاشرے کے عوام نے اپنی زندگی کے پچاس سالوں میں ۲۷ حکومتوں کی تبدیلیاں ہوتی دیکھی ہوں وہاں قوم کے المیے کو زبان دینے کے لیے ساختیات اور تخلیق کی نئی جمالیات تلاش کرنی پڑتی ہے۔ کشور ناہید مارشل لاء کے خلاف مزاحمتی رویہ اپناتے ہوئے جمہوریت کی طرف مائل دکھائی دیتی ہیں۔

> جب ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک میرے اوپر سی-آئی-ڈی لگی رہی۔ ایک موٹر سائیکل میرے آگے اور ایک جیپ میرے پیچھے چلتی تھی۔ مجھ جیسی نہتی اور بڑبولی عورت مارشل لاء پہ غصہ اتارنے کو بس نظمیں ہی تو کہہ رہی تھی اور ہم لوگ کر بھی کیا سکتے تھے کہ ہمارے سامنے ہر عمل جو ناروا تھا اور ہر ظلم جو ناممکن تھا، عذابِ بے اماں کی طرح مسلط تھا۔ البتہ یہ دن ایک اور طلسم کو آئینہ دکھا گئے۔ بہت سے دوست ملنے، گھر یا دفتر آنے سے

معذرت کر گئے کہ گاڑی کا نمبر نوٹ کیا جاتا ہے۔ (۳۲)

کشور ناہید کو سیاسی نظمیں کہنے کے جرم میں مسلسل نگرانی کی سزا کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے میں ان کے ساتھی دوست بھی یہ جواز پیش کرتے ہوئے ملنے سے کترانے لگے کہ ان پر بھی آتے جاتے نظر رکھی جاتی ہے۔ اس طرح کشور ناہید کے ہاں مزاحمتی رویہ پیدا ہوا۔

iii۔ سیاسی حالات اور ماحول پر اظہارات

کشور ناہید نے اپنے بہترین عصری شعور کا واضح ثبوت دیتے ہوئے جس طرح اپنی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں سیاسی و سماجی فضا کو پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ کشور ناہید کو اپنے دور کے سیاسی و سماجی مسائل کا بخوبی ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس وقت کا جو سیاسی نقشہ کھینچا ہے وہ حقیقت سے بھرپور اور جاندار ہے۔ دوسری جنگِ عظیم اور تحریکِ پاکستان کے وقت ہندوستانی فضا پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ہر طرف مہنگائی کا دور دورہ تھا اور برصغیر کی عوام کو راشن بندی کا سامنا تھا۔ کشور ناہید کے مطابق راشن بندی کے اس زمانے میں لوگ دروغ گوئی سے کام لینے لگے۔ ہر گھر کے لیے ایک بوتل مٹی کا تیل ملتا تھا، لیکن ایک ہی گھر سے تعلق رکھنے والے دو افراد دھوکہ دہی سے کام لیتے ہوئے خود کو دو مختلف گھروں کا فرد ظاہر کرتے اور راشن کے طور پر دو بوتلیں ہتھیا لیتے۔ کشور ناہید کا کہنا ہے کہ یہ مسلمانوں نے یہ ملک کئی قربانیوں کے بعد حاصل کیا اور جدوجہد پاکستان میں صرف مردوں کا ہی نہیں بلکہ خواتین کا بھی برابر کا حصہ ہے۔ کشور ناہید کے مطابق امن وامان کے دور میں یہی عورتیں تھیں جو ڈولی میں سفر کرتیں اور پردے کی روایت کی سختی سے پابند تھیں۔ اگر حکیم کو نبض بھی دکھانا ہوتی تو ہاتھ آٹے میں لپیٹ کر دکھاتیں لیکن پاکستان کے حصول کی خاطر انہیں یہ سب ترک کرنا پڑا۔ صورتحال نے یکایک پلٹا کھایا اور یہی عورتیں گلی محلوں میں جگہ جگہ بچوں کے ساتھ جلسے کرتی، چندہ اکٹھا کرتی اور نعرے بازی میں حصہ لیتے دکھائی دینے لگیں۔ ان عورتوں نے خود اپنے بچوں میں بھی یہ جذبہ بیدار کیا۔ اور مالی تنگدستی کے اس زمانے میں نئے وطن کے حصول کی خاطر ایک منصوبہ بنایا، جس کے تحت روزانہ آٹا گوندھتے ہوئے ایک مٹھی آٹا نکالنا شروع کیا۔

تمام مسلمان بیبیوں نے دونوں وقت آٹا گندھتے وقت مٹھی آٹا نکال کر بچانا شروع کر دیا۔ ہر گھر کے ایک بچے کی خود بخود ڈیوٹی لگ گئی۔ وہ سارے گھروں سے آٹا اکٹھا کر کے لے جا کر دکان پر بیچے گا اور رقم مسلم لیگ کے دفتر میں جمع کرا دے گا۔ قائداعظم نے جب مسلمانوں سے چندے کی اپیل کی تو یہ تحریک خود عورتوں نے سوچی اور اس پر عمل کیا۔ پاکستان بننے تک یہ ذمہ داری سارے گھروں میں صبح، شام باقاعدگی سے ادا ہوتی رہی۔ (۳۳)

تقسیمِ ہند اور ہجرت کے بارے میں کشور ناہید لکھتی ہیں اس موقعے پر بڑے پیمانے پر اقدار کی شکست وریخت دیکھنے کو ملی۔ ہجرت کر کے آنے والوں کی وہ ساکھ اور آن بان نہ رہی اور اقدار میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ بزدلی کو شرافت کا نام دیا جانے لگا۔ یہیں سے بے پردگی کی روایت نے بھی جنم لیا۔ اس کی ایک وجہ کشور ناہید یہ لکھتی ہیں کہ ہجرت کے وقت چونکہ خواتین کو ٹرین کا سفر کرنا تھا، برقعے سمیت پورا ٹکٹ لگتا تھا جبکہ بغیر برقعے کے آدھا ٹکٹ تھا لہذا عورتوں نے اپنی مالی آسانی کے لیے برقعہ اتار دیا۔ دوسری وجہ لکھتی ہیں کہ برقعے والیوں نے برقعہ یہ کہہ کر اتار دیا کہ انہیں یہ اطمینان تھا کہ اس ملک میں اب کون دیکھتا ہے۔ کشور ناہید کے مطابق ہجرت کے وقت رہائش کے مسئلے ہی سے ڈاکے اور رشوت کی بنیاد پڑی۔ اس وقت بھرے مکانوں کے تالے توڑ کر ان پر ناحق قبضہ کر لیا گیا، بعد میں الاٹمنٹ کے قضیے نے سفارش کو رواج دیا۔ پاک بھارت جنگ کے بھی کشور ناہید کی آپ بیتی پر گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور اس کی ریشہ دوانیوں کے عوام خاص طور پر لاہوری باشندوں پر اثرات کے بارے میں لکھتی ہیں کہ لوگوں میں بے چینی، اور تذبذب کی کیفیت جنم لے رہی تھی خاص طور پر لاہور چونکہ بارڈر کے قریب تھا لہذا لاہوریوں میں اضطراب اور بھی زیادہ پھیلا ہوا تھا لاہوریوں کی حالات سے پل پل باخبر رہنے کی خواہش کو انہوں نے یوں بیان کیا ہے۔

ہر چند کے ریڈیو پہ بار بار اعلان ہو رہا ہے کہ سائرن بجتے ہی تہہ خانوں میں چلے جاؤ یا سیڑھیوں کے نیچے بیٹھ جاؤ۔ پر لاہوری تو لاہوری ہی تھے۔ کرفیو میں وقفہ آتا تو لوگ کانوں سے میل نکلواتے ہوئے بھی سڑک کے کنارے نظر آتے۔ (۳۴)

جنرل ایوب خان کے تشکیل دیے گئے ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت انتخابات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، جس کے ارکان بنیادی جمہورتوں کے ممبران تھے اور ان کی کل تعداد ۸۰،۰۰۰ کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۶۵ء کے پہلے صدارتی الیکشن میں ایوب خان کے بالمقابل قوم کی محبت اور عقیدت کو سمیٹے محترمہ فاطمہ جناح

ایک مضبوط امیدوار کے طور پر سامنے آئیں۔ پابندیوں بھرے اس دور میں عورت کی قیادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی بہن اور مادرِ ملت ہونے کی بنا پر محترمہ فاطمہ جناح سے عوام کی وابستگی دیکھنے کے لائق تھی۔ کشور ناہید اس موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "محترمہ فاطمہ جناح نے صدارت کا الیکشن لڑنے کا اعلان کیا۔ ایک دم مولوی بھی جاگ گئے اور کمال یہ ہے کہ انہوں نے فاطمہ جناح یعنی ایک خاتون کے صدر بننے کی حمایت کی۔"(۳۵) فاطمہ جناح سے عوام کی وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی لیکن ان انتخابات کے نتائج نے عوام کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ فاطمہ جناح کی شکست نے عوام کو آئین کے کھوکھلے پن سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں سخت مایوسی سے دوچار کیا۔ فاطمہ جناح کی شکست نے ان انتخابات کو عوام کی نظر میں مشکوک بنا دیا۔ عوام اس آئین کے خلاف سڑکوں پہ نکل آئے اور مارشل لاء کی صورت میں فردِ واحد کی حکومت کو یکسر مسترد کر دیا۔ کشور ناہید کے خیال میں بھی محترمہ فاطمہ جناح کو باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہروایا گیا۔ کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں صدر ایوب خاں کے دورِ حکومت کے بارے میں کوئی اچھا تاثر نہیں دیا۔ انہوں نے صدر ایوب خاں کے بارے میں مہنگائی اور جھوٹے مقدموں کا تاثر دیا ہے۔ اس بارے میں انہوں نے حبیب جالب کی مثال بھی پیش کی جب ملک میں آٹا اور روٹی مہنگی ہونے پر حبیب جالب نے صدر ایوب خاں کے خلاف سیاسی نظم لکھی تو انہیں جھوٹے مقدمے کے تحت پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ کشور ناہید کے خیال میں یہ سلسلہ یہاں تھما نہیں بلکہ آئے دن حبیب جالب پہ ایک نیا مقدمہ بنتا رہا اور وہ نظر بند ہی رہے۔ اسی نظر بندی کے دوران ان کے دوسالہ بچے کا انتقال بھی ہو گیا لیکن انہیں رہائی ملنی تھی نہ ملی۔ صدر ایوب کے بعد دوسرے بدترین مارشل لاء کا زمانہ تھا، جس میں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ وقوع پذیر ہوا۔ اس دوران پیش آنے والے حالات واقعات کے بارے میں لکھتی ہیں:

> یہ بات ہے ستمبر ۱۹۷۱ء کی۔ مجھے سرکاری طور پر بنگال بھیجا گیا کہ بنگالیوں کے خلاف لڑنے والے سرکاری غنڈوں کے حق میں کتابچہ لکھوں۔ میں فوراً گئی۔ آگ میں کودے بغیر جلن اور سوزش بھی تو نہیں ہوتی۔ بوڑھی گنگا کے کنارے کیمپ بھرا تھا۔ عورتیں ہی عورتیں۔ کیا میں انھیں عورتیں کہوں۔ مشکل سے تیرہ سے پندرہ سال کی پتلی پتلی لڑکیاں جن کی ابھی چھاتیاں بھی سانس لینے نہیں پائی تھیں۔ مگر ان کے پیٹ چھٹے یا ساتویں مہینے کی گواہی

دے رہے تھے۔ان کے گھر والے کہاں تھے۔وہ تو رات کے اندھیرے میں غداراور سازشی کہہ کر مار دیئے گئے تھے۔ان کی نسلیں خراب کرنے کے لیے ان کے ساتھ حرام کاری کی گئی تھی۔وہ بے اماں، بے جگہ، بوڑھی گنگا کی گود میں، سوکھے ہونٹ اور سوکھی آنکھیں لیے سرنگوں بیٹھی تھیں۔ (۳۶)

کشور ناہید کو اس بات کا احساس تھا کہ فسادات میں اپنی فطری کمزوری کی بناپر زیادہ تر عورت ہی نشانہ بنتی ہے۔ان کے خیال میں دشمن سے انتقام لینے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ان کی عورتوں کے ذریعے ان کی نسلیں اجاڑدی جائیں۔

صحیح معنوں میں ہر فساد نے عورت کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کیا ہے۔ایسا اس لئے بھی ممکن ہو سکا ہے کیونکہ عورت صنفِ نازک کہلاتی ہے۔کمزور طبقہ میں شمار ہونا اور اپنے آپ کو دوسروں کے کرم پر چھوڑنا ہی اس کے زوال کا سبب بنا ہے۔ہر کوئی اس کو کمزور سمجھ کر اپنی طاقت کا نشانہ بناتا ہے۔ (۳۷)

سقوط ڈھاکہ بھی اپنے ساتھ ظلم اور بربریت کی ایک لمبی داستان لے کر آیا جس میں کئی ماؤں کی گودیں اجڑیں، کئی بیٹیوں کے سر سے سایہ چھن گیا اور کئی عورتوں کو بیوگی کا دکھ سہنا پڑا۔اس پاک بھارت جنگ میں ایک بھی ظلم کی کئی داستانیں رقم ہوئیں جن سے پردہ اٹھاتے ہوئے کشور ناہید لکھتی ہیں:

میں نے بی بی سی سے سنا تھا۔ڈھاکہ میں اقبال ہال کے ہاسٹل کو خالی کرانے کے نام پر سارے لڑکوں کو مار دیا گیا ہے۔میں ڈھونڈتی ڈھونڈتی اقبال ہال پہنچی، باہر سفیدی ہو رہی تھی۔اندر گئی تو کمرے، کہیں جھلسے ہوئے کروں کی شکل میں اور کہیں بارود کی بو کی شکل میں بربریت کی گواہی دے رہے تھے۔ (۳۸)

کشور ناہید نے ان حالات وواقعات کا نہ صرف گہرا مشاہدہ کیا بلکہ خود ان کا گہرا اثر بھی قبول کیا۔ایک جگہ ان حالات میں لوگوں کی لاتعلقی اور بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ حالات اتنے دگرگوں اور خراب تھے لیکن لوگوں کی لاپروائی دیکھنے لائق تھی۔لوگ ہنس بول رہے تھے اور آئس کریم کے مزے لے رہے تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔کشور ناہید کا سیاسی شعوریوں بھی قابلِ تحسین ہے کہ انہیں ہم عصر سیاسی قوانین و

اصطلاحات وغیرہ سے مکمل آشنائی تھی۔اورانہوں نے ان تمام قوانین واصطلاحات کو اپنی آپ بیتی کا بھی حصہ بنایا۔مثلاً ان کی آپ بیتی میں حدود آرڈیننس، قصاص اوردیت قانون، قانونِ شریعت وغیرہ کے بارے میں تفصیل اورذاتی رائے کا اظہار پایا جاتا ہے۔۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگا کر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایک ملک گیر احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا۔یوں ملک کی سیاسی حالت ابتر ہو گئی اور یہ کہتے ہوئے کہ مارشل لاء کا مقصد ملک میں صرف ۹۰ دن میں انتخابات کروانا ہے، ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کی شام مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔مارشل لاء کے نفاذ کے فوراًبعد ذوالفقار علی بھٹو پر ایک شہری کے قتل کا مقدمہ چلا کر سزائے موت سنادی گئی۔اور ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔"حدود" اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے جس کے مطابق مختلف معاشرتی جرائم کی سزائیں قرآن وسنت کے مطابق طے کی جاتی ہیں۔وہ سزائیں جن کے تعین اور کمی بیشی میں حکومت، مقننہ اور عدلیہ کو اختیار حاصل ہو "تعزیرات" کہلاتی ہیں۔ لیکن وہ سزائیں جو طے شدہ ہیں اوران میں کمی بیشی یا معافی کا کسی کو شرعاً اختیار حاصل نہیں "حدود" کہلاتی ہیں۔ پاکستان میں ان حدود کے نفاذ کا مطالبہ تو قیام پاکستان کے ساتھ ہی کیا جارہا تھا، لیکن اس کی عملی نوبت جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دورِ صدارت میں آئی جب مجموعہ تعزیراتِ پاکستان کی چند شقوں کو تبدیل کر کے کچھ نئی شقوں کا اضافہ کیا گیا اور ایک آرڈیننس تشکیل دیتے ہوئے اسلامی سزاؤں کو ملک بھر میں نافذ کر دیا گیا۔یہ آرڈیننس "حدود آرڈیننس" کہلاتا ہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے سرقہ، ڈکیتی، زنا، تہمت زنا، ابتیاع شراب اور تازیانے کی سزاؤں سے متعلق حدود آرڈیننس اورزکوۃ آرڈیننس نافذ کیا اوروفاقی شرعی عدالت اور قاضی عدالتیں قائم کیں۔ضیاء الحق کے دور میں مجرموں کو کوڑے لگائے جانے کا منظر بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:"کوڑے لگاتے وقت اس شخص کے منہ کے سامنے مائیکروفون رکھ دیا جاتا تھا کہ ساری جیل میں قید لوگ، اس کی چیخیں سنیں۔کوئی چالیس ہزار لوگوں کو کوڑے لگائے گئے تھے۔"[۳۹] چور کے ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنگسار کرنے، قصاص میں عضو کے بدلے عضو کاٹنے، جھوٹی تہمت پر کوڑے لگانے کی سزاؤں کو سخت اور معاذاللہ وحشیانہ قرار دیا جا تا رہا۔بعد میں جنرل ضیاء الحق نے قومی وعالمی سطح پہ سخت تنقید اور مخالفت کی بنا پر یہ آرڈیننس تبدیل کر دیا۔کشور ناہید نے اس دور پر

اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۹۸۵ء شدید مارشل لاء، کوڑوں، سزاؤں، سنسر شپ اور پابندیوں کا زمانہ تھا۔ کشور ناہید کے بقول اس زمانے میں انہیں وہ کچھ دیکھنے کو ملا جو زمانہ جاہلیت میں بھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔ کشور ناہید نے بھٹو کی پھانسی اور حدود آرڈیننس کے اجراء کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ لکھتی ہیں کہ حدود آرڈیننس کا فائدہ ان تمام حضرات نے بھی اٹھایا جو اپنی بیویوں سے تنگ تھے یا جنہیں بہنوں کو وراثت سے حصہ دینے میں قباحت محسوس ہو رہی تھی۔ اس سیاسی ماحول میں ان حضرات کے لیے عورتوں کو جھوٹے مقدموں کی نذر کر کے اپنے مقصد کا حصول اور بھی آسان دکھائی دینے لگا۔ ''خیر سے بھٹو صاحب کی پھانسی اور عورتوں کے بارے میں حدود آرڈیننس آگے پیچھے آئے۔ پتہ چلا کہ جیلیں عورتوں سے بھر گئیں۔''(۴۰) ضیاء الحق کا دور میڈیا پر پابندیوں کا دور تھا۔ سکرین پر موجود عورت کے لیے سر پہ دوپٹے کی شرط تھی۔ عورت کے لیے شرعی حدود کا پاس لازم قرار دیا گیا تھا۔ کشور ناہید میڈیا پر عائد کی گئی پابندیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ٹیلی ویژن پہ مرد کو عورت کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ ایک پلنگ پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ سولہویں صدی کی باتیں نہیں۔ یہ ان لوگوں کی باتیں ہیں جو اعلان کرتے تھے، ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ (۴۱)

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو کشور ناہید کی آپ بیتی میں ہمعصر سیاسی صورتحال کا نہایت واضح عکس ملتا ہے۔ انہوں نے سیاسی ریشہ دوانیوں اور اتار چڑھاؤ کو خاص طور پر اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا۔

ج۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے سیاسی تناظرات کا تقابل

i۔ اشتراکات

دونوں خواتین آپ بیتی نگاروں کے ہاں سیاسی بیداری دیکھنے کو ملتی ہے۔ دراصل سیاسی انتشار اور ہلچل بھرا یہ ایک ایسا دور تھا کہ اس دور کے کسی بھی فرد خاص طور پر کسی بھی ادیب کے لیے اس صورتحال سے ناواقفیت اچھنبے کی بات ہو گی۔ جہاں تک ادا جعفری اور کشور ناہید کا تعلق ہے تو ان دونوں خواتین کے ہاں ہم عصر سیاسی حالات پہ مکمل تفصیل ملتی ہے۔ ان دونوں خواتین نے اپنی آپ بیتیوں میں جو سیاسی منظر نامہ پیش کیا ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے دونوں خواتین نے ہندوستانی رہنماوں، سیاسی تحریکوں، تقسیم ہند ہجرت، فسادات اور مہاجرین کی بے سروسامانی کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا۔ دونوں خواتین کو ہجرت اور فسادات میں ہونے والے جانی ومالی نقصان کا اندازہ تھا ان دونوں خواتین میں انسانیت کی قدر مشترک ہے۔ دونوں خواتین نے ہجرت اور فسادات کا ذکر کرتے ہوئے سکے کے دونوں رخ پیش کیے۔ ان کے مطابق ایسے وقت میں ہر مذہب اور ہر طبقے سے ہر قسم کے لوگ سامنے آئے۔ ان کے مطابق ان حالات میں مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت کرنے والے ہندو اور سکھ بھی سامنے آئے اور اپنے ہم مذہب افراد کو لوٹنے والے مسلمان بھی دیکھنے کو ملے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک قدر یہ بھی مشترک ہے کہ ان دونوں آپ بیتیوں میں تحریک آزادی کے حوالے سے خواتین کی بے لوث خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی قربانیوں اور کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے مطابق آزادی کی اس جنگ میں عورت کا اہم کردار ہے اور عورت ذات نے اولاد، جان ومال اور اپنی عزت وعصمت کی قربانی دے کر یہ ملک حاصل کیا۔ ان آپ بیتیوں کے مطابق وہ عورت جو پردے کی پابند تھی اور جس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا جنگ آزادی میں وہی عورت ہاتھ میں پرچم لہراتی چندہ اکٹھا کرتی نظر آئی۔

اس کے علاوہ پاکستان کے پابندیوں بھرے پر آشوب سیاسی ماحول کی عکاسی بھی ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے ہاں ایک مشترک قدر ہے۔ دونوں آپ بیتیوں میں سکندر مرزا، بھٹو دور سے لے کر صدر ایوب خاں، جنرل یحیٰی خاں اور جنرل ضیاء الحق جیسے تمام سیاسی رہنماؤں کے دورِ حکومت پر تفصیل ملتی ہے۔

دونوں آپ بیتی نگاروں نے سقوطِ ڈھاکہ اور اس پر عوامی رد عمل کو نہایت تفصیل سے پیش کیا۔ دونوں خواتین نے اس المناک سانحے کی ممکنہ وجوہات پر روشنی ڈالی اور سقوطِ ڈھاکہ کو ایک الم ناک سانحہ قرار دیتے ہوئے اس المناک سانحے کی ممکنہ وجوہات پر بھی روشنی ڈالی۔ دونوں خواتین میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں کے ہاں جمہوریت پسندی کی طرف رجحان ملتا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں آمریت کے خلاف مزاحمتی انداز پایا جاتا ہے۔

ان دونوں خواتین کے ہاں حکومتِ وقت سے ذاتی شکوے شکایات کا اظہار ملتا ہے۔ اور مشترک قدر یہ ہے کہ انہیں کچھ گلے شکوے ذاتی نوعیت کے ہیں دراصل ادا جعفری کو حکومت وقت کی طرف سے سرکاری افسران کے کیے جانے والے احتساب کا شکوہ تھا ان کے مطابق احتساب کے لیے جنہیں فارم ملے سو ملے لیکن جنہیں نہیں ملے انہیں بھی ایک دھڑکا لگا رہا اور خطرے کی ایک ان دیکھی تلوار ان کے سر پہ لٹکتی رہی۔ ادا جعفری نے اس کیفیت کو ذہنی کوفت اور شرمندگی قرار دیتے ہوئے حکومتِ وقت کے خلاف خوب بھڑاس نکالی۔ جبکہ کشور ناہید نے اپنے سسر اور خاوند کی گرفتاری پر غم وغصے کا اظہار کیا ہے۔ اپنے خاوند کی گرفتاری کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ۱۹۷۰ء میں یوسف اور اس کے باپ کی گرفتاری بھی بالکل اسی طرح رات کو ہوئی تھی۔ دو بھری گاڑیاں آئیں صبح ۴ بجے اس کو گاڑی میں بٹھا کر لے گئیں۔ ایف۔ آئی۔ آر میں لکھا تھا ملزم نے کہا ہے فوجی گدھے ہوتے ہیں، یہ ملک چلانا کیا جانیں۔ اس مقدمے میں یوسف کو ایک سال کی سزا ہوئی۔ (۴۲)

اس کے علاوہ انہیں خود بھی کئی پہروں کا سامنا رہا۔ جب سی۔ آئی۔ ڈی ان کے پیچھے لگی رہی تو ان کے دل میں بھی حکومتِ وقت کے خلاف غم وغصے کے جزبات پیدا ہو گئے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> جب ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک میرے اوپر سی آئی ڈی لگی رہی ایک موٹر سائیکل میرے آگے اور ایک جیپ میرے پیچھے چلتی تھی مجھ جیسی نہتی اور بڑبولی عورت مارشل لاء پر غصہ اتارنے کو بس نظمیں ہی کہہ رہی تھی اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے کہ ہمارے سامنے ہر عمل جو ناروا تھا اور ہر ظلم جو ناممکن تھا، عذابِ بے اماں کی طرح مسلط تھا۔ (۴۳)

دونوں خواتین کو اس بات کا احساس تھا کہ حکومت سازی کا بنیادی مقصد امن وامان قائم کرنا اور بنیادی حقوق فراہم کرنا ہے، چونکہ دونوں کے پیش نظر ہم عصر سیاسی حالات تھے لہذا دونوں کو اس بات کا شدید قلق تھا کہ ان کے ملک میں حقوق کی عدم دستیابی اور غربت وفاقہ دستی سے کتنے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ کشور ناہید جانتی تھیں کہ یہ حقوق کی عدم فراہمی اور بھوک ہی ہے جو عورت کو کوٹھے پہ بیٹھنے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ ادا جعفری

سیاسی فرائض سے کوتاہی برتنے کے نتائج سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ حقوق کی عدم دستیابی ہی ہے جو عوام کو ملک اور حکمرانوں سے بدظن کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر قومیں انتہائی قدم اٹھانے پر بھی مجبور ہو جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں بنگلہ دیش حکمرانوں کی ملکی حالات سے چشم پوشی کے نتیجے میں ہی معرضِ وجود میں آیا۔ اداجعفری اور کشور ناہید کو ہم عصر سیاسی نظام اور اس کی خرابیوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ ان دونوں خواتین نے سیاسی تناؤ اور اس کے معاشی نظام پر اثرات نمایاں کیے۔ ان دونوں خواتین کے پیش نظر بین الاقوامی سیاسی منظر نامہ بھی رہا جس کے تحت ان دونوں نے اظہار رائے کی آزادی کو سراہا۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو دونوں آپ بیتیاں نہایت وسیع اور گہرے سیاسی شعور کی حامل ہیں جن میں سیاسی شعور کے اظہار کے حوالے سے کئی اشتراکات کی حامل ہیں۔

ii۔ افتراقات

سیاسی شعور کے اظہار کے حوالے سے اداجعفری اور کشور ناہید میں جہاں بہت اشتراکات پائے جاتے ہیں وہیں ان کی آپ بیتیوں میں کچھ افتراقات بھی سامنے آتے ہیں۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ پایا جاتا ہے کہ اداجعفری کا سیاسی شعور صرف سیاسی سرگرمیوں اور ملک کی مجموعی صورتحال تک محدود ہے جبکہ کشور ناہید کے سیاسی شعور میں مزید گہرائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے ہاں سیاستدانوں کے شخصیت و رویے، ملکی قوانین اور اظہارِ رائے جیسی باتوں پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ پایا جاتا ہے کہ اداجعفری کے ہاں سیاسی عوامل کا بیان سرسری اور دلسوز انداز میں ملتا ہے جبکہ کشور ناہید کے ہاں سیاسی عوامل کے بیان میں بھی کہیں طنز کی کاٹ پائی جاتی ہے تو کہیں منٹو کا رنگ غالب ہے۔

سیاسی عوامل کے بیان میں دونوں خواتین کے ہاں پسند ناپسند کا واضح فرق پایا جاتا ہے۔ اداجعفری نے صدر ایوب خان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں اس سلسلے میں وہ ان کے دور حکومت کی خامیوں اور کجی کوتاہیوں کو بھی نظر انداز کر گئی ہیں لیکن تو کشور ناہید نے اگر یحییٰ خاں کی حکومت کو پاکستان کے لیے سب سے برا وقت قرار دیا تو کشور ناہید نے جنرل ضیاء الحق کے دور کا موازنہ اسلام سے پہلے اور فرعون کے زمانے سے کرتے ہوئے اسے ہر لحاظ سے منفی ثابت کیا۔ اس بات کی تائید اس بیان سے بھی ہوتی ہے: " جنرل ضیاء

الحق کے مارشل لاء کا ذکر بار بار منفی انداز میں کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا کہ مصنفہ نے اس دور کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔"(۴۴) کشور ناہید کے مطابق ضیاء الحق کا دور پابندیوں اور سیاسی ابتلاؤں کا دور تھا۔ کشور ناہید کے مطابق یہ دور سنسر شپ اور میڈیا پر پابندی کا دور تھا جب ٹیلی ویژن پر مرد کو عورت کو ہاتھ لگانے کی اور ایک چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ کشور ناہید کے مطابق یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال اور قرآن پاک کا کلام بھی سنسر کیا جاتا تھا۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ سیاسی بیان میں ادا جعفری کے ہاں وہ تفصیل دیکھنے کو نہیں ملتی جو کشور ناہید کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق تضاد کا پایا جانا ہے۔ ادا جعفری کے ہاں بیان میں تضاد پایا جاتا ہے جبکہ کشور ناہید کی عبارت اس تضاد سے پاک ہے۔ ادا جعفری اگر ایک جگہ کسی سیاستدان کے حق میں بیان دیتی ہیں تو دوسری جگہ خود ہی اس بیان کی تردید کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کئی جگہ انہوں نے ایوب خاں کی تعریف میں کہے گئے الفاظ کی اگلے چند الفاظ میں خود ہی تردید کر دی۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہم عصر سیاسی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے ادا جعفری نے مثبت و منفی ہر دو پہلو بیان کیے ہیں جبکہ کشور ناہید نے زیادہ تر منفی پہلو ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا۔ ذاتی تعصب اپنی جگہ لیکن ادا جعفری نے حکومت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو مد نظر رکھا۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق اس بات کا بھی ہے کہ ادا جعفری کے ہاں سیاسی صورتحال کا احوال عام عوامی انداز میں بیان ہوا ہے لیکن کشور ناہید کے ہاں سیاسی صورتحال کے بیان میں بھی نسائی تحریک کے واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔ کشور ناہید کے ہاں احتجاج کے انداز میں یہ سوال پایا جاتا ہے کہ عورت محبوبہ، بیوی، تمہارے بچوں کی ماں سب کچھ ہو سکتی ہے تو رہنما کیوں نہیں ہو سکتی؟ کشور ناہید نے دنیا بھر کی رہنما خواتین کے نام بھی گنوائے ہیں اور خاص طور پر بے نظیر بھٹو اور فاطمہ جناح کو خاص طور پر قابلِ فخر قرار دیا۔ انہوں نے جس حکومت کو بھی عورت کے موافق پایا اس کی کھلے دلوں تعریف کر ڈالی اور جس حکومت اور اس کے قوانین کو انہوں نے تحریکِ نسواں سے متصادم پایا اس کے خلاف کھلے بندوں لکھا۔

سیاست کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے سیاست نے چونکہ اپنے پنجے ہر شعبہ ہائے زندگی میں گاڑھے ہوئے ہیں لہذا ابتدا ہی سے ادب پر بھی اس کے نہایت گہرے اور نتیجہ خیز اثرات مرتب ہوئے خاص طور پر بیسویں صدی میں یہ اثرات مزید گہرے ہوئے۔ملک کے سماجی و معاشی حالات کی طرح ادب سیاسی حالات وواقعات سے بھی کسی طور چشم پوشی نہیں کر سکتا۔اس کے لیے ضروری نہیں کہ ادیب باقاعدہ طور پر سیاست میں حصہ لے بلکہ ادیب کے لیے صرف ہم عصر سیاسی حالات سے واقفیت ہی کافی ہے۔اگر ادیب ہم عصر سیاسی حالات سے واقفیت اور دلچسپی رکھتا ہو تو وہ سیاست کو صحیح راہ پر ڈالنے اور ملک کی باگ دوڑ سنبھالنے میں ادبی خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ملک کی سیاسی صورتحال خراب ہونے کی صورت میں ادیب ہمیشہ قلم سے بیداری عوام کا کام لیتے رہے۔سیاست میں اب تک مختلف سیاسی پارٹیاں اور مختلف سیاسی نظام دیکھنے کو ملے وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی نظام بدلتے رہے پرانے سیاسی نظام تو صدیوں قبل ختم ہو چکے یہ سیاسی شعور ہی ہے جو نئی نسلوں سے ان نظاموں کے تعارف کا وسیلہ بنا ہے۔

ادبی اصناف پر نظر دوڑائی جائے تو نظم و نثر کی تقریباً تمام اصناف میں اپنے اندر سیاسی حالات کو سمونے کی گنجائش موجود ہے شاعری کو دیکھا جائے تو اس میں بھی سیاسی موضوعات کی بھرمار ملے گی،اسی طرح ناول اور افسانے وغیرہ میں بھی سیاسی موجوعات کی ایک باقاعدہ روایت سامنے آتی ہے۔جب بات آپ بیتی کی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ عصری شعور کی مظہر یہ صنفِ نثر ابتدا ہی سے سیاسی شعور کی بھی بہترین عکاس ہے۔

تقریباً ہر آپ بیتی نگار نے اپنی آپ بیتی میں ہم عصر سیاسی حالات وواقعات کو سموتے ہوئے اپنے سیاسی شعور کا ثبوت دیا۔سیاسی میدان میں ہلچل اور کشاکش پیدا ہوئی تو اسی ہلچل اور کشاکش کی نشاندہی کی گئی اور اگر کسی محب وطن،ایماندار اور مخلص سیاست دان نے حکومت میں قدم رکھا تو آپ بیتی نگار اس کی تعریف میں بھی رطب اللسان نظر آئے۔ادا جعفری اور کشور ناہید کا شمار بھی آپ بیتی نگاروں میں ہوتا ہے جن کے ہاں سیاسی شعور نہایت عمیق اور گہرا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سیاست/wikipedia.org/wiki، ۲۵دسمبر۲۰۱۹، pm۳:۳۰

۲۔ وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر، امت پر کاشن، راجستھان، ۱۹۸۱، ص۱۹۶

۳۔ اداجعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص۳۱۷

۴۔ اداجعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص۳۰۶

۵۔ ایضاً، ص۳۰۶

۶۔ ایضاً، ص۲۳۸

۷۔ ایضاً، ص۱۰۳

۸۔ ایضاً، ص۱۰۳

۹۔ ایضاً، ص۴۴

۱۰۔ موحد یاسین، تقسیم ہند عورت اور اردو فکشن، www.urdulinks.com/urj، ۱۸، ۱۱اگست ۲۰۱۸، ۱۱:۱۵am

---

۱۱۔ اداجعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص۹۸

۱۲۔ اداجعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص۱۰۱۔۱۰۰

۱۳۔ ایضاً، ص۱۰۶

۱۴۔ ایضاً، ص۱۰۴

۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۲

۱۶۔ ایضاً، ص۱۰۳

۱۷۔ ایضاً، ص۳۰۷

۱۸۔ ایضاً، ص۳۰۸۔۳۰۵

۱۹۔ فیلڈمارشل محمد ایوب خاں، آپ بیتی، مطبوعہ: نقوش، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء، ص۱۶

۲۰۔ فیلڈمارشل محمد ایوب خاں، آپ بیتی ، ص۳۰۶

۲۱۔ ایضاً، ص۳۰۴

۲۲۔ ایضاً، ص۳۰۸

۲۳۔ ایضاً، ص۳۰۲

۲۴۔ ایضاً، ص۳۰۳

۲۵۔ ایضاً، ص۳۱۲

۲۶۔ ایضاً، ص۳۱۲

۲۷۔ ایضاً، ص۲۶۰

۲۸۔ ایضاً، ص۲۲۷

۲۹۔ ایضاً، ص۲۲۷

۳۰۔ ایضاً، ص۲۳۵

۳۱۔ ایضاً، ص۱۰۷

۳۲۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص۲۳

۳۳۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص۲۲

۳۴۔ ایضاً، ص۱۱

۳۵۔ ایضاً، ص۱۰۴

۳۶۔ ایضاً، ص۲۵

۳۷۔ ایضاً، ص۲۵

۳۸۔ ایضاً، ص۲۵

۳۹۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۲

۴۰۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، ص ۱۷۹

۴۱۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۳۴

۴۲۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۲۳

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۳

۴۴۔ اطہر قسیم، ڈاکٹر، اردو ادب کی آپ بیتیاں، تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ پی ایچ ڈی، غیر مطبوعہ، مملوکہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۲۵۵

باب چہارم:

ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور: ادبی تناظرات

عصر کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ یوں تو ادب، سیاست، سماج ایک ہی تصویر کے کئی رخ ہیں لیکن ادب وہ کھڑکی ہے جس سے عصر کے باقی تمام رخ بھی نہایت واضح طور پہ دیکھے جاسکتے ہیں کیونکہ زندگی کی ترجمانی ایک ایسا فریضہ ہے جو ادب ہمیشہ سرانجام دیتا چلا آیا ہے۔ ادب کے لغوی معنی تو تمیز اور تہذیب کے ہیں لیکن اصلاح میں ذاتی افکار و خیالات کو اس طرح الفاظ کا پیکر دینا کہ داخلی و خارجی حقائق کی روشنی میں وہ زندگی کی ترجمانی اور تنقید کا کام دیں، ادب کہلاتا ہے۔ انسان کی ہم عصر ادبی مزاج سے واقفیت اس کا ادبی شعور کہلاتی ہے۔

کسی تخلیق کار کی بہتر تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ صرف اس کے ادبی شعور سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک تخلیق کار کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ ہم عصر ادبی رویوں اور رجحانات سے واقف ہو۔ ایک تخلیق کار کے لیے اپنے دور میں پروان چڑھنے والی تخلیقات کا علم ہونا بہت ضروری ہے دوسری چیز جو ایک تخلیق کار کے لیے لازم ہے وہ ادبی تحریکوں ان کے منشور اور مقاصد سے آگہی ہے۔ ایک تخلیق کار اگر کسی تحریک سے خود منسوب نہ بھی ہو تو ہم عصر تحریکوں کے زیر اثر نشو نما پانے والے ادب اور ان کے عوام پر اثرات سے واقفیت خود اس کی ادبی راہ ہموار کرنے لیے ناگزیر ہے۔

ہر بڑے تخلیق کار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہم عصر ادبی روایت اور مقبول ترین ہم عصر ادبی موضوعات کا علم ضرور رکھتا ہے جہاں تک کشور ناہید کا تعلق ہے تو ان دونوں آپ بیتی نگاروں نے ایک اچھا تخلیق کار ہونے کا ثبوت دیا۔ ادا جعفری اور کشور ناہید دونوں کا ادبی شعور نہایت اعلیٰ درجے کا ہے جو قارئین کے علم کا دائرہ وسیع کرتا ان کی آپ بیتیوں کی زینت بنا۔ یہ دونوں آپ بیتیاں ان کے ادبی ذوق اور ادبی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہیں جن میں مروجہ ادب پر تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ یہ دونوں آپ بیتیاں ہم عصر ادبی مزاج کی بہترین عکاس ہیں جن میں ہم

عصر ادیبوں کی نوزائیدہ تخلیقات پر تبصرے بھی پیش کیے گئے ہیں اوران کی شاعروں ادیبوں کی مقبولیت کا گراف بھی پیش کیا گیا ہے۔

الف۔ ادا جعفری کی آپ بیتی "جو رہی سو بے خبری رہی" میں عصری شعور کے ادبی تناظرات

اعلیٰ ادبی ذوق کی حامل اس آپ بیتی نگار کا ادبی شعور نہایت گہرا اور وسیع ہے۔ ادا جعفری نے اپنی آپ بیتی میں نئی فروغ پانے والی اصناف کی تفصیل فراہم کرتے ہوئے قدیم اصناف سے ان کا تقابل بھی پیش کیا اور مختلف ادبی اصناف پر خود اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ ادا جعفری کو ہم عصر ادبی رجحان ورویوں سے خوب واقفیت تھی یہی وجہ ہے کہ خود ان کی آپ بیتی ہم عصر ادبی رویوں اور رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔ یہ آپ بیتی جہاں اس دور کی ادبی تحریکوں اور نظم ونثر کے اہم موضوعات پر روشنی ڈالتی ہے وہیں مروجہ ادبی سلسلوں اور شاعروں ادیبوں کی ذاتی چپقلش وغیرہ کو بھی سامنے لاتی ہے۔ اس آپ بیتی میں تین طرح کے ادبی منظر نامے پیش کیے گئے ہیں ہندوستان کا ادبی منظر نامہ، پاکستان کا ادبی منظر نامہ اور بین الاقوامی ادبی منظر نامہ۔ یہ تینوں ادبی منظر نامے ان کے ہاں نہایت واضح اور مفصل انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

ا۔ قیام پاکستان سے پہلے کا ادبی منظر نامہ

ادا جعفری ہندوستان کے ایک شہر بدایوں میں پلی بڑھیں جہاں جاگیر دارانہ نظام کا راج تھا۔ یہ زنانہ اور مردانہ دوخانوں میں بٹا ہوا ایک ایسا سماج تھا جہاں خواتین پہ علم و ادب کے تمام دروازے بند تھے۔ مرد حضرات کے لیے عربی اور فارسی زبان سے واقفیت بھی ضروری تھی اوران کے لیے شعر و سخن کے تمام راستے کھلے تھے۔ جی چاہتا تو خود شاعری کرتے، مشاعرے میں جاتے ورنہ کسی اہل سخن کو گھر بلا کر شاعری سے جی بہلا لیتے۔ البتہ خواتین کے پاس ایک ہی راستہ تھا انتظار کا۔ جب کسی اہلِ سخن کو گھر دعوت دی جاتی یا مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا تو خواتین کی دلچسپی دیکھنے لائق ہوتی۔ سب خواتین شاعر کی دور سے سنائی دیتی آواز سننے کے لیے بند دروازے کے پیچھے اکٹھی ہوتیں۔ ادا جعفری قیام پاکستان سے پہلے کا ادبی منظر نامہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

مردانہ کوٹھی میں اہلِ علم اور اہلِ سخن کی دعوتیں بھی ہوتیں۔ دوسرے شہروں سے جو شعراء بدایوں آتے ان کی پذیرائی بہت عزت و تکریم سے کی جاتی۔ مجھے یاد ہے نانا کی کوٹھی میں ساغر نظامی یا جگر مراد آبادی کے ترنم کی لہریں سامعہ نواز ہوتیں تو بیبیاں بند دروازوں کے پیچھے اشعار سننے کے لیے اکٹھی ہو جاتیں۔ (۱)

جاگیر دارنہ نظام کے حامل اس سماج میں زنان خانے اور مردان خانے الگ الگ ہوتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کی اپنی اپنی دلچسپیاں تھیں لیکن ادب سے لگاؤ اس وطن کی مٹی میں گندھا تھا۔ ہر گھر کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا۔ وقتاً فوقتاً مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے رہے یوں ادبی ذوق کے حامل اہلِ نظر حضرات کے ادبی ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہی لیکن ادبی ذوق کی یہ تسکین صرف مردان خانوں تک محدود تھی۔ پابندیوں بھرے اس روایتی دور میں خواتین کو بند دروازوں کے کواڑ سے آتی آواز ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔

اداجعفری اپنے دور کی اہم ادبی تحریکوں سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔ ان کی آپ بیتی میں ہندوستان کی تقریباً تمام اہم ادبی تحریکوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک جگہ ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا کے بارے میں لکھتی ہیں

ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء میں لندن میں وجود میں آئی تھی اور اس کا منشور بھی تحریر کیا گیا تھا۔ ابتدا میں اس کو ایک باقاعدہ تنظیم کی شکل سجاد ظہیر کی مساعی نے دی اور پھر برصغیر کے تمام بڑے شاعر ادیب اور دانشور اس تحریک میں شامل ہو گئے جن میں فراق گورکھ پوری، حسرت موہانی، ٹیگور، پریم چند، مولوی عبدالحق اور قاضی عبدالغفار جیسی شخصیات بھی شامل تھیں۔ (۲)

سجاد ظہیر نے لندن میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی تو اس کا ایک منشور تحریر کرتے ہوئے اس پر باقاعدہ طور پر دستخط کیے گئے۔ اداجعفری نے اس تحریک کے آغاز وارتقا، ادبی اجلاس اور اہم مراکز کا ذکر تفصیلاً کیا ہے۔ لکھتی ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں اس تحریک نے لکھنو میں پہلی کل ہند کانفرنس منعقد کی اور پھر اگلے چند برسوں میں ہی ترقی کی سڑھیاں طے کرتے ہوئے اس تحریک نے بمبئی، لاہور اور حیدر آباد دکن میں بھی اپنے اہم مراکز قائم کر لیے اداجعفری کے خیال میں ان تمام مراکز میں سے بمبئی نہایت اہمیت کا حامل اور ایک اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اداجعفری لکھتی ہیں کہ اس تحریک کی ادبی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں اور ملک بھر میں مختلف اجلاس ہوتے

رہے۔ یوں ان اجتماعات کے ذریعے ترقی پسند تحریک اپنے خیالات وافکار کی ترویج واشاعت کا فریضہ سرانجام دیتی رہی۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے مجھے تنہائی کے احساس سے نجات دلا کر زندگی کے میلے میں شرکت کا احساس عطا کیا۔ لکھتی ہیں: ''ترقی پسند تحریک کا منشور موجود تھا لیکن میں رسمی طور پر بھی اس کی رکن کبھی نہیں رہی۔ نہ اس کے انتہا پسند سیاسی نظریات کو قبول کیا۔ میری نگاہ میں صرف اس تحریک کا ادبی منظر نامہ تھا۔''(۳) یہ اقتباس اداجعفری کی ترقی پسند تحریک کے بارے میں منفی سوچ کو بھی ظاہر کرتا ہے تاہم انہوں نے بالکل غیر محسوس انداز میں نہایت اختصار اور جامعیت سے کام لیتے ہوئے ایک ہی سطر میں اس تحریک کی سیاسی سرگرمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا دامن صاف بچالیا ہے۔ اداجعفری نے خود کو صرف ادبی سطح پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ قرار دیا۔ اداجعفری کے ہاں مختلف ادبی اصناف پر ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے مطابق ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر فرسودہ روایات میں جکڑی ہوئی ناقابلِ شناخت تمناؤں کو شناخت مل گئی اور نہ صرف موضوع بلکہ ہیئت میں بھی رنگا رنگی اور تنوع دیکھنے کو ملا۔ ان کے خیال میں تازہ کاریوں کا یہ سلسلہ نظم ونثر دونوں میں جاری تھا اور اسی دور میں شاعر مختصر افسانہ، نظم جدید اور نظم معریٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اداجعفری کے خیال میں یہ تحریک اردو ادب کی حیاتِ نو کا بلاوا اور ایک نئی زندگی کی نوید تھی۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ترقی پسند ادب کے لیے وہ بڑا ساز گار زمانہ تھا۔ تخلیقی ادب کے موضوعات میں تنوع اور تازگی تھی۔ افسانہ اور تنقید کا دامن وسیع ہوا تھا اور شاعری میں ہیئت کے تجربے ہو رہے تھے جو یقیناً پرانی شعری روایت سے ایک ناگزیر انحراف تھا۔ (۴)

ان کا کہنا بالکل بجا ہے ہندوستان کا ماحول اس تحریک کے لیے واقعی بہت ساز گار تھا، ایک طرف سیاسی مسائل سر اٹھائے کھڑے تھے تو دوسری طرف سماجی مسائل کا شکار عوام میں بے یقینی اور مایوسی کا دور دورہ تھا۔ بھوک افلاس کے ہاتھوں مجبور عوام کی معاشی حالت بھی نہایت دگرگوں تھی۔ اسی اقتباس میں انہوں نے اس تحریک کے ادب پر مرتب ہونے والے اثرات کی نشاندہی کی ہے اس تحریک کا ادب کی تمام اصناف بالخصوص نظم اور افسانے پر خاص اثر ہوا۔ ادب پر ترقی پسند تحریک کی یہ اثر پذیری صرف فکری حد تک محدود نہیں تھی بلکہ

اس نے فنی طور پر بھی ادب کو بہت متاثر کیا۔ فکری طور پر تو اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ موضوعات پر چھائی یکسانیت اور جمود ٹوٹ گیا اور ادب میں نئے نئے موضوعات دیکھنے کو ملے۔ فنی لحاظ سے ترقی پسند ادیبوں میں ہیئت پرستی کا رجحان ختم ہوا اور وہ صدیوں سے مروجہ ہئیت کے علاوہ بھی لکھنے پر آمادہ بہ مائل دکھائی دینے لگے۔ یہیں سے آزاد غزل اور جدید نثری نظم نے جنم لیا۔ ایک جگہ اس تحریک کے اثرات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> جن کے مزاج میں صدیوں پرانی روایت نے منفعل داخلیت پسندی اور خود رحمی کی خاصیت پیدا کر دی تھی وہ اب نہ صرف زندگی کے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے بلکہ ان سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے بھی آمادہ تھے۔ (۵)

اداجعفری کو ترقی پسند تحریک کے ایک انقلابی تحریک ہونے کا بھی بخوبی احساس تھا۔ ان کے خیال میں اس تحریک نے لکھنے والوں میں لکھنے کا ایک نیا رجحان پیدا کیا۔ صدیوں سے ادیب خود ترسی اور خود پسندی کا شکار چلے آرہے تھے، اس تحریک کے زیرِ اثر ادیبوں میں اپنی ذات کے سوا دوسروں کا دکھ درد محسوس کرنے کا رجحان بڑھا۔ یوں داخلیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری سے بھی کام لیا جانے لگا۔ اداجعفری کے خیال میں اس تحریک نے عام آدمی کی زندگی کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس تحریک نے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا تصور بھی پیش کیا۔ یہ ایک ایسا تصور تھا جس کی بنا پر اسے ملک گیر شہرت نصیب ہوئی اور ادبی حلقوں میں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

> اسی دوران میں مباحثے کے لیے ایک نیا موضوع ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی وجود میں آیا تھا۔ اس بحث نے ترقی پسند تحریک کے لیے ملک گیر تعارف اور عام آدمی کے سامنے اس کی ترجمانی کا کام بھی کیا اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ (۶)

اداجعفری کا خیال ہے کہ یہ تحریک ویسے تو انقلابی خیالات کی حامل تحریک تھی جس میں سچائی سے کام لیتے ہوئے زندگی کے حقائق پیش کیے گئے لیکن کچھ شاعروں ادیبوں نے نہایت بے باکی کا مظاہرہ بھی کیا۔

> میں اس شاعری اور ادب کی دلدادہ تھی جس کا اسلوب نو بہ نو تھا۔ یہ شاعری جو سچائیوں کی ترجمان تھی جو مظلوم کی طرف دار تھی اور خود اعتمادی بھی بخش رہی تھی۔ یہ آواز وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔ (۷)

اداجعفری کے بقول ترقی پسند تحریک ایک ایسی تحریک تھی جسے ابتداًمیں تو بہت مقبولیت حاصل رہی بعد میں تحریک کے خلاف ایک رد عمل اُٹھا۔ اس رد عمل کے کئی اسباب تھے مثلاً منشور کو نظر انداز کرنا، روسی ادب کی سستی نقل، اپنی زمین سے کمزور ناتا، ماضی سے انحراف، دوغلا پن، غزل کی مخالفت اورآمرانہ حکمت عملی وغیرہ۔ ترقی پسند تحریک میں سیاسی عوامل کی کار فرمائی پر معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس تحریک کی ادبی خدمات سے انکار ممکن نہیں بلاشبہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس تحریک نے اردو ادب کو بہت نامور اور قد آور شاعر و ادیب مہیا کیے لیکن اس تحریک کے انتہا پسند، سیاسی رویے سے بھی انکار ممکن نہیں۔ اداجعفری کے مطابق ترقی پسند تحریک کا یہی سخت گیر رویہ بعد میں اس تحریک کے زوال اور بہت سے شاعروں، ادیبوں کی اس تحریک سے علیحدگی کا باعث بنا۔ ”اس تحریک کا جو خالص سیاسی پہلو تھا اس سے اختلافات بھی اسی زمانے میں شروع ہو گئے تھے ان اختلافات کی ایک بڑی وجہ خود اس تحریک کے سرپرستوں کا انتہا پسند رویہ تھا۔“[۸] اس تحریک میں سیاسی عناصر کی کار فرمائی اور ترقی پسند رہنماؤں کے جارحانہ رویے کو اس کے زوال کا ایک باعث قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> آئندہ برسوں میں یہی سخت گیر رویہ اس عظیم الشان تحریک کے زوال کا باعث بنا۔ انحطاط اس وقت شروع ہوا جب ادیبوں اور شاعروں کو ترقی پسند اور رجعت پسند کے سرنامے دیے گئے۔ کچھ بہت بڑے نام اور کام ترقی پسندی کی فہرست سے خارج ہوئے بغیر یہ سوچے ہوئے کہ کوئی بھی حساس اور بیدار انسان رجعت پسند ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ بعد میں اس فیصلے پر اظہارِ تاسف بھی کیا گیا۔ [۹]

اداجعفری کو اپنے زمانے کے شعرا و ادباء کے فن و شخصیت سے بھی خوب واقفیت تھی ان کے ہاں فیض احمد فیض، ممتاز مفتی میراجی اور افتخار عارف جیسے شاعروں کے بارے میں نہایت تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ ایک جگہ ن۔م۔راشد اور میراجی پر فیض کی برتری ثابت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> فیض، راشد اور میراجی تینوں بہت بڑے شاعر تھے اور اپنا دائرہ اثر بھی رکھتے تھے لیکن عالم گیر سطح پر مقبولیت اور پذیرائی کا درجہ صرف فیض کو حاصل ہوا۔۔۔وہ لوگ جو فیض کے

سیاسی نظریات سے متفق نہیں تھے فیض کی شاعری کو رد کر دینے کا حوصلہ ان کو بھی نہیں تھا۔ (۱۰)

ادا جعفری نے ن۔م۔راشد، میر اجی اور فیض کو الگ پہچان رکھنے والا اور منفرد اسلوب کا حامل رجحان ساز شاعر قرار دیا ہے۔ ادا جعفری ان تینوں شاعروں کا تقابل اور تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ نَ۔م۔راشد کی شاعری میں فارسی زبان کی تمکنت تھی جبکہ میر اجی کی شاعری پر ہندی زبان کا اثر تھا۔ ان کے خیال میں فیض ان تینوں میں سے ادبی برتری کا حامل ایسا شاعر تھا جو سیاسی خیالات بھی رکھتا تھا تاہم اس دور کے کسی فرد میں فیض کی شاعری کو رد کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ ان کے دور کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو جس کا ذکر انہوں نے آپ بیتی میں نہ کیا ہو۔ ادا جعفری کا خیال تھا کہ صفِ اول کے تمام بڑے مصنفین کو اس مقام تک پہنچانے میں اس گھر کی خواتین کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔ تخلیق کے لیے گوشہ سکون اور فراغت کی ضرورت ہوتی ہے لہذا ہر اس عورت کا، جو یہ سب مہیا کرے اور تخلیق کار کے معمولات میں رخنہ نہ آنے دے، تخلیق میں بڑا حصہ ہے۔ نسائی ادب عہدِ جدید کی ادبی روایت کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔

آج دنیا بھر کی خواتین اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ادب کے ذریعے سماجی اصلاح میں بھی اپنا کردار نبھا رہی ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ عورت کے اس ادبی سفر کی ابتدا میں عورت کو کس قدر مخالفت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص کر جب مشرقی ممالک کی خواتین نے قلم ہاتھ میں تھاما تو ہر طرف ایک آہ و پکار مچ گئی۔ جوے، شراب اور کوٹھوں سے دلچسپی رکھنے والے مرد بھی جب مخالفت پر اتر آئے تو عورت کا ماتھا ٹھنکا۔ عورت کے اندر اپنے وجود کا احساس اور گہرا ہوتا چلا گیا اور یہیں اردو ادب میں نسائی ادب کی پختہ روایت نے جنم لیا۔ ادا جعفری کو عورت کے اس ادبی سفر کی صعوبتوں کا احساس تھا۔ ان کے مطابق یہ عورت کا اعتماد ہی تھا جس نے اس سفر میں اسے تقویت بخشی اور یوں پر اعتماد عورت اپنے آپ کو منوا کر رہی۔ ”عورت ایک ہی مہلت حیات میں کئی جیون جھیلتی ہے۔ قلم ہاتھ میں تھام لے تو جھمیلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔“(۱۱) ایک جگہ لکھتی ہیں:

> تخلیقی ادب عورت سے کچھ زیادہ ہی خراج طلب کر لیتا ہے کبھی کبھی ناقابلِ برداشت حد تک بھی مثلاً ورجینیا ولف، سلویا پلاتھ اور اپنے ہی شہر میں سارہ شگفتہ۔ اور بھی نام ہیں مگر

گنائے کسے جائیں۔ صدیوں کے اعمال نامے میں تو وہ لاتعداد بے نام خواتین بھی کہیں نہ کہیں موجود ہیں جو غبارِ وقت میں اپنی پہچان تلاش کرتی ہی رہ گئیں۔ ہم تو خوش نصیبوں میں ہیں۔ (۱۲)

خود ادا جعفری کو بھی ادبی سفر کے دوران کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا دور پابندیوں بھرا دور تھا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

شعر وادب کی دنیا میں، میں نے جو سفر شروع کیا تھا وہ شدید روایتی ماحول اور قدامت پسند روایتی پس منظر کی وجہ سے میرے لیے زیادہ ہی دشوار اور حوصلہ طلب تھا۔ پیروں میں قدیم رسم ورواج کی زنجیریں تھیں اور جنہیں توڑنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ (۱۳)

ادا جعفری نے خود کو درپیش تکالیف کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر خواتین کو بھی راہِ سخن میں پیش آنے والی ذاتی دشواریوں کا ذکر کیا ہے ادا جعفری اردو شاعری کی تاریخ میں سامنے آنے والی پہلی خاتون کے بارے میں لکھتی ہیں کہ میرا یہ مطلب نہیں کہ مجھ سے پہلے اردو شعر وادب کی دنیا میں عورت نے شاعری نہیں کی۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ تذکروں میں اٹھارویں صدی تک کی شاعرات کے نام بھی موجود ہیں اور انتخابِ کلام بھی۔ خاص کر ان میں مہ لقا چندہ بائی نمایاں ہے۔ چندہ بائی وہ پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ تھی جس کا دیوان ۱۷۹۸ء میں مرتب ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ غلام صمدانی گوہر نے "حیاتِ مہ لقا" کے نام سے ان کے حالاتِ زندگی بھی شائع کیے۔ ادا جعفری کے خیال میں تذکروں میں مہ لقا چندہ بائی کے علاوہ اور بھی کئی قادرالکلام شاعرات کے نام ملتے ہیں۔ تاہم ادا جعفری کا خیال ہے کہ ان اولین لکھنے والیوں کا تعلق اربابِ نشاط سے تھا۔

یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ خواتین کی شاعری کے ابتدائی دور کا جو کلام ہمارے سامنے آیا ہے ان میں زیادہ تر شاعرات کا تعلق اربابِ نشاط کے طبقے سے تھا جن کی راہِ سخن میں کوئی مجبوری حائل نہیں تھی۔ بات کرنا انہیں مشکل نہیں تھا۔ (۱۴)

ادا جعفری نے انیسویں صدی کے اواخر کو اردو شاعرات کا اولین دور قرار دیا ہے ان کے مطابق اس دور میں کئی ایسی شاعرات منظر عام پہ آئیں جن کا ذکر تذکروں میں موجود ہے اور ان کی شاعری قابلِ تحسین ہے۔ ادا جعفری نے بیسویں صدی کو اردو شاعرات کا دوسرا دور قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق یہ ایک خوش قدم عہد تھا جس

میں خواتین پر عائد پابندیاں کم ہوتی گئیں اور ادبی سفر کے لیے ان کی راہ ہموار ہوتی گئی۔ ادا جعفری کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں خواتین کے لیے رسالے بھی جاری کیے گئے جن کی وجہ سے ان میں ادبی ذوق بیدار ہوا اور انہوں نے نظم و نثر میں لکھنا شروع کیا۔ مگر اس دور میں خواتین کو آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع نہیں دیا گیا۔ انہیں بندشوں رکاوٹوں اور اندیشوں کا سامنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں خواتین کی شاعری اپنی اصل پہچان کرانے سے قاصر رہی۔ مجبوری کے تحت خواتین شاعرات نے شاعری میں روایتی اور تقلیدی رویہ اپنایا۔ ادا جعفری کے خیال میں عورتوں کی تو مجبوری ہوتی ہے لیکن اکثر مرد حضرات اپنی مرضی سے تقلید میں عمر گزار دیتے ہیں۔ خواتین کی شاعری کے تیسرے اور اہم ترین دور کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس تیسرے دور کا تعلق بھی بیسویں صدی سے ہے جو ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا مسلسل جاری ہے۔ خواتین کی شاعری کے تیسرے دور کا تعلق بھی بیسویں صدی سے ہے۔ ان کے خیال میں یہ دور مزید ارتقائی سفر طے کرتا ہوا آج تک جاری ہے۔ ادا جعفری لکھتی ہیں :"یہ جو شعر و سخن کا سفر ہے یہ اپنی ذات سے ہی شروع ہوتا ہے اور پھر حسبِ توفیق حیات اور کائنات تک پہنچتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"[۱۵] ادا جعفری کے مطابق شعر و ادب کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہ ایک انسان سے ہوتے ہوئے تمام مخلوقِ خدا تک پہنچتا ہے۔ ایک انسان کے ذاتی جذبات ہوتے ہوئے بھی آفاقیت کے عنصر کی بدولت یہ ادب تمام انسانوں کی جاگیر بن جاتا ہے۔ تاہم یہ انسان پر ہی منحصر ہے کہ وہ اس بحرِ بے کراں سے کس قدر مستفید ہوتا ہے۔ ادا جعفری کے مطابق اس بات کا فیصلہ بھی وقت ہی کرتا ہے کہ کس ادب کو حیات و کائنات کی وسعتوں تک رسائی ملتی ہے اور کون سا ادب عدم بے توجہی کا شکار ہو کر خاموشی اور سکوت کی دبیز تہہ کی نظر ہو جاتا ہے۔ ادا جعفری کے خیال میں "ہر سچے اور بڑے شاعر کی شاعری اس کی سوانح عمری ہوتی ہے۔"[۱۶] ادا جعفری کے خیال میں ہر بڑے شاعر کے ہاں خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت کی موجودگی بھی لازم ہے۔ ان کے خیال میں ہر ادیب و شاعر کا ادب اور کلام میں اس کے ذاتی حالات واقعات کا عکس بھی پایا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ادا جعفری خود بھی قیام پاکستان سے قبل لکھنے والوں کی صف میں کھڑی دکھائی دیتی ہیں اور ان کی یہ آپ بیتی بھی قیامِ پاکستان سے قبل کا ادبی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے اس پر ادا جعفری کے تاثرات سامنے لاتی ہے۔

۲۔ قیامِ پاکستان کے بعد کا ادبی منظر نامہ

ادا جعفری نے نہ صرف قیامِ پاکستان سے پہلے کا ادبی منظر نامہ پیش کیا بلکہ ان کے ہاں قیام پاکستان کے بعد کا ادبی منظر نامہ بھی نہایت صراحت سے بیان ہوا ہے۔ پاکستان کا ادبی منظر نامہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کراچی، لاہور، راولپنڈی اور اسلام آباد کی ادبی سرگرمیوں اور ادبی حلقوں کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا۔ ان کے یہاں پاکستانی ادیبوں کی ذہنی ہم آہنگی اور باہمی چپقلش پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ادا جعفری تقسیمِ ہند کے بعد لکھنے والوں کے ہاں کھوئے ہوؤں کی جستجو کی قائل ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے منان اللہ بیگ اور جمیل نشتر جیسے کئی ادیبوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ خود ادا جعفری نے بھی اسلام آباد میں سلسلہ کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی جہاں انہیں پاکستان بھر کے بڑے ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یوں ان کا یہ گھر ادبی شعور آپ بیتی کا بھی حصہ ٹھہرا۔ اسی طرح راولپنڈی اور کراچی کے قیام کے دوران بھی ادا جعفری شاعروں اور ادیبوں کے جھرمٹ میں رہیں۔ ان کی آپ بیتی میں بھی اس ادبی کہکشاں کا ذکر ملتا ہے۔

ادا جعفری نے راولپنڈی کے شب و روز کو یاد کرتے ہوئے وہاں کے ادبی ماحول کی بھی عکاسی کی ہے۔ راولپنڈی کے ایک ادبی حلقے پی ای این کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ مخفف تھا شاعر، مضمون اور ناول نگار کا۔ ان کے مطابق پی ای این ایک بین الاقوامی تنظیم تھی جس کی مطبوعات بھی شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اور اس کا نام شاعر، مضمون، اور ناول نگار کے انگریزی ناموں کے پہلے پہلے حروف منتخب کر کے رکھا گیا تھا۔ ادا جعفری کے ہاں شاعروں اور ادیبوں کے خاکے بھی نہایت مہارت سے کھینچے گئے ہیں اور ان کی ادبی سرگرمیوں پر بھی نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے خیال میں افتخار عارف ایک نہایت منفرد شاعر ہیں جن کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں لندن شہر مغربی دنیا میں اردو زبان کا مرکز بن کر ابھرا۔ اسی طرح سے نثار عزیز بٹ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے اس دور کے تنقیدی رویوں کا بھی ذکر کیا۔ اس آپ بیتی میں اس دور کی تنقیدی معیار پر ہونے والی بحث کے حوالے بھی ملتے ہیں جب تلخ لہجے اور تعصب پر مبنی تنقید کو تخلیق کا قتل عمد قرار دے کر اس کا قصاص طلب کیے جانے پر غور کیا جا رہا تھا۔

تلخ لہجے اور تعصب پر مبنی ایک مضمون سامنے آنے پر تنقید کے دائرہ کار پر نئی نئی بحث چھڑ گئی۔ ایسے میں تنقیدی رویوں پر ہر طرح کا اظہار خیال کیا جانے لگا۔ کسی نے اسے تخلیق کا قتل عمد قرار دیتے ہوئے قصاص طلب کرنے کی تجویز پیش کی تو کوئی مجرم کو سخت سزا دیتے ہوئے اس کا ہاتھ یا انگلی قلم کرنے کی تجویز پیش کرنے لگا۔ ایسے میں کئی ادیبوں نے اس تجویز کو غیر سنجیدہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا۔ نقاد کے حق میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ آزادی اظہار کی جرات ہی اچھی تنقید کی بنیاد ہے اور پھر نقاد بھی چونکہ ادیبوں ہی کی قبیل کا حصہ ہوتا ہے لہذا تھوڑی رعایت اسے بھی دی جانی چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے بھی نقاد کے حق میں صفائی پیش کی گئی کہ ایسے ناقدین کو سزا تو پہلے ہی مل چکی ہوتی ہے۔ اپنی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود ایک ایسی تخلیق کو پڑھنے کا تردد کرنا جو انسان کو پسند ہی نہ ہو، یہ بھی ایک سزا سے کم نہیں۔

نہایت اچھی تنقیدی بصیرت کی حامل ادا جعفری کے ہاں مختلف ادیبوں کے فن و شخصیت پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ انہوں نے ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور افتخار عارف جیسے تمام نامور شاعروں ادیبوں پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ممتاز مفتی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اسلام آباد کی ادبی دنیا میں مفتی جی اپنی ایک الگ ہی پہچان رکھتے تھے۔ یہ ایک افسانہ نگار تھے جن کے افسانوں کی دھوم قیامِ پاکستان سے پہلے بھی تھی اور بعد میں بھی۔ ادا جعفری ممتاز مفتی کی عالمگیریت اور آفاقیت کی قائل ہیں۔ ان کے خیال میں ممتاز مفتی وقت اور مقام کی قید سے آزاد ایک ایسے ادیب ہیں جن کا ادب ہر زمانے اور ہر دور کے لیے ہے۔

> مفتی جی تخلیقی ادب کا اتھاہ ساگر ہیں ان کا کمال یہ ہے کہ وہ وقت کی حدود سے آزاد ہیں۔ مختصر افسانے کے ابتدائی دور میں بھی ادیبوں کی پہلی صف میں موجود تھے اور آج جدید ترین افسانہ نگاروں کے گروہ کے سرخیل بھی وہی ہیں۔ (۱۷)

ادا جعفری صرف ان کی ادبی خوبیوں کی ہی معترف نہیں بلکہ وہ ممتاز مفتی کی شخصی خصوصیات کی بھی قائل دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں ممتاز مفتی کو غرور اور تکبر چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ ان کے خیال میں ممتاز مفتی ایک بے نیاز ادیب تھے جنہوں نے کبھی کسی کو مرعوب کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی بڑائیوں اور عظمتوں کا ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے انہیں سات پردوں میں چھپائے رکھتے۔ ممتاز مفتی کی ایک اور خوبی کا ذکر

کرتی ہیں کہ یہ خوبی بھی ممتاز مفتی میں موجود تھی کہ وہ نہایت ادب دوست اوراعلیٰ ظرف واقع ہوئے تھے۔ ان کے مطابق ممتاز مفتی ہمیشہ اپنے ساتھ بے شمار قلم رکھتے جب بھی کسی کو سر نہواڑے چپ چاپ بیٹھا دیکھتے تو فوراًایک قلم اس کے ہاتھ میں تھمادیتے۔ پھر اگر لاڈ، پیار سے کام نہ چلتاتو غصے اور دھونس سے کام لینے سے بھی دریغ نہ کرتے لیکن اگلے کو ہر صورت لکھنے کی طرف مائل کر کے ہی رہتے۔ ادا جعفری لکھتی ہیں کہ جب کوئی لکھنے پر آمادہ ہو جاتاتو ممتاز مفتی کی خوشی دیدنی ہوتی۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ قدرت اللہ شہاب کو ایک خاص وقت تک صاحبِ اسرار کہاجاتارہاتاہم ادا جعفری قدرت اللہ شہاب کے بارے میں کچھ شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہوئے اس پر بے یقینی کا تاثر دیاہے۔ تاہم ان کی شخصی خصوصیات کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں کہ عفو درگزر ان کی اہم خوبی تھی۔

مشہور مزاح نگار شفیق الرحمن کے بارے میں ان کا کہناہے کہ بظاہر خود ان کے چہرے پہ نہایت سنجیدگی اور متانت چھائی رہتی۔ گفتگو میں بھی بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے لیکن اپنی مزاحیہ تحریروں سے دوسروں میں خوشیاں بانٹنے کاکام انہوں نے نہایت سخاوت اوردریادلی سے سرانجام دیا۔ ادا جعفری نے "سلسلہ" کے نام سے خود بھی ایک ادبی حلقے کی بنیاد رکھی۔ اس کی پہلی ادبی محفل جنوری ۱۹۷۸ء کو ادا جعفری کے گھر منعقد کی گئی اس کے بعد باری باری اگلے تمام اراکین کے گھر۔ تمام اراکین ایک ایک ڈش بناکے اپنے ساتھ لاتے۔ اس محفل میں صرف وہی شریک ہو سکتا تھا جس کا ادب سے کوئی تعلق تھا۔ یہ تعلق براہ راست بھی ہو سکتا تھااور شریکِ حیات کے طفیل بھی رسائی ممکن تھی۔ جمیل نشتر، رفعت جمیل، مختار مسعود، عذرا مسعود، نثار عزیز بٹ، آغا ناصر، اصغر بٹ، ضیا جالندھری، شفقت ضیاء، سید ضمیر جعفری، مسعود مفتی، ممتاز مفتی، کرنل محمد خاں اور شفیق الرحمن کا شمار اس ادبی حلقے کے اراکین میں ہوتا تھا۔ اسلام آباد میں "سلسلہ" بڑا جیتاجاگتا سلسلہ تھا جسے یہ تمام اراکین اپنی شاعری اورافسانوں کے علاوہ اپنی پر رونق اور شگفتہ گفتگو سے بھی رونق بخشتے۔ اس سلسلے نے کئی لکھنے والوں کو باقاعدہ شاعر یاافسانہ نگار بنایا۔ مثلاً آغا ناصر جو اس سلسلے کے ذریعے ایک عرصے بعد دوبارہ لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے اور شفقت ضیاء جو لکھتی تھیں لیکن کم کم۔ سلسلہ نے انہیں باقاعدہ لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ ادا جعفری کے بقول اسی ادبی سلسلے میں مشترکہ افسانے کا تجربہ بھی کیاگیا۔ یوں مختلف لہجوں اور منفرد اسالیب کے حامل افسانے

منظر عام پہ آئے جو کہیں شائع تو نہ ہوئے لیکن یہ تجربہ نہایت خوش آئند رہا۔ دراصل مشترکہ افسانے کے تجربات بھی ادبی حلقوں میں کافی مقبول رہے۔ اس تجربے کے تحت اجتماعی افسانہ تشکیل دیا جاتا جس میں کہانی کے ربط و تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے تمام ادیب مل کر باہمی مشورے سے اسے آگے بڑھاتے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے شاعروں اور ادیبوں کے ہاں شہرت کی طلب نہیں تھی اور پڑھنے والوں کے ہاں بھی اصلی ادبی ذوق موجود تھا۔ آہستہ آہستہ ادیبوں کے دل و دماغ پر شہرت طلبی کی دھن سوار ہوتی گئی اور یہیں سے کتابوں کے افتتاح اور پذیرائی کے شوق نے سر اٹھایا۔ مشاعرے ہوتے تو اس کی روداد رسالوں اور اخباروں میں شائع کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ تاہم پھر بھی بہت سے ادیب ان جھمیلوں سے پاک رہے۔ ادا جعفری نے بھی جب ایک ادبی حلقے کی بنیاد رکھی تو وہ ان جھمیلوں سے بے نیاز رہیں۔ اس بارے میں خود لکھتی ہیں: " سلسلہ کسی شہرت طلبی کے لیے قائم نہیں کیا گیا تھا۔ ہمارے منشور کے مطابق شامِ سلسلہ کی روداد کسی اخبار میں شائع کرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ اس کی رکنیت بھی محدود تھی۔"[۱۸] ادا جعفری کے ادبی حلقے میں ممتاز مفتی بھی شامل تھے جن کی دلی خواہش تھی کہ اس حلقے کی روداد بھی کہیں شائع ہو تا کہ لوگ ان کی ادبی سرگرمیوں سے واقف ہوں۔ اس موضوع پر ممتاز مفتی نے نہایت دلچسپ انداز میں ادا جعفری کو قائل کرنے کی کوشش کی تاہم وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔ تنہائی پسند مزاج کی حامل ادا جعفری نے یہاں بھی اپنے مزاج دکھایا۔

> سلسلہ کا یہ الگ تھلگ قسم کا منظر نامہ مفتی جی کو برابر کھلتا رہا۔ کہتے آپ بچے کو پالنے سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیتیں، اس کی نشو نما کیسے ہو گی۔ میں گزارش کرتی، مفتی جی سڑک پر ٹریفک کا ہجوم ہے جو بچہ کچل گیا تو کیا ہو گا۔[۱۹]

ادا جعفری کے خاوند کا تبادلہ کراچی ہوا تو ادا جعفری کو یہ ادبی حلقہ چھوڑ کر کراچی جانا پڑا، جسے بعد میں ممتاز مفتی نے سنبھال لیا اور توسیع کے بعد اس کا نیا نام "رابط" تجویز کیا۔ ادا جعفری اسلام آباد میں جو جیتا جاگتا ادبی حلقہ چھوڑ کر گئی تھیں اس کا انہیں بہت قلق تھا۔ کراچی میں بھی انہوں نے "سلسلہ" کے نام سے ایک ادبی حلقے کی بنیاد رکھی جس میں جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، جمیل جالبی، شان الحق حقی، ہاجرہ مسرور اور لطف اللہ وغیرہ شامل تھے۔ ادا جعفری کا کہنا ہے کہ کراچی میں یہ ادبی حلقہ زیادہ نہ پھل پھول سکا جس پر مجھے مشتاق احمد یوسفی کی

اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ کراچی کا مزاج دوسرا ہے ادبی سلسلے کو راس نہیں آنے والا۔ کراچی میں "سلسلہ" کی صدارت ڈاکٹر جمیل جالبی کے سپرد کر دی گئی۔ ادا جعفری کی ڈاکٹر جمیل جالبی سے پہلی ملاقات "پاکستانی کلچر" نامی ایک تصنیف کے حوالے سے ہوئی اور پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ادا جعفری، ڈاکٹر جمیل جالبی کے فن و شخصیت پر اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ان کی یہ پہلی کتاب ہی نہیں بلکہ اگلی تمام کتب تحقیق و تنقید کی روایت میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادا جعفری کے خیال میں ڈاکٹر جمیل جالبی ایک نہایت ادب دوست ادیب واقع ہوئے ہیں جنہوں نے ادب کو دین ایمان کا درجہ دے رکھا ہے ایک جگہ لکھتی ہیں: "جس لگن اور محنت سے وہ مسلسل اردو ادب کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ انہوں نے ادب کو عبادت کا درجہ دے رکھا ہے۔"(۲۰) ڈاکٹر جمیل جالبی کی خدمات سے تو انکار ممکن ہی نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق و تنقید کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کراچی کے ادبی ماحول اور ادبی حلقوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جب کوئی ادیب کسی مجبوری کے تحت ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا تو اس کے لیے یہ روانگی بہت مشکل ثابت ہوتی۔ اس شہر کی ادبی وابستگیاں اس کے قدم جکڑے رہتیں خاص کر من پسند ادبی حلقوں کو چھوڑنا اس کے لیے اتنا آسان نہ ہوتا۔ ایسے میں یہ ادیب اس نئے شہر میں انہی حلقوں کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے۔ ان میں سے بیشتر ادیب اسی نام سے ایک نیا حلقہ بنا کر اپنی تشفی کا سامان پیدا کر لیتے۔ تاہم ادا جعفری نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ چونکہ ہر شہر کا مزاج جدا جدا تھا لہذا ادب کے پھلنے پھولنے کی رفتار بھی الگ الگ ہوتی۔ وہی حلقہ جو ایک شہر میں خوب پھلتا پھولتا اسے دوسرے شہر کا مزاج راس ہی نہ آتا۔

خود مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایک خاص دلکشی کی حامل ان کی تصانیف قاری کو اپنے سحر میں لے لیتی ہیں۔ مشتاق یوسفی کو ایک منفرد صاحبِ طرز مصنف قرار دیا ہے جن کا لکھا ہوا ہر لفظ ان کی انفرادیت کا گواہ ہے۔ ادا جعفری اپنے دور کے تحقیقی و تنقیدی روایت سے بھی واقف تھیں۔ اسی روایت سے تعلق رکھنے والے ادیب ڈاکٹر وحید قریشی کے متعلق لکھتی ہیں کہ ان کا تعلق لاہور سے تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی بیک وقت محقق، نقاد اور شاعر تھے۔ ڈاکٹر جالبی سے پہلے مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین تھے۔ ڈاکٹر

فرمان فتح پوری کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں کہ وہ اس دور میں اردو ڈکشنری بورڈ کے چیف ایڈیٹر تھے اور علم وادب اور تحقیق کے میدان میں ایک باوقار مقام رکھتے تھے۔ اداجعفری نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے نہایت گرانقدر اور وقیع تخلیقات کے ذریعے تحقیق و تنقید کے میدان میں نہایت اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کو بھی ایک عالم، محقق اور ادیب کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ "تحقیق، تنقید اور شاعری میں دواور اہم نام ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید کے ہیں۔ ملاقات ان سے کم کم ہوئی لیکن گفتگو ان کی نگارشات کے حوالے سے رہی ہے۔"(۲۱) اداجعفری کے ہاں شاعری کے اہم ناموں احسان دانش، جوش ملیح آبادی، فیض، ن۔م۔ راشد اور افتخار حسین عارف وغیرہ اورافسانے کے اہم ناموں منٹو، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم ان شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں ان کی رائے نہایت نپی تلی اور مختصر ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اداجعفری نے تمام شاعروں ادیبوں کی زندگی اور ادب کا مثبت پہلو پیش کیااور حالاتِ زندگی رقم کرتے ہوئے انہیں یاد رکھا۔

۳۔ بین الاقوامی ادبی منظر نامہ

اداجعفری کی آپ بیتی میں مغربی دنیا کا ادبی منظر نامہ بھی نہایت تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً انگلینڈ اور روس کا ادبی منظر نامہ نہایت مہارت سے پیش کیا ہے۔ یہ آپ بیتی سوانح کا رنگ بھی لیے ہوئے ہے جس میں نیو انگلینڈ کی دو شاعرات ایملی ڈکنسن اور سِلویا پلاتھ کو نہایت غیر معمولی خواتین قرار دیتے ہوئے ان کی زندگی اور ادب پر مکمل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

> نیو انگلینڈ کی ان دو شاعر خواتین سے میری ملاقات ان کی موت کے بعد ہوئی۔۔۔ دونوں کے درمیان قریباً ایک صدی کا فاصلہ ہے ایک کی رہائی کے لیے موت کو ازراہِ کرم اس کے پاس آنا پڑا، دوسری خود اپنے قدموں چل کر موت کے پاس گئی۔ ایملی ڈکنسن اور سِلویا پلاتھ دونوں کا تعلق نیو انگلینڈ سے ہے۔ (۲۲)

اداجعفری ان دونوں خواتین شاعرات کے حالات زندگی اورادبی مقام سے اچھی طرح واقف تھیں۔ ایملی ڈکنسن کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ اداس طبیعت کی مالک، نہایت تنہائی پسند اور گوشہ نشین شاعرہ تھی۔

اس نے کل دو ہزار سے زیادہ نظمیں لکھیں لیکن اس کی زندگی میں اس کی صرف سات نظمیں شائع ہوئیں۔ بقول اداجعفری ایملی ڈکنسن کو اس کی زندگی میں تو کوئی مقام نہ ملا البتہ اس کے مرنے کے بعد اسے خاص پذیرائی ملی۔ اس کی شہرت بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوئی اور اسے انیسویں صدی کی اہم شاعرات میں شمار کیا جانے لگا۔ اداجعفری نے ایملی ڈکنسن کو اس کی زندگی میں شہرت نہ ملنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کی شاعری کا مزاج اپنے ہم عصروں اور اس عہد سے بالکل مختلف تھا۔ دراصل اس شاعرہ کا انداز بیسویں صدی سے بالکل قریب تھا۔ اداجعفری لکھتی ہیں کہ اس دور میں مرصع کاری کی روایت ایک اہم روایت تھی جبکہ ایملی ڈکنسن کی شاعری میں فنکاری اور داد خواہی کی کوئی کاوش شامل نہیں تھی، اس نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے سادگی اور صداقت کو اپنایا۔ اداجعفری نے خود اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہیں اپنے طرزِ اظہار میں نہایت منفرد قرار دیا ہے۔ اداجعفری ایملی ڈکنسن کی شاعری اور زندگی دونوں میں ایک مانوس مشرقیت کی قائل ہیں۔ انہوں نے ایملی ڈکنسن کی شاعری کو اس کی زندگی کا روزنامچہ قرار دیا ہے۔ اداجعفری کا دعوی ہے کہ ایملی ڈکنسن جذباتی ناآسودگی کا شکار تھی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی ہوا۔ ان کی شاعری میں بھوک کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اداجعفری کے خیال میں بھوک ان کے یہاں محبت اور توجہ سے محرومی کا استعارہ ہے۔ اداجعفری نے اس شاعرہ کے حالات زندگی اور فکری وفنی خصوصیات پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ان کے بین الاقوامی منظرنامے سے واقفیت کا مکمل ثبوت ہے۔ اداجعفری نے انگلینڈ کی ایک اور شاعرہ سلویا پلاتھ کو بھی بطور ناول نگار اور شاعرہ متعارف کرایا ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ پہلی مغربی شاعرہ تھی جس نے پہلی بار کھل کر ایک باشعور مکمل عورت کے جذبات کو عورت کے نقطہ نظر سے پیش کیا۔ ان کے خیال میں سلویا پلاتھ مردوں کے قائم کردہ نظامِ حیات میں عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف سراپا احتجاج تھی۔

"خواتین کی شاعری میں نسائی زاویہ نگاہ کی جو تحریک چلی انقطے عروج تک یقیناً سلویا کی شاعری نے پہنچایا۔"(۲۴)

مزید ایک جگہ لکھتی ہیں: "اس نے عورت کی نامرادی اور مظلومی کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ اگرچہ وہ شاعری میں مردانہ اور زنانہ خانوں کے خلاف تھی۔"(۲۵) اداجعفری سلویا پلاتھ کی شاعری میں آفاقیت کی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ شاعری اعترافات کی حیثیت رکھتی ہے جو اگرچہ سلویا پلاتھ کے ذاتی تجربات واحساسات کی ترجمان

تھی لیکن اس نے دکھوں کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ شدتِ جذبات میں قاری کو بھی برابر شریک کرتی چلی جاتی ہے۔ ادا جعفری نے بین الاقوامی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے صرف ان دو شاعرات کے لیے ایک پورا باب مختص کیا ہے جسے "ایک سب آگ ایک سب پانی "کا نام دیا گیا ہے۔ "سلویا اپنے عہد کی ایک ایسی بے خوف اور توانا آواز تھی جسے نظر انداز کر دینا ممکن نہ تھا اسے اپنے دور میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی لیکن وہ اپنی کامیابی سے کبھی مطمئن نہیں ہوئی۔ "[۲۶] ادا جعفری کے ہاں نیو انگلینڈ کے اہم ادبا و شعراء کا ذکر ملتا ہے جن میں رابرٹ فراسٹ، مارک ٹوئن، ایمرسن، لانگ فیلو، وھنسر، برائٹ اور ہیریٹ ہیچر وغیرہ شامل ہیں۔

> نیو انگلینڈ جہاں اپنے قدرتی حسن و شادابی کے لیے مشہور ہے وہیں بہت سے باکمال بھی اپنے قیام سے اس کو وقار عطا کر گئے ہیں۔ رابرٹ فراسٹ اور مارک ٹوئن جیسے مشاہیر۔ ہیریٹ ہیچر جس نے غلامی کے نظام کے خلاف "انکل ٹام کا کیبن "نامی ناول لکھ کر غیر معمولی پذیرائی حاصل کی۔۔۔ اور بھی کئی بڑے نام ہیں جن کا کچھ نہ کچھ تعلق اور واسطہ اس علاقے سے رہا ہے۔ [۲۷]

نیو انگلینڈ کی ریاستوں میں قیام پذیر مشہور اہلِ قلم حضرات کے نہ صرف ناموں سے واقف تھیں بلکہ ان کی ادبی تخلیقات بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہیں۔ ادا جعفری کو جب کبھی موقع ملا تو ان میں سے کئی شاعروں ادیبوں کے گھر بھی گئیں۔

> ٹورانٹو میں ان ادیبوں اور شاعروں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جو اردو کی دنیا سے بہت دور امریکہ اور کینیڈا میں رہتے ہوئے اپنی شناخت بھی قائم رکھے ہوئے تھے اور اُردو زبان اور اُردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور اب تو ان شعرا کے کئی قابلِ ذکر شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ایک اجنبی ماحول میں اپنی تلاش کا عمل ہے۔ جس نے اشعار کا پر کشش لہجہ اختیار کیا ہے۔ [۲۸]

ادا جعفری کے ہاں امریکہ اور کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے والے بہت سے اہلِ قلم حضرات اور خواتین کا ذکر ملتا ہے ان میں بیدار بخت، رضا الجبار، حفظ الکبیر قریشی، اشفاق حسین زیدی، حمیرا رحمٰن، نیر جہاں،

عبدالقوی ضیاء، شاہین اور عرفانہ عزیز (ریاض) شامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ہم عصر ادبی روایت کا پتہ دیتی یہ آپ بیتی ادا جعفری کے زبان وادب سے لگاؤ اور ان کے ادبی شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ ادا جعفری نے آپ بیتی میں حالاتِ زندگی رقم کرتے ہوئے قارئین کو ادبی روایت سے بھی متعارف کروایا۔ یوں ادا جعفری نے آپ بیتی کے ذریعے نہ صرف مختلف ادباء و شعراء کو خراجِ تحسین پیش کیا بلکہ ہم عصر ادبی روایت کو بھی محفوظ کر لیا۔

ب۔ کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" میں عصری شعور کے ادبی تناظرات

کشور ناہید کی آپ بیتی اردو آپ بیتی کی روایت کے لیے ایک گراں قدر اور انمول سرمایہ ہے۔ جدت اور تنوع کی حامل اس آپ بیتی میں ادبی رنگ شامل کر کے کشور ناہید نے اسے ادب بیتی کا درجہ بھی دیا۔ بہترین تنقیدی بصیرت کی حامل کشور ناہید اپنی آپ بیتی میں ہم عصر ادبی و لسانی امور سے بحث کرتے دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کشور ناہید اپنی نوعیت کی واحد خاتون شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ وہ ایک ایسی دانشور ہیں جس نے اپنی عورت ہونے کی بجائے اپنے انسان اور فرد ہونے کو تسلیم کرایا ہے وہ عورت کو کسی خانے میں رکھ کر پرکھنے کی درپے ہیں نہ دکھانے کی۔ وہ صنفی مساوات کی علمبردار ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے ملک میں ایسا ماحول اور فضا پیدا کی ہے جس میں ادب کے زنانہ اور مردانہ ڈبوں کی تفریق ختم ہو گئی اور ادب تمام انسانوں کا ورثہ بن گیا۔ (۲۹)

ڈاکٹر رشید امجد کا یہ کہنا بالکل بجا ہے تحریک نسواں کی علمبردار اور امن وسکون کی بُجاری کشور ناہید انسانیت کی قائل ہیں۔ عورت کے حقوق کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ پہلے پہل عورت کے لکھنے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ مختلف سماجی تحریکوں کے زیرِ اثر خواتین نے لکھنا شروع کیا بھی تو مرد ذات کا لبادہ اوڑھ کر۔ ان خواتین نے یا تو اپنا نام ظاہر کیے بغیر لکھا یا پھر اپنے جزبات واحساسات مذکر کے صیغے کا استعمال کرتے ہوئے پیش کیے۔ تاہم کشور ناہید اس ہم عصر ادبی رویے کے خلاف تھیں۔ ان کے خیال میں عورت ہونا کوئی عیب نہیں اور نہ ہی اس کے جزبات واحساسات میں کوئی فرق ہے کہ پردہ پوشی اختیار کی جائے۔ کشور ناہید نے ادب کی صنفی تقسیم ختم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کی بات میں واقعی بہت وزن ہے ادب کو مرد یا عورت کے لیے

مختص کرنا سراسر نادانی ہے۔ کوئی بھی ادب خواہ کسی بھی خطے کا ہو، تمام بنی نوع انسان کے لیے ہونا چاہیے۔ کشور ناہید کے ادبی شعور پر نظر دوڑائی جائے تو ان کے ہاں کل تین طرح کے ادبی منظر نامے سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے کا ادبی منظر، قیامِ پاکستان کے بعد کا ادبی منظر نامہ اور بین الاقوامی منظر نامہ نہایت مہارت اور تفصیل سے پیش کیا ہے۔

ا۔ قیامِ پاکستان سے قبل کا ادبی منظر نامہ

کشور ناہید نے ہندوستان کے تمام نامور شاعروں اور ادیبوں کے نام گنوائے ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں ہم عصر ادبی حلقوں اور تحریکوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے شاعر اور ادیب اپنی اپنی دلچسپیوں کے عین مطابق مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ صوفی غلام تبسم اور فیض احمد فیض کے ادبی حلقے میں مسعود پرویز، خواجہ خورشید انور، ڈاکٹر حمید الدین اور شیر محمد صاحب کے علاوہ میر نسیم محمود اور ستنام محمود شامل تھے جبکہ احمد راہی، ظہیر کاشمیری، شادامر تسری، عدم صاحب اور غفور بٹ کا تعلق ایک دوسرے حلقے سے تھا۔ ہندوستان کے پابندیوں بھرے روایتی دور میں عورت نے روایت کے ہاتھوں مجبور ہو کے قلم کو ہاتھ نہ لگایا اور جب گنی چنی ایک دو خواتین نے قلم ہاتھ میں لیا بھی تو ہر طرف یہ نئی بحث چھڑ گئی، کیا عورت لکھ سکتی ہے؟ جب زیادہ تر نے عورت کو کم عقل ثابت کرتے ہوئے جواب نفی میں پیش کیا تو کشور ناہید کو کہنا ہی پڑا:

> مجھے غصے میں بڑبڑانے کی عادت ہمیشہ سے تھی۔ میں گھر پر بھی بھائیوں کے فقرے سنوں تو بلبلاؤں۔ بھلا عورت کیوں شعر نہیں کہہ سکتی۔ مگر کسی کے سامنے اپنے غصے کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ (۳۰)

کشور ناہید کی آپ بیتی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خیالات صرف عام آدمی تک محدود نہ تھے بلکہ شروع شروع میں کئی نامور ادیب و شاعر بھی انہی خیالات کے زیرِ اثر رہے۔ ہندوستان کے اسی ادبی ماحول کے بارے میں مزید لکھتی ہیں کہ اس تاثر نے لوگوں کے ذہنوں کو اتنی مضبوطی سے اپنے شکنجے میں لیا ہوا تھا کہ اگر کوئی مرد لکھتا تو دادِ تحسین پاتا لیکن اگر عورت لکھتی تو اس کی تخلیق پر نہایت بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے اسے شکوک و شبہات کے حوالے کر دیا جاتا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> یہ وہ زمانہ تھا جب ایک شاعرہ نے یونیورسٹی ہال کا مشاعرہ پڑھا تھا اور یونیورسٹی ہال کی کرسیاں اور دروازے ٹوٹ گئے تھے۔ اخباروں، ریڈیو اور رسالوں میں ذکر ہوا تھا اس مشاعرے کا۔ مگر ایک خندہ استہزا کے ساتھ۔ آنے بہانے یہ سوال اٹھایا جاتا تھا کہ اسے لکھ کر کون دیتا ہے۔ میرا چھوٹا سا ذہن یہ سوال سن کر غصے سے بلبلا اٹھتا تھا۔ (۳۱)

عورت کی تخلیق پر اس طرح کے تبصرے ہندوستانی مرد کی گھٹیا ذہنیت کے بہترین عکاس ہیں۔ وہ عورت کی ہر اچھی تخلیق سامنے آنے پر ہمیشہ اسے یہ کہتے ہوئے شک وشبہات کی نذر کر دیتے کہ عورت (کم عقل) ہوتے ہوئے یہ بھلا ایسا کہاں لکھ سکتی ہے۔ یقیناً کسی اور (مرد) سے لکھوایا ہو گا۔ کشور ناہید نے جہاں سماج میں عورت سے برتے جانے والے سلوک کی عکاسی کی وہیں ادبی میدان میں بھی ان کے ہاں عورت کے ساتھ روا رکھے گئے تمام رویوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے ہاں ادبی سطح پر عورت سے برتے جانے والے اس صنفی امتیاز پر غم وغصے کا اظہار ملتا ہے۔ آج اگر عورت کی تسلیم شدہ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے پیچھے ان تمام شاعروں ادیبوں کا بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے عورت کے حق میں آواز اٹھائی اور بلاشبہ کشور ناہید کی آواز ان تمام آوازوں میں نہایت توانا اور جاندار ہے۔

کشور ناہید نے جہاں ادبی رویے بیان کیے وہیں ان کے ہاں ہندوستان کے اہم لکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں اے حمید، منٹو، فیض، کرشن چندر، راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، واجدہ تبسم، جیلانی بانو اور مسرت نذیر وغیرہ شامل ہیں۔ مثلاً انہوں نے فیض احمد فیض کا ذکر کرتے ہوئے ان پر چلائے گئے مقدمے اور ان کو روس کی طرف سے عطا کردہ لینن پرائز کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ لینن پرائز ملنے کی خوشی میں فیض کی وطن واپسی پر ایک بڑا جشن منایا گیا۔ کشور ناہید کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ جوش کے مقابلے میں فیض احمد فیض کی صوفی غلام تبسم صاحب سے خاص قربت تھی۔ ذہنی ہم آہنگی ہونے کی بنا پر دونوں شاعر ایک دوسرے کے قریب تھے۔ دونوں میں مختلف موضوعات پر ادبی بحث بھی چلتی اور دونوں شاعر ایک دوسرے کو مشوروں سے بھی نوازتے رہتے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں کہ صوفی تبسم صاحب چونکہ اس زمانے میں خانہ فرہنگِ ایران کے منتظمِ اعلیٰ تھے لہٰذا فیض صاحب کی ان کے ساتھ فارسی

کی تراکیب پر بھی بحث ہوتی رہتی۔ خاص کر جن دنوں فیض احمد فیض، علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا اردو ترجمہ کر رہے تھے ان کی صوفی صاحب سے ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا۔ کشور ناہید کے مطابق یہ ملاقاتیں صلاح و مشورے کے لیے تھیں۔ کشور ناہید نے فیض احمد فیض کے خیالات کی بھی نہایت تفصیل سے وضاحت کی ہے ان کے مطابق فیض احمد فیض ایک غزل گو شاعر تھے جو جدید شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ "میں نے پوچھا: آپ کو جدید شاعری کی کتابیں کیسی لگیں بولے بھئی ہم ایسی شاعری نہیں کر سکتے۔" (۳۲) شاعری میں ہیئت کے نئے نئے تجربے کرنے والوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جدید شاعری کا رجحان پیدا ہوا۔ اس وقت نثری نظم لکھنے والوں میں زاہد ڈار، عباس اطہر، انیس ناگی اور ڈاکٹر خورشید الاسلام شامل تھے جبکہ آزاد غزل لکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی آزاد غزل لکھنے والوں میں مظہر امام سر فہرست تھے۔ ایک جگہ اے حمید کے بارے میں لکھتی ہیں: " اب صرف اے حمید ہے جو سلسلہ وار جاسوسی و دیگر ناول سینکڑوں کی تعداد میں لکھے جا رہے ہیں ۔ ہر نئی کہانی میں نئے کردار، بہروپ بدل بدل کر آتے رہتے ہیں۔"(۳۳) کشور ناہید کا اشارہ اے حمید کی ماضی پرستی اور روایت پسندی کی طرف ہے حقیقت نگاری کے تصور اور ترقی پسند تحریک کی آمد سے قبل جو ناول اور افسانہ تخلیق کیا جا رہا تھا اس میں مافوق الفطرت عناصر اور تجسس کی آمیزش لازمی خیال کی جاتی تھی تاہم ترقی پسند تحریک زیرِ اثر سوچ کا زاویہ بدلتے ہی ادبی روایت میں بھی ایک نیا موڑ آیا اور لکھنے والے زندگی کی طرف متوجہ ہو کر حقیقی مسائل پیش کرنے لگے تاہم اس دور میں بھی کئی لکھنے والے ایسے تھے جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے اثر کو قبول نہ کیا اور قدیم روایت برقرار رکھتے ہوئے غیر حقیقی ادب ہی تخلیق کیا۔ اے حمید کا شمار بھی انہی ادیبوں میں ہوتا ہے کشور ناہید کے مطابق باقی ادیبوں نے اگر اس روایت کو ترک کر بھی دیا تو اے حمید نے اسے آخری دم تک برقرار رکھا۔ احمد ندیم قاسمی کا ذکر رسالہ "فنون" کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ کشور ناہید کے خیال میں قاسمی صاحب کا بھی اپنا ہی ایک حلقہ احباب تھا جو رسالہ "فنون" کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ کشور ناہید کے مطابق قاسمی صاحب کا شمار ان معدودے چند ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں سب سے زیادہ دیباچے اور فلیپ لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ کشور ناہید کا کہنا ہے کہ اگر حساب لگایا جائے کہ سب سے زیادہ دیباچے اور فلیپ کس نے لکھے تو احمد ندیم قاسمی کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آئے۔ کشور ناہید تنقیدی بصیرت کی حامل ایک نہایت اچھی آپ بیتی نگار تھیں انہوں نے

اپنی آپ بیتی میں مختلف فنکاروں اور فن پاروں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ ان کی آپ بیتی میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ کس کی تحریر کتنی شستہ تھی۔ منٹو کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان کا ترقی پسند افسانہ نہایت گہرے مفہوم کا حامل تھا جو اکثر لوگوں کو پہلی بار پڑھنے میں تو سمجھ میں ہی نہ آتا۔ ان کے افسانہ نگاری پر سماجی رد عمل کا ذکر بھی کیا ہے کہ کس طرح لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور خود منٹو کو تو مقدمے کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کئی عورتوں کو منٹو کا افسانہ ہاتھ میں لینے پر عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ خود کشور ناہید نے جب ایک افسانہ پڑھا تو سمجھ سے بالاتر پاکر بھائی سے مفہوم پوچھنا چاہا جس پر انہیں گال پر ایک زوردار تھپڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر دور میں کسی نہ کسی سطح پر مشاعروں کا انعقاد ہوتا چلا آیا ہے۔ مختلف شاعروں کا ایک ہی مشاعرے میں کلام پڑھنا اور داد و تحسین حاصل کرنا بھی ایک ادبی روایت بن چکا ہے لیکن کشور ناہید نے ان مشاعروں کے اندرونی معاملات پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس آپ بیتی سے ادبی دنیا سے متعلق کچھ ایسی باتیں بھی سامنے آتی ہیں جو ایک غیر ادیب کے علم سے باہر تھیں۔ ان کے مطابق مشاعروں میں شعر پڑھنے کے لیے بھی شاعروں ادیبوں میں طرح طرح کے رویے پائے جاتے تھے۔ شاعر ادیب اکثر اس بات پر بھی بحث کرتے دکھائی دیتے کہ میں اس کے بعد پڑھوں گا تم اس کے بعد پڑھنا۔ کشور ناہید کے مطابق اس دور میں شاعر معاوضے کے عوض مشاعرے پڑھنے آتے تھے تاہم ان کو دیا جانے والا یہ معاوضہ بہت کم ہوتا اور ان کی گزر بسر مشکل سے ہی ہوتی۔ کشور ناہید کے مطابق اس زمانے میں کچھ شاعر ادیب تو ایسے تھے کہ مشاعرہ پڑھتے ہوئے نہایت رواں اور شستہ اُردو بولتے۔ ان کی اُردو گویا گنگا جمنی میں دھلی اُردو تھی۔ نہایت فراش اور چست محاورے بولتے تاہم کئی ایسے بھی تھے جن کی اُردو اتنی اکھڑ اور سخت تھی کہ اس پر اُردو خود حیران رہ جاتی۔ کشور ناہید نے نہایت اچھی اُردو بولنے والوں میں حکیم حبیب اشعر، احسان دانش اور اشرف صبوحی کو شمار کیا ہے جبکہ غلام رسول مہر کو نہایت خراب اور اکھڑ اُردو بولنے والوں کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

کشور ناہید لکھتی ہیں کہ مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے کی روایت بھی چلی اور خوب مقبول بھی ہوئی۔ اس شخص کی خوب پذیرائی ہوتی جو زیادہ ترنم سے پڑھتا اور ان کے خیال میں یہ روایت اتنی پھیل چکی ہے کہ اب تک برقرار ہے۔ ترنم سے پڑھنے والوں میں جمیل الدین عالی، ادیب سہارنپوری، قمر جلالوی، کلم عثمانی، قتیل شفائی،

ماہر القادری، حمایت علی شاعر، حفیظ جالندھری، زہرہ نگار، سحاب قزلباش اور حبیب جالب ان لوگوں میں ہیں جن کا ترنم بہت دل پذیر ہوتا تھا۔ البتہ خدا کی پناہ کہ جو لوگ طفیل ہوشیار پوری یا منور سلطانہ لکھنوی کا ترنم برداشت کر لیتے تھے۔ شاعروں کی باہمی چپقلش ایک پرانی بات ہے ایک ہی دور سے تعلق رکھنے والے شاعر وادیب جب کسی دوسرے کی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنی صلاحیتوں سے بہتر پاتے ہیں یا کسی دوسرے کے پاس مداحوں کی زیادہ تعداد دیکھتے ہیں تو یہ چیز اکثر ان میں رقابت کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور پھر اس رقابت میں بڑا ہاتھ ان کے مداحوں کا بھی ہوتا ہے۔ کشور ناہید کے دور میں بھی کئی شاعروں ادیبوں میں رقابت چلتی رہی۔ اس رقابت کا احساس کشور ناہید کو بھی تھا ایک جگہ لکھتی ہیں:

> لوگوں نے بہت کوشش کی فیضؔ صاحب اور راشدؔ صاحب کو لڑوانے کی۔ راشدؔ صاحب برہم بھی ہوتے تھے اور اس بات سے چڑ بھی جاتے تھے کہ لوگ فیضؔ صاحب کو بڑا شاعر ان کے مقابلے میں کیوں کہتے ہیں مگر فیضؔ صاحب سے جب بھی ذکر ہوا وہ ہمیشہ راشدؔ صاحب کی تعریف بھی کرتے تھے اور عزت بھی۔ (۳۴)

اس اقتباس سے ان شاعروں کی ادبی چپقلش بھی عیاں ہوتی ہے اور ان کی شخصی خصوصیات بھی سامنے آتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کی نظر میں فیضؔ کا مقام ن۔م۔ راشدؔ سے زیادہ بلند تھا۔ یہ بات جب ن۔م۔ راشدؔ کے سامنے دہرائی جاتی تو وہ بہت سیخ پا ہوتے۔ تاہم کشور ناہید کے مطابق فیضؔ صاحب کا ظرف بہت بڑا تھا اور وہ کھلے دل سے دوسروں کی تعریف کرنے والوں میں سے تھے۔ ایک جگہ ادا جعفری اور مصطفیٰ زیدی کے بارے میں لکھتی ہیں:

> جب آدم جی انعام ادا جعفری کو ملا اور مصطفیٰ زیدی کو نہیں ملا تو زیدی نے بڑی لمبی ہزل ادا بہن کے خلاف لکھی تھی۔ یہ مخالفت آج کل کے بے نام کھرّوں کی طرح نہیں ہوتی تھی بس کوئی فقرہ، کوئی خط، کوئی نظم، سینوں میں نفرتیں اس طرح نہیں پلتی تھیں۔ (۳۵)

کشور ناہید کے ہاں ہم عصر ادبی چپقلش کا ذکر بھی پایا جاتا ہے اور ان کے ہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ شاعروں ادیبوں کی باہمی چپقلش کے ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے خیال میں دراصل یہ ادبی چپقلش

ہی ہے جس نے ہجو گوئی اور ہزل گوئی کو جنم دیا۔یوں شاعر اور ادیب ارسطو کے نظریہ کتھارسس پہ عمل کرتے ہوئے دوسروں کے خلاف زہر اگل کر اپنے جزبات کی تطہیر کا عمل سرانجام دیتے ہیں۔کشور ناہید کے مطابق ادیبوں کے دلوں میں پلنے والی یہ کدورت ہمیشہ کے لیے نہیں تھی بلکہ یہ عمل صرف ایک آدھ تحریر ہی تک محدود تھا تاہم کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک آدھ بار معاملہ سنگین نوعیت بھی اختیار کر گیا اور شاعروں ادیبوں کی باہمی چپقلش اس نہج پہ آن کھڑی ہوئی کہ اکثر نوبت ہاتھاپائی تک بھی آ پہنچی۔اس سلسلے میں کشور ناہید حبیب جالب اور شورش کاشمیری کی مثال دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ان کے آپس کے تعلقات کافی خراب رہتے تھے اور ایک بار تو ان کے تعلقات اس قدر بگڑ گئے کہ نوبت ہاتھاپائی تک آگئی اور پھر لوگوں نے انہیں بھری مارکیٹ میں ایک دوسرے پر گھی کے ڈبے پھینکتے دیکھا۔

۲۔ قیامِ پاکستان کے بعد ادبی منظر نامہ

کشور ناہید کے ہاں قیامِ پاکستان کے بعد کا ادبی منظر نامہ بھی نہایت تفصیل سے سامنے آتا ہے۔ان کے مطابق قیام پاکستان کے فوراً بعد کا زمانہ شدید مارشل لاء اور ادب پر پابندیوں کا زمانہ تھا تاہم سنسر شپ کے اس زمانے میں بھی ادیبوں نے قلم تھامے رکھا۔سنسر شپ کے زمانے کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ہر تحریر اشاعت سے پہلے سنسر کے لیے بھیجی جاتی۔اس دور میں مضامین اور نام کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات بھی سنسر کی جاتیں۔ کشور ناہید کے مطابق پابندیوں بھرے اس دور میں پاکستانی صورتحال کے عین مطابق ترجمے کر کے شاعروں اور ادیبوں نے زیادہ تر ترجمے کے ذریعے کام چلایا۔اس پابندیوں بھرے دور میں شاعروں ادیبوں کے ادبی اظہار کے لیے اختیار کیے گئے باقی بھی تمام راستوں کی تفصیل سامنے آتی ہے۔۱۹۶۵ء کی جنگ کے ادب پر اثرات واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں جنگ کا یہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا اس جنگ کے ادب پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس دور میں ادیبوں میں قومی ترانے لکھنے کا سلسلہ چل نکلا۔۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم میں سے بیشتر ادیبوں نے ترانے لکھے اور ہندوستان کی جنگی تقاریر کا جواب دینے کے لیے خود ہی ذمہ داریاں لے لی تھیں۔علی سردار جعفری نے ہندوستان کے حق میں بڑی زوردار نظم پڑھی تھی۔ہم لوگوں نے اس کا جواب بھی دیا تھا۔اعجاز بٹالوی اور تجمل

حسین ایسے جوابات تیار کرتے تھے ،اس وقت شاکر علی کا رویہ بالکل مختلف تھا۔جنگ کے بارے میں ادبی رویے بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> مجھے تو چاند کی چاندنی، سرحد کے دونوں جانب نظر آتی ہے۔چڑیا بھی سرحد کی دونوں جانب ایک جیسا بولتی ہے۔مجھے لڑائی میں کوئی دانشمندی نظر نہیں آتی ہے۔بعد میں ہم سب کو اندازہ ہوا کہ واقعی لڑائی میں کسی دور میں بھی دانشمندی نہیں ہوتی ہے۔ (۳۶)

کشور ناہید نے انتظار حسین کو بطور کالم نویس اور ناول نگار متعارف کروایا ہے۔کشور ناہید انتظار حسین کی ادبی تخلیقات میں سماجی عنصر کی قائل ہیں ایک جگہ ان کی ادبی تخلیقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ انتظار حسین نے "آگے سمندر ہے" ناول کراچی کی بربریت پر تحریر کیا۔ان کی تحریروں میں ضیاء الحق کی پھیلائی گئی مذہبیت کے خلاف مزاحمت پائی جاتی ہے۔کشور ناہید نے انتظار حسین کی رجعت پسندی کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الحق کے دور میں سبھی ادیب اپنی تحریروں کے ذریعے ان کے چہیتوں میں شمار ہونے لگ لیکن پھر بھی کچھ ادیب ایسے تھے جنہوں نے خود کو ادیبوں کی اس منڈی میں پیش نہیں کیا۔نعت گوئی بھی ادبی روایت کا ایک اہم حصہ ہے جس میں مرد لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی حصہ لیتی رہی ہیں۔لیکن کشور ناہید کی آپ بیتی سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک زمانے میں عورت کی نعت گوئی پر بھی قدغن تھی۔کشور ناہید لکھتی ہیں:"یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور ریڈیو سٹیشن پر نعتیہ مشاعرے میں کسی خاتون کو مدعو نہیں کیا جاتا ہے۔اسی طرح سلام اور مرثیے کے موقع پر بھی تخصیص برتی جاتی۔"(۳۷)کشور ناہید کے مطابق بھٹو کے زمانے تک خواتین کی نعت گوئی پر بھی قدغن لگی رہی۔خواتین کی نعت گوئی سے پابندی اٹھائے جانے کے بارے میں لکھتی ہیں کہ بھٹو کے زمانے میں جب وزیرِ اطلاعات کوثر نیازی تھے ،ان کے سامنے خواتین لکھاریوں نے یہ کہتے ہوئے یہ مسئلہ اٹھایا کہ ہمیں وہ حدیث دکھادیں جس میں خواتین کو نعت پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔اس پر کوثر نیازی نے یہ بندش اٹھالی اور پھر نعت لکھنا گویا ایک فیشن بن گیا۔خاص کر ضیاء الحق کے دور میں ہر شخص نعتیہ مجموعے شائع کرا کے ضیاء الحق کی خدمت میں پیش کرنے لگا۔کشور ناہید کے ہاں پاکستان کے نوجوان لکھنے والوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور وہ اس بات سے واقف تھیں۔کئی شاعر اور ادیب ایسے ہیں جو نوجوان اور نئی نسل میں

نہایت مقبول ہوئے۔ کشور ناہید کو اس بات کا احساس تھا کہ کس کا مشاعرہ کتنا کامیاب رہتا اور کون کتنی داد وصول کرتا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> جو لوگ مشاعروں میں ناکام رہتے ان میں، میں خود، ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیار پوری، قیوم نظر مختار صدیقی اور یوسف ظفر کو دیکھا ہے۔ مجھے بھی کبھی بہت اچھی داد نہیں ملی مگر جس طرح ٹنوں کے حساب سے پروین شاکر داد وصول کرتی تھی وہ بات کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔ (۳۸)

نامور شاعر منیر نیازی کی زندگی میں ایک مشاعرہ نہایت اہمیت کا حامل ہے جس نے یکدم تمام محفل کو گل وگلزار بنادیا۔ قصہ کچھ اس طرح ہے کہ منیر نیازی نے پہلی بیوی کی وفات کے فوراً بعد دوسری شادی رچالی۔ کچھ دن بعد اتفاق سے وہ مشاعرے میں نہایت سرعت سے اپنی ایک نظم "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" پڑھ رہے تھے کہ محفل میں سے کوئی بے ساختہ پکار اٹھا کہ شادی میں تو دیر نہیں کی۔ اس مشاعرے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> مشاعرے کے ہجوم کی فقرہ بازی کمال کی اس وقت تھی جب منیر نیازی ۳۵ دن کے بعد اپنی بیوی کا چالیسواں کر کے ۳۶ویں دن نئی شادی کر چکے تھے اور مشاعرے میں نظم پڑھ رہے تھے میں۔ "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" انہوں نے نظم شروع کی تو پیچھے سے آواز آئی۔ شادی کرنے میں تو دیر نہیں کی۔ (۳۹)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشور ناہید پاکستانی مشاعروں کی ادبی فضا اور شاعروں ادیبوں کے حالات وواقعات سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کی ادبی دلچسپیوں میں کوئی کمی نہیں آنے پائی بلکہ ادبی سطح کے لیے ہموار پاکستانی فضا میں خود ان کی ادبی سرگرمیوں میں تیزی اور چستی دیکھنے کو ملی۔ مارشل لاء کے دوران انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا رہا لیکن ادبی سرگرمیوں پر مکمل بندش اس وقت بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی آمریت پسند حکمرانوں کی طرف سے لگائی گئی قدغن نے ان کے ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی۔ پاکستانی فضا میں ان کی اپنے ادبی جوہر بھی کھل کے سامنے آئے اور انہیں دیگر ادبی شاعروں ادیبوں تک بھی مکمل رسائی رہی۔

۳۔ بین الاقوامی ادبی منظر نامہ

کشور ناہید کے ہاں بین الاقوامی سطح کے کئی شاعروں ادیبوں کے بارے میں تفصیل ملتی ہے۔ جن میں سیمون ڈی بوار، لارنس، ہنری ملر، چیخوف اور اینا اضماتووا وغیرہ شامل ہیں ایک جگہ بنگال کی ایک خاتون شاعرہ خنا کو خراجِ تحسین پیش کرتے لکھتی ہیں کہ خنانامی اس خاتون کی شاعری بنگالی سکولوں کے نصاب میں بھی اسی طرح شامل ہے جس طرح ہمارے ہاں اردو کے نصاب میں غالب، اقبال اور فیض احمد فیض شامل رہے ہیں۔ کشور ناہید کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہندوستان کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی عورت کا ادبی سفر اتنا آسان نہیں رہا ایک جگہ لکھتی ہیں: ''سیفو اور اینا اضماتووا نے کہا ہم سے تو ہماری شاعری کے مسودے چھینے گئے، ہماری شاعری کو ملک کے لیے شرمناک سمجھا گیا۔''(۴۰) کشور ناہید کے ہاں سیمون ڈی بوار کی کتاب سیکنڈ سیکس اور اس کے اردو ترجمے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ کشور ناہید کی آپ بیتی میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ صرف ہندوستان پاکستان میں ہی شاعروں ادیبوں کو مقدمات اور پابندیوں کا سامنا نہیں رہا، بلکہ یہ ایک ایسی روایت ہے جس پر ہر عہد اور ہر ملک میں عمل ہوتا رہا ہے۔ لزبین تحریک کے حامل، آزادی اظہار کے داعئ مغربی ممالک میں بھی شاعروں ادیبوں پر فحش گوئی کا ٹھپہ لگا کر انہیں بین کیا جاتا رہا ہے۔ کشور ناہید نے سیمون ڈی بوار کی مثال دیتے ہوئے لکھا کہ حکومت نے ان پر بھی یہ کہتے ہوئے پابندی لگادی کہ ان کی یہ کتاب عورت کے بارے میں غیر اخلاقی باتیں پھیلانے کی ایک غلط اور مذموم کوشش ہے۔ کشور ناہید کے ہاں بین کیے جانے والے اور بھی کئی ادیبوں کا ذکر ملتا ہے ایک جگہ لکھتی ہیں:

> یہ بھی میرا مسئلہ نہیں کہ کیا شائع ہو سکتا ہے، کیا شائع نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی کافکا کو چیکوسلواکیہ میں شائع نہیں کیا گیا تھا۔ لوشوف، ماؤزے تنگ کے زمانے میں بین تھا اور اب ماؤزے تنگ کا ذکر نہیں۔(۴۱)

اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا کہ کشور ناہید کا مطالعہ نہایت وسیع تھا اور وہ بین الاقوامی منظر نامے سے خوب واقف تھیں۔ تنقیدی شعور کی حامل یہ آپ بیتی نگار خاتون بین الاقوامی نوعیت کے شاعروں ادیبوں کی فکری وفنی خصوصیات سے بھی واقف تھیں۔ چیکوسلواکین شاعر جروسلاڈ سیفر کی رومانیت پسندی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> چیکوسلواکین شاعر جروسلاڈ سیفر نے ایک نظم میں لکھا ہے محبت اتنی بڑی چیز ہے کہ چاہے سارے جہان میں انقلاب آجائے آپ کو کہیں نہ کہیں سبز گھاس پر دو عاشق ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سر جوڑے بیٹھے نظر آئیں گے۔ (۴۲)

چیخوف کی کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ ایک ایسا مصنف ہے جس نے عورت کو عزت بخشی اور اس کے حق میں آواز اٹھائی۔ کشور ناہید کے مطابق چیخوف نے اپنی کہانیوں میں ستم کی ماری ایک ایسی عورت پیش کی ہے جسے اپنی زندگی جینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ عورت ہمیشہ دوسروں کے لیے جیتی ہے۔ اسی طرح کشور ناہید نے فرائیڈ کے بعد بی ایف سکنر کو دوسرا مشہور ماہر نفسیات اور نامور ادیب قرار دیتے ہوئے اس کے ذاتی خیالات کی ترجمانی کی۔ ان کے مطابق بی ایف سکنر نے آزادی اور شہرت دونوں کو ایک ایسا سراب قرار دے کر مسترد کر دیا جس کے لیے کوشش بے سود ہے۔ کشور ناہید بین الاقوامی سطح کے ادبی نظریات اور تنقیدی مباحث سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ انہیں ادبی اصناف کی ہیئت کے مروجہ افکار و خیالات کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> آپ بیتی کے بارے میں مارگریٹ ایٹ ووڈ اور مایا انجلو کے نظریات و خیالات پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔ مارگریٹ ایٹ ووڈ اور مایا انجلو نے تو monologue کی شکل میں خود نوشت کو ناول کی نئی فارم قرار دیا جس میں پلاٹ ضروری نہیں۔ موضوع کی بنت ناول بنا سکتی ہے۔ (۴۳)

آپ بیتی کے بارے میں کئی طرح کے خیالات کا اظہار پایا جاتا ہے آپ بیتی اور دیگر اصناف میں کئی بار تقابل کرتے ہوئے ان میں مماثلتیں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ آپ بیتی میں افسانے کے عناصر دیکھنے کی بھی کوشش کی گئی اور مکتوبات نگاری کو بھی آپ بیتی کی قدیم شکل کہا گیا اسی طرح ناول اور آپ بیتی کا رشتہ جوڑنے کی کوشش بھی سامنے آئی کشور ناہید کا اشارہ اس طرف ہے جب آپ بیتی کو ناول کا ارتقا قرار دیا گیا۔ چونکہ ناول بھی ایک طویل کہانی پر مشتمل ہوتا ہے جس میں کئی طرح کے کردار ہوتے ہیں اسی طرح آپ بیتی بھی فرد کی زندگی پر مشتمل ایک طویل کہانی ہے اس کہانی کو مختلف کردار آگے بڑھاتے ہیں۔ کشور ناہید کے ہاں تین ادبی منظر ناموں

کی موجودگی ان کی عصری ادب سے مکمل واقفیت کو ظاہر کرتی ہے بحیثیت مجموعی کشور ناہید کے ہاں ادبی دنیا کی تمام تر گہما گہمی اور چہل پہل دکھائی دیتی ہے دورانِ مطالعہ ادبی ذوق کے حامل قاری کے لیے یہ انکشاف نہایت خوش ثابت ہوتا ہے کہ ایک پورا دور اپنی تمام تر ادبی سرگرمیاں سمیٹے اس کے سامنے موجود ہوتا ہے۔یوں کوئی قاری بھی کشور ناہید کے ادبی شعور کا قائل ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔

ج۔ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کے ادبی تناظرات کا تقابل

i۔ اشتراکات

ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں کئی باتیں مشترک پائی جاتی ہیں خاص کر ہم عصر ادبی رویوں کی عکاسی کرتے دونوں خواتین نے ایک جیسے ماحول اور ایک جیسے ادبی رویوں کی عکاسی کی۔ دونوں خواتین کے ہاں یہ بات مشترک ہے کہ ان دونوں خواتین کا ادبی شعور نہایت ہمہ گیر اور وسیع ہے۔ ادبی روایت اور ماحول سے ان کی یہ واقفیت صرف اپنے ملک کی سرحدوں تک محدود نہیں بلکہ ادب شناسی کے اس رجحان میں دونوں خواتین نے عالمگیریت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے دنیا بھر کے ادبی مزاج سے پردہ اٹھایا ہے اس سلسلے میں ان کے ہاں تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان دونوں خواتین نے ہندوستان، پاکستان اور بین الاقوامی ادبی منظر نامے کی صورت میں کل تین طرح کے ادبی منظر نامے پیش کیے ہیں۔

ملکی و غیر ملکی شاعروں اور ادیبوں کے تعارف سے مزین یہ دونوں آپ بیتیوں بہترین تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں جو مشہور زمانہ مختلف فن پاروں کی فنی و فکری خصوصیات سے بحث کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں بعض ہم عصر مقبول ترین تصنیفات پر تبصرہ آرائی کی گئی اور بعض سامنے آنے والی نئی تخلیقات پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا گیا۔

ان آپ بیتیوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ یہ آپ بیتیاں ان دونوں خواتین کے ادبی سفر کی ایک مکمل روداد ہیں۔ دونوں خواتین نے اپنے ادبی سفر میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے پورے ادبی سفر کی داستان رقم کی ہے نرگس بانو لکھتی ہیں: ”ادا جعفری کی خود نوشت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شعر و ادب کی دنیا میں

اردو شاعری کی خاتونِ اول کہلانے والی فنکارہ کن کٹھن اور دشوار گزار راستوں سے ہو کر اس مقام تک پہنچی ہیں۔"(۴۴) ان دونوں آپ بیتی نگاروں نے ادبی سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے ادبی سفر میں اپنے محسنوں کا ذکر بھی کیا اور اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ انہوں نے کب اور کس سے اصلاح لی۔ بحیثیت مجموعی یہ دونوں آپ بیتیاں ادبی سفر میں ان کے ساتھ برتے گئے رویوں کی داستان ہیں۔ ان دونوں آپ بیتیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دور میں عورت کو ادبی سفر میں کتنے منفی رویوں کا سامنا رہتا تھا۔

ایک اور قدر جو ان دونوں آپ بیتیوں میں مشترک ہے وہ شاعروں کی باہمی چپقلش کا بیان ہے۔ شاعروں کی آپس میں چپقلش کوئی نئی بات نہیں، یہ ابتدائے سخن ہی سے چلی آ رہی ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو لیکن ہر دور کے شاعروں میں ذاتی رنجش یا عداوت ایک تسلیم شدہ بات ہے۔ متعدد لکھنے والوں نے عصری شعور کے ادبی زاویے روشن کرتے ہوئے شاعروں کی باہمی چپقلش کو بھی صفحہ قرطاس پہ منتقل کیا۔ جہاں تک کشور ناہید اور ادا جعفری کا تعلق ہے تو ان کے ہاں بھی یہ قدر مشترک دکھائی دیتی ہے۔ خود ان دونوں خواتین نے بھی ہم عصر رجحانات قبول کرتے ہوئے کئی شاعروں ادیبوں کا آپس میں موازنہ کیا ہے۔ ادا جعفری نے فیض، ن۔م۔ راشد اور میر اجی کا تقابل کرتے ہوئے تینوں کی عظمت و بڑائی کا اعتراف کیا اور ان کا دائرہ اثر بھی قبول کیا۔ ان کا خیال ہے کہ عالم گیر مقبولیت اور پذیرائی کا درجہ صرف فیض کو حاصل ہوا۔ اسی طرح کشور ناہید نے بھی ن۔م۔ راشد اور فیض کا آپس میں تقابل کیا ہے۔ ان کے خیال میں بھی فیض زیادہ بڑے شاعر ہیں۔

دونوں خواتین آپ بیتی نگاروں کے ہاں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ دونوں کے ہاں ہم عصر ادبی اصناف پر رائے کا اظہار ملتا ہے۔ کشور ناہید نے نفسیاتی ناول، آپ بیتی، جدید نظم اور مختصر افسانے پر اپنے اور ہم عصر ادیبوں کے خیالات پیش کیے ہیں۔ کشور ناہید کے خیال میں نفسیاتی ناول ایک زمانے میں مقبول رہا لیکن اب اس کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ کشور ناہید کے دور میں آپ بیتی کا دیگر اصناف ادب سے تقابل کرتے ہوئے ان کے ساتھ مماثلتیں تلاش کرنے کا رجحان عام تھا۔ کشور ناہید نے اس رجحان کو لے کے آپ بیتی اور ناول میں مماثلت پر بات کی ہے۔ اس کے علاوہ کشور ناہید کے ہاں آپ بیتی اور ناول اسی طرح ادا جعفری کے ہاں بھی جدید نظم، غزل اور ترقی پسند افسانے وغیرہ پر رائے کا اظہار ملتا ہے۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں کئی شاعروں کی وفات ان کے جنازوں کی تفصیل اور ان کی وفات پر عوامی رد عمل بھی سامنے آتا ہے۔ان دونوں خواتین نے مقبول زمانہ ادبی تحریکوں کو بھی اپنی آپ بیتیوں کا حصہ بنایااور مختلف ادبی تحریکوں کاذکر کرتے ہوئے ان دونوں خواتین نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا اظہار کیا۔ دونوں آپ بیتی نگار خواتین معاصر ادبی ماحول اور ادبی رویوں سے اچھی طرح واقف تھیں۔

ان دونوں خواتین میں یہ قدر مشترک ہے ان دونوں نے اپنی آپ بیتیوں میں مختلف ہم عصر ادبی شخصیات کی مقبولیت کے گراف پیش کیے ہیں۔ تخلیقی صلاحیتوں کی مالک ان خواتین کو ہم عصر شاعروں،ادیبوں سے خوب واقفیت تھی کہ کون کس دور میں مقبول رہااور کون کس عہد کا شاعر یا تخلیق کار تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ تنقیدی بصیرت کی حامل ان دونوں خواتین میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ یہ دونوں شاعروں کی ادبی واسلوبیاتی خصوصیات سے بھی آگاہ تھیں۔یہ دونوں خواتین جانتی تھیں کہ ان کے ہم عصر لکھنے والوں میں کون کون شامل ہے اور کون کیااور کیسا لکھتا ہے۔

ii۔ افتراقات

اگرچہ ان دونوں آپ بیتی نگاروں کا تعلق ایک ہی عہد سے تھااورانہیں یکساں ادبی رویوں اورادبی تحریکات سے واسطہ رہاتاہم اس سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ ہر انسان کے دیکھنے کا انداز جدا جدا اور ہر کسی کا اپنانقطہ نظر ہوتا ہے۔چونکہ ان دونوں آپ بیتی نگاروں کا مزاج بھی بالکل جدا جدا تھا پھر ادبی دلچسپیاں اور رفاقتیں مختلف ہونے کے باعث ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے ہاں کچھ افتراقات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاًادا جعفری نے اپنے ادیبوں کی قبیل کاذکر کیاہے توکشور ناہید نے اپنے حلقہ ارباب کی تفصیل فراہم کی ہے۔ ادا جعفری کے ہاں شاعروں ادیبوں کا یہ بیان محدود ہے۔اس کے مقابلے میں کشور ناہید کے ہاں لامحدود نوعیت کا یہ بیان شاعروں ادیبوں کی ایک لمبی فہرست پر مشتمل ہے۔بالخصوص ان کی آپ بیتی کا دوسرے حصہ مکمل طور پر اسی موضوع کے لیے مختص ہے جس میں ۳۵ابواب باقاعدہ طور پر فن کے حوالے سے باعنوان کیے گئے ہیں۔ان میں سے ایک دو کا تعلق مصوری اور موسیقی سے جبکہ بیشتر کا تعلق ادب سے ہے۔کشور ناہید کے ہاں زندگی کے تقریباً تمام ادوار سے تعلق رکھنے والے ادبی معاملات ایک جگہ یکجا اور نہایت تیزی تسلسل اور روانی کے ساتھ یکے بعد دیگرے لگاتار

ملتے ہیں۔ اداجعفری کے ہاں معاملہ الٹ ہے۔ اداجعفری کے بر خلاف کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں شاعروں اورادیبوں کے اسکینڈلز اور کردار کشی کی روایت بر قرارر کھی۔ان کے یہاں شاعروں کی مے نوشی، عشق و معاشقے اور نامحرم عورتوں سے تعلقات پر بھی مکمل تفصیل ملتی ہے۔ان کے مطابق ادیبوں میں اپنی شاگرد شاعرات سے شادی کی ایک نئی روایت انتظار حسین سے شروع ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خوب مقبول ہوئی سجاد باقر رضوی، سید عابد علی عابد سے ہوتی ہوئی یہ تان بالآخر اصغر ندیم سید پہ آ کے ٹوٹی۔اسی طرح انہوں نے نامور شاعر صوفی تبسم کے گھر کو برائیوں کا ایک اڈہ ظاہر کیا ہے۔جہاں شراب کا دور خوب چلتا بقول ان کے صوفی صاحب کے ساتھ کئی عورتیں رہتی تھیں۔کشور ناہید کے مطابق ضیاء الحق کے دور میں جب معاشرتی برائیوں کے خاتمے کا رجحان بڑھا تو صوفی صاحب کے گھر کے باہر کوئی یہ بھی لکھ گیا: زانیوں اور شرابیوں کو پھانسی دو۔کشور ناہید کے بر خلاف اداجعفری نے شاعروں ادیبوں کے بیان میں خاطر خواہ لحاظ ملحوظ رکھا اور ان کی بے جا کردار کشی سے گریز کیا۔

کشور ناہید کے ہاں ہم عصر ادبی صورتحال کے بیان میں بھی لطف کا سامان ملتا ہے۔رنگارنگ استعاروں سے مزین کشور ناہید کا اسلوب نہایت دلچسپ اور چونکا دینے والا ہے۔اس کے بر عکس اداجعفری کے ہاں سادگی کا عنصر غالب ہے جو ان کی سادگی پسند طبیعت کا غماز ہے۔کشور ناہید اگر مشاعرے کا حال بھی بیان کرتی ہیں تو مشاعروں میں اچھالے گئے فقروں اوراپنی ذاتی مہارت کی مدد سے اپنی تحریر میں دلچسپی کا عنصر پیدا کر لیتی ہیں۔کشور ناہید کی آپ بیتی دورانِ مطالعہ قاری کی مکمل تشفی نہیں کر پاتی۔ بعض باتوں کے بیان میں انہوں نے قدرے اختصار سے کام لیا یوں اس آپ بیتی میں کئی وضاحت طلب باتیں سوالیہ نشان اٹھائی ہیں۔مثلاً لکھتی ہیں:

> ان دنوں صوفی صاحب کے ساتھ ایک خاتون رہتی تھیں وہ شاید کہیں پڑھاتی تھیں۔ہر چند صوفی صاحب کے ساتھ اس زمانے میں ایک اور خاتون رہ رہی تھی مگر صوفی صاحب بہت بے چین رہتے۔ (۴۵)

قاری پوری آپ بیتی پڑھ کر بھی یہ بات کبھی نہیں جان پاتا کہ صوفی صاحب کے ساتھ وہ خاتون کس تعلق کی بنا پر رہ رہی تھی؟ پھر صوفی صاحب کی بے چینی بھی قدرے تفصیل طلب دکھائی دیتی ہے۔ان دونوں آپ

بیتیوں میں ایک فرق اخلاقیات کا ہے۔ ادا جعفری نے ادبی معاملات کے بیان میں بھی ایک خاص لحاظ ملحوظ رکھا۔ ان کے یہاں وہ بے باک انداز دیکھنے کو نہیں ملتا جو کشور ناہید کی تحریر کا حصہ ہے۔ کشور ناہید نے شاعروں ادیبوں اور ہمعصر ادبی رویوں پر بھی بے دھڑک اور بے باک تبصرہ آرائی کی ہے۔ ان سلسلے میں انہوں نے غیر جانبداری سے کام لیانہ ہی کسی جھجک یا عداوت، دشمنی کے خوف کو پاس نہیں آنے دیا۔ ادا جعفری نے تمام تر محنت ادبی دنیا کا بھرم قائم رکھنے میں صرف کی۔ اس کے برعکس کشور ناہید ادبی دنیا سے وابستہ بہت سے تلخ حقائق بھی سامنے لاتی ہیں۔ ان کے مطابق بزرگ لکھنے والوں سے اگر کوئی اصلاح لینے آتا تو وہ نہ صرف اس بات پر فخر محسوس کرتے بلکہ ہر دوسرے کو یہ بات جتلاتے پھرتے اس کے لیے اکثر بزرگ شاعر اور ادیب دوسروں کو اصلاح لینے کے لیے مائل بھی کرتے دکھائی دیتے۔ اسی طرح ایک جگہ لکھتی ہیں: پھر ہر استاد کا یہ مقابلہ کرنا کہ یہ میری شاگردی کی چھاؤں میں دم لیتی ہے کہ نہیں ورنہ اس کا دم مار دیا جائے۔"(۴۶) اس اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اکثر نئے لکھنے والوں کو اصلاح کی پیشکش پر اصلاح لینے سے انکار بڑا بھاری پڑتا، جس کی انہیں قیمت چکانا پڑتی۔ شاعروں اور ادیبوں میں سے اکثر کے لیے یہ انکار عزت نفس کا سودا بن جاتی اور وہ دشمنی پر اتر آتے۔ اگرچہ یہ دشمنی ادبی سطح تک ہی محدود رہتی تاہم بہت سوں کو یہ بھگتان بھی بھگتنا پڑتا۔ ادبی دنیا سے متعلق ایسا ہی ایک اور انکشاف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> لکھنے والیوں کا تذکرہ، ان کے منصب (یعنی ان کے شوہروں کے منصب کے مطابق) ہوتا ہے۔ اگر شوہر اعلیٰ افسر ہے تو لکھنے والی سب کی بھابھی، بہت ہی اچھی، نیک اور سلیقہ شعار ہے۔ اگر شوہر اتنا بڑا افسر نہیں تو اس کی تحریر سے لے کر اس کا کردار تک مشکوک معلوم دیتا ہے۔ پھر نمبر ملتے ہیں خوبصورتی کے لحاظ سے۔ (۴۷)

کشور ناہید کے خیال میں ادبی روایت پر شاعرات کے ذاتی تعلقات، ان کی مالی حیثیت اور عہدے کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ کسی حد تک ان کی بات سچ ہے یہ تمام چیزیں بھی ادب کو متاثر ضرور کرتی ہیں تاہم ہر جگہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اگرچہ دونوں آپ بیتیوں میں شاعروں ادیبوں کے خاکے موجود ہیں تاہم ادا جعفری کے ہاں یہ خاکے اتنے جاندار اور واضح نہیں جتنے کشور ناہید کے ہاں ہیں۔ حاجرہ مسرور کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

لاہور کالج میں داخلہ لیاتوچند گھروں کے فاصلے پر ہاجرہ مسرور رہتی تھی۔کالج میں وقفے کے دوران ان سے ملنے چلی گئی۔وہ سفید ساڑھی پہنے اور سگریٹ پیتی بڑی مسحور کن لگیں۔انہوں نے بتایا کہ ان کے گھر کے باہر کئی لوگ ایک جھلک دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں وہ اس لیے موٹر کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتی ہیں۔ہم گھر سے باہر نکلے تو وہاں سب سنسان پڑا تھا۔ (۴۸)

کشور ناہید اپنی آپ بیتی میں ایک زیادہ اچھے خاکہ نگار کے روپ میں سامنے آتی ہیں خاص کر صوفی غلام تبسم اور حاجرہ مسرور کا کھینچا گیا خاکہ پڑھتے ہی قاری ان دونوں کو اپنے سامنے محسوس کرنے لگتا ہے۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ دونوں آپ بیتیاں اپنے دور کی ادبی صورتحال کی مکمل اور بہترین عکاس کے طور پہ سامنے آتی ہیں جن میں اہم ادبی رویوں تحریکوں اور رجحانات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔یہ آپ بیتیاں ادب بیتی کا درجہ رکھتی ہیں جن میں پورے برصغیر کا ادبی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ان دونوں آپ بیتیوں میں ادبی شعور کی یہ کارفرمائی لائق تحسین ہے جن میں بہت سی قدریں مشترک ہیں اور بہت سی قدریں ان دونوں میں مختلف ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۰

۲۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۸۵

۳۔ ایضاً، ص ۹۳

۴۔ ایضاً، ص ۸۶

۵۔ ایضاً، ص ۸۵

۶۔ ایضاً، ص ۸۵

۷۔ ایضاً، ص ۹۳

۸۔ ایضاً، ص ۸۷

۹۔ ایضاً، ص ۸۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۹

۱۱۔ ایضاً، ص

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۶۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۶۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۶۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۱۸۔ ایضاً، ۱۸۸

۱۹۔ ایضاً، ۱۸۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۱۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۴۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۴۴

۲۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۱

۳۰۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۶

۳۱۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، ص ۴۵

۳۲۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲

۳۳۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، ص ۳۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۹

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۸

۳۸۔ ایضاً، ص ۳۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۴۰۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰

۴۴۔ نرگس بانو، ادا جعفری شاعر و نثر نگار، انجمنِ ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵۷

۴۵۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰

۴۶۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۵

۴۷۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۵۶

۴۸۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، ص ۳۲

باب پنجم:

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

انسان صرف ایک مٹی کی مورت ہی نہیں بلکہ اسے مختلف جذبات بھی ودیعت کیے گئے۔ انسان کئی طرح سے ان جزبات کا اظہار کرتا چلا آیا ہے۔ ادب بھی ایک طرح کا اظہار ہی ہے۔ دراصل جزبات کا حروف کے قالب میں ڈھلنے کا دوسرا نام ہی ادب ہے۔ ادب صرف دلی جزبات کی صفحہ قرطاس پہ منتقلی تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ہمیشہ خارجیت کا مظہر بن کر ابھرا۔ ادب میں خارجیت کے اسی رجحان نے ادب میں عصری شعور کی اصطلاح کو جنم دیا۔ دراصل کسی بھی دور میں مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی و معاشرتی حالات اس دور کے ادب پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور یہی عوامل آئندہ ادب کی راہ ہموار کرتے ہوئے اس کے لیے موضوع کا تعین کرتے ہیں۔ ادب اور عصر کے مابین ایک گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ جس طرح کے حالات ہوتے ہیں ادب بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ کسی دور کے ادب سے ہی اس دور کے حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں کے رہنے والے لوگ کیسے تھے ان کی روایت و اقدار کیا تھیں؟ ان کی سماجی زندگی کیسی تھی اور ان کے مذہبی و سیاسی رجحانات کیا تھے؟ ہر دور کے شاعروں ادیبوں میں شعور کی روایت دیکھنے کو ملتی ہے جو کسی ایک صنف تک محدود نہیں بلکہ عصری شعور کی یہ روایت ہر صنف میں پائی جاتی ہے۔ خاص کر عصری شعور کا یہ عنصر آپ بیتی میں دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ آپ بیتی میں عصری شعور ہی وہ خاصیت ہے جس نے اسے خاص اہمیت سے ہمکنار کرتے ہوئے اعلیٰ درجے پر فائز کیا ہے۔ اگر کوئی ادیب آپ بیتی میں صرف "میں" کو مد نظر رکھے تو اس میں قارئین کے لیے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو گی کیونکہ رنگارنگ تہذیب اور متنوع رنگوں کا دلدادہ انسان یکسانیت سے بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ نئی دنیا کی کھوج میں رہا اور پچھلے زمانے کا ادب اسے ایسی سماجی روایات و اقدار اور طور طریقوں سے آشنا کراتا ہے کہ انسان پڑھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ کیا کبھی ایسا بھی تھا؟ یہی حیرت اور انکشاف اسے مزید مطالعے پر اکساتے ہیں۔

عصری شعور کی یہ روایت فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں بھی موجود رہی اور مکتوباتِ غالب بھی اس کا بہترین نمونہ ہیں۔ آگے چل کر سرسید تحریک، عصری شعور کی اس روایت کی راہ ہموار کرتی دکھائی دیتی ہے اس دور کے ناولوں میں یہ شعور بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ خاص کر مولوی نذیر احمد کے ناول عصری شعور کا بہترین ثبوت ہیں۔ انہوں نے سماجی اصلاح کا کردار خوب نبھایا۔ اردو ناول میں عصری شعور کی روایت برقرار رکھتے ہوئے منشی پریم چند، رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر نے بھی بہترین ناول تخلیق کیے جن سے اس دور کی سیاسی سماجی اور تمدنی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ اردو افسانے میں منٹو اور منشی پریم چند کے افسانے عصری شعور کے بہترین نمونے ہیں۔ منٹو کا "کھول دو"، "ٹھنڈا گوشت"، "موذیل" اور منشی پریم چند کی "پریم پچیسی" اور "خواب و خیال" وغیرہ ان کے دور کے مسائل اور حالات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اسی طرح شاعری کی صنف بھی اس سلسلے میں پیچھے نہ رہی اور اس نے بھی اس روایت میں اپنا کردار خوب نبھایا۔ شاعری میں فیض احمد فیض، میر تقی میر اور احسان دانش جیسے عصری شعور کے حامل شاعر ادبی سطح پر نمودار ہوتے رہے اور روایت کو آگے بڑھاتے رہے۔ اگر آپ بیتی میں دیکھا جائے تو آپ بیتی میں عصری شعور کی روایت نہایت قدیم ہے۔ ہر دور کے آپ بیتی نگاروں نے آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی رقم کی۔ آپ بیتی میں عصری شعور کی روایت پر نظر دوڑائی جائے تو یہ دو زمروں میں منقسم دکھائی دیتی ہے۔ کچھ آپ بیتیاں قیامِ پاکستان سے پہلے ہندوستان میں تحریر کی گئیں ان میں زیادہ تر دہلی لکھنو کی سماجی زندگی اور غدر کے حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل لکھی گئی آپ بیتیوں میں سب سے پہلے عصری شعور ۱۸۵۷ء کے غدر کے نتیجے میں اس وقت دیکھنے کو ملا جب جعفر تھانیسری کی آپ بیتی "کالا پانی" منظر عام پر آئی۔ اس آپ بیتی میں ہم عصر سیاسی، سماجی اور تہذیبی شعور کی عکاسی نہایت بہترین طریقے سے کی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے تناظر میں لکھی گئی اس دور کی تہذیبی جھلکیاں بھی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ جعفر تھانیسری نے جذائر انڈمان میں رائج رسم و رواج، عقائد و توہمات اور تہواروں کو بیان کرتے ہوئے ایک مکمل ثقافتی منظر نامہ تشکیل دیا جو اس عہد کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ عصری شعور کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے شہر بانو بیگم نے اپنی آپ بیتی "بیتی کہانی" پیش کی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر، دہلی کے فسادات، پاٹودی کی تباہی اور عوامی بغاوت پر روشنی ڈالتی یہ آپ بیتی بھی اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی مکمل

عکاسی کرتی ہے۔ عبدالغفور نساخ کی آپ بیتی "حیاتِ نساخ" بھی ایک ایسی آپ بیتی ہے جو عصری شعور کی روایت میں ایک اہم کڑی خیال کی جاتی ہے۔ ان کی آپ بیتی سے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی منظر نامہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں داستانِ غدر کے دوران ہندوستان کے گلی کوچوں سے لے کر دہلی کے محلوں تک کا حال ملتا ہے ۔اس آپ بیتی ہندوستانی تہذیب وثقافت کو اجاگر کرتے ہوئے سیاسی حالات واقعات کی بھی عکاسی کی گئی۔ مغل بادشاہوں کی رعایا پروری اور رحم دلی کا ذکر کرتے ہوتے مغلیہ سلطنت کے زوال، ہنگامہ غدر، باغیوں کے حال ، تیموری شہزادوں کے قتل اور ہجرت کے خون آشام حالات کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہیر الدین دہلوی عصری شعور کے حامل ایک بیدار ذہن اور حساس دل کے مالک آپ بیتی نگار تھے۔ حسرت موہانی کی "قیدِ فرنگ" بھی ہم عصر ادبی، سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کی مکمل روداد ہے۔ ابوالکلام آزاد کی آپ بیتی "تذکرہ" کے نام سے وجود میں آئی جس کا زیادہ تر زیادہ تر حصہ ہندوستان کے سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی مسائل پر مشتمل ہے۔ ان کی اس آپ بیتی میں آپ بیتی کم اور عصری شعور زیادہ ہے۔ خواجہ حسن نظام نے "آپ بیتی" کے نام کا ذاتی حالات وواقعات بیان کرتے ہوئے اپنے عہد کی تہذیب ومعاشرت اور سماجی رویوں کی بھی بہترین عکاسی کی۔ ان کی آپ بیتی میں کہیں بازار میں بکتے دلی کی عمارتوں کے نقشے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں مزاروں پہ مریدوں کا جمگھٹا نظر آتا ہے۔

بیگم وزیر سلطان نے اپنی آپ بیتی "نیرنگی بخت" میں تعلیمی نظام، وراثت کے جھگڑوں، ذرائع نقل و حمل، خواتین کے ازدواجی مسائل، شادی بیاہ کے رسم ورواج، اور ملبوسات وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے نہایت معروضی اور مدلل انداز میں تجزیہ پیش کرتے ہوئے جس مہارت سے اپنے دور کی جیتی جاگتی لازوال تصویریں کھینچی ہیں وہ ان کے عصری شعور کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سر رضا علی نے اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے "اعمال نامہ" کے نام سے ایک آپ بیتی پیش کی جس میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال، ہندو مسلم تنازعات، مسلمانوں کی تحریکِ آزادی، کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس، سانحہ مسجد کانپور، اردو ہندی تنازعہ، صحافت پر پابندیوں، جنوبی افریقہ کی لڑائی، پاک بھارت جنگ اور تقسیمِ بنگال جیسے تمام اہم معاملات پر تفصیل ملتی ہے۔

حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی "خون بہا" بھی ہندوستان کے علمی ادبی اور خانقاہی زندگی سے واقفیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس آپ بیتی میں ہندو مسلم تعصب، مسلمانوں کی تفرقہ پسندی اور نئی اور پرانی تہذیب کے ٹکراؤ کی نشاندہی کرتے ہوئے ملک کی مجموعی صورتحال پر رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں ملک و قوم کو اس وقت نہایت نازک حالات کا سامنا رہا۔ چودھری افضل حق کی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں عصری شعور زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے ہاں تحریکِ ترکِ موالات اور سول نافرمانی، ڈوگرہ راج، تحریک کشمیر کو موضوع بناتے ہوئے سیاسی حالات کی خرابی اور حکمرانوں کے ظلم و ستم کو اجاگر کیا گیا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے لکھنے والے ان سب آپ بیتی نگاروں نے عصری شعور کا ثبوت دیتے ہوئے ہندوستان کی اہم تحریکوں اور رہنماؤں کو بھی بیان کیا اور تفرقہ پرستی، ہندو مسلم تعصبات، گاؤکشی پر ہونے والے فسادات وغیرہ بیان کرتے ہوئے مذہبی صورتحال سے بھی پردہ اٹھایا۔ اسی طرح ان تمام آپ بیتیوں میں سماجی صورتحال کی عکاسی بھی نہایت خوبصورتی سے کی گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد لکھنے والوں میں عصری شعور کی یہ روایت اور زیادہ پھلتی پھولتی دکھائی دیتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد لکھنے والوں نے قیامِ پاکستان، ہندو مسلم فسادات، ہجرت اور مہاجرین کی بے سروسامانی کو موضوع بنایا اور تقسیم ہند کے سیاست اور سماج پر مرتب ہونے والے اثرات کی بھی نشاندہی کی۔ پاکستان کو استحکام حاصل ہونے تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ پاکستان میں استحکام اور جمہوریت کی آمد ہوئی تو آپ بیتی میں عصری شعور تو موجود رہا، موضوعات بدل گئے۔ مارشل لاء کے دوران ادب پر پابندی تھی اب گویا اسے زباں مل گئی اور پھر جلد ہی آپ بیتی مارشل لاء پر مشتمل اس دور کی ترجمان بن کر ابھری۔ پاکستان میں لگنے والے مارشل لاء، پاک بھارت جنگ، سقوطِ ڈھاکہ اور مسئلہ کشمیر ایسے مسائل ہیں جن پر تقریباً اس دور کے ہر آپ بیتی نگار نے لکھا۔ ان آپ بیتی نگاروں نے ذاتی حالات رقم کرتے کرتے پاکستان کے سماجی مسائل کی بھی نشاندہی کی اور کراچی کے حالات، دہشت گردی، پاکستان میں مغربی تہذیب کے اثرات وغیرہ بیان کرنے میں بھی آپ بیتی نگار پیچھے نہ رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جن آپ بیتی نگاروں میں عصری شعور دیکھنے کو ملتا ہے ان میں عبدالمجید سالکؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں عبدالمجید سالکؔ چونکہ پاک بھارت جنگ میں ایک جنگی قیدی بھی رہے لہذا انہیں اس دور کے حالات و واقعات کا بھی خوب اندازہ تھا۔ عصریت سے بھرپور یہ آپ بیتی عبدالمجید سالکؔ کے ہمعصر حالات واقعات کو قاری تک بھی پہنچاتی

ہے۔اس کے بعد رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی میں عصری شعور اپنی تمام تر حدتوں کے ساتھ اجاگر ہوا ہے۔ آغا جان کاشمیری کی آپ بیتی ''سحر ہونے تک'' کا شمار بھی ایسی آپ بیتیوں میں ہوتا ہے جو عصری شعور سے بھرپور اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی آپ بیتی ''میری دنیا'' ہم عصر ثقافتی دلچسپیوں اور کھیل تماشوں سے مزین ایک ایسی آپ بیتی ہے جو اپنے عصر سے نہایت ہم آہنگ اور قریب ہے۔اب تک جتنی بھی آپ بیتیاں سامنے آچکی تھیں۔ان میں عصری حقائق کی پیشکش میں سنجیدگی کا عنصر پایا جاتا تھا کرنل محمد خان کی آپ بیتی ''بجنگ آمد'' آپ بیتی کی روایت میں ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔اس آپ بیتی میں مزاح سے کام لیتے ہوئے عصری حقائق بالکل نئے انداز میں پیش کیے گئے اور قارئین کے لیے جنگ وجدل جیسے حالات واقعات کے بیان میں بھی لطف کی کیفیت پیدا کی گئی۔تاہم عصری تناظرات کو منفرد اور ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرتی یہ آپ بیتی ان کے عصر کو ہر پہلو سے اجاگر کرتی دکھائی دیتی ہے۔''بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل''میں تقسیم ہند کے بعد کی پاکستانی سیاست کا بھرپور جائزہ پیش کرتے ہوئے سیاسی قائدین کی کاوشوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا جائزہ پیش کیا ۱۹۶۵ءاور ۱۹۷۱ء کی جنگ اور مارشل لاء کے منظرنامے پر مشتمل اس آپ بیتی میں زیادہ تر ہم عصر سیاسی رویوں کی پیشکش ملتی ہے۔اس کے علاوہ احسان دانش نے ''جہان دانش'' اور کلیم الدین احمد نے ''اپنی تلاش آپ''میں مذہب،ادب،سیاست اور سماج پر بات کرتے ہوئے ملک کی مجموعی صورتحال کو اجاگر کیا۔مشتاق احمد یوسفی کی آپ بیتی ''زرگزشت'' بھی ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں عصری حالات وواقعات کی عکاسی دلچسپ اور پرلطف انداز میں کی گئی ہے تاہم اس میں طنز کا عنصر بھی شامل ہے۔اس طرح قیام پاکستان کے بعد آپ بیتی انتظار حسین سے ہوتی ہوئی ابراہیم خلیق ڈاکٹر رشید امجد،بانو قدسیہ اور ڈاکٹر سلیم اختر تک جا پہنچی لیکن اس میں عصری شعور کی یہ روایت برقرار رہی۔ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں نے اس روایت کو برقرار رکھنے میں اپنا کردار نبھایا۔لکھنے والوں کا تعلق خواہ سیاست سے تھا یا نفسیات سے،سماج سے حاصل شدہ تجربات نے انہیں عصری حقائق کی پیشکش میں خوب مدد دی۔مثال کے طور پر مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر سہیل احمد کی آپ بیتی۔''سچ اپنا اپنا'' ایک ایسی آپ بیتی ہے جو ان کے ہم عصر سماج کی نفسیات،بیماریوں اور ان کے نجی زندگی کے مسائل پر مشتمل ہے لیکن اس میں تہذیبی اور سیاسی رنگ بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔تاہم یہ بات صاف ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں عصری شعور کا عنصر ابتدا ہی

سے شامل رہا ہے اور آئندہ شامل رہنے کے قوی امکانات ہیں۔ دراصل ادیب کے لیے عصری حقائق سے چشم پوشی کسی طور ممکن نہیں۔

آپ بیتی کی اس روایت میں ادا جعفری اور کشور ناہید کا نام نہ لینا ان کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ ان دونوں خواتین نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہیں۔ بطور آپ بیتی نگار بھی انہوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ دراصل ان کی آپ بیتیوں میں صرف آپ بیتی ہی نہیں جگ بیتی بھی شامل ہے۔ ایک ہی عصر سے تعلق رکھنے والی ان دونوں خواتین کی آپ بیتیاں اپنے عصر کی بہترین روداد ہیں۔ ان دونوں خواتین نے عصر کے کئی رخ پیش کیے۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں اشتراکات بھی پائے جاتے ہیں اور افتراقات بھی۔ ان دونوں کے ہاں ذاتی حالات و واقعات پیش کرتے ہوئے بچپن کے قصے، کھیل کود، جوانی، شاعری کا آغاز، شادی، بیوہ ہونے کی داستان اور بچوں اور شوہر کے ساتھ گزری زندگی کی داستان نہایت تفصیل سے بیان ہوئی ہے جسے نجی و عائلی حالات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تاہم ان دونوں کے مابین ایک فرق سامنے آتا ہے کہ نجی و عائلی کوائف بیان کرتے ہوئے کشور ناہید نے کسی طرح کی پردہ پوشی سے کام نہیں لیا۔ ان کے ہاں ہر بات کا اظہار بیرونی ملامت و تحسین سے بے نیاز بے جھجک انداز میں پایا جاتا ہے جبکہ ادا جعفری کے ہاں قدرے پردہ پوشی اختیار کی گئی ہے۔ کشور ناہید کے ہاں عصری شعور کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کا مواد بھی وافر مقدار میں موجود ہے جبکہ ادا جعفری کے ہاں ان کے مقابلے میں آپ بیتی کا مواد قدرے کم ہے۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ کشور ناہید کے ہاں اپنے کم تر ہونے کا احساس پایا جاتا ہے جبکہ ادا جعفری کو دور دور تک اس احساس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ادا جعفری ہر شخص کی تعریف میں رطب اللسان دکھائی دیتی ہیں جبکہ کشور ناہید کے ہاں لوگوں کی خامیوں اور برائیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ زیادہ تر لوگوں سے شکوہ کناں دکھائی دیتی ہیں۔ ان دونوں خواتین نے ہم عصر سماج کی بھی بہترین عکاسی کی۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں سماجی ناہمواری پر گہرے دکھ کا اظہار ملتا ہے۔ ادا جعفری اور کشور ناہید دونوں کو سماج کے بدلتے رنگوں کا بھی احساس تھا وہ جانتی تھیں کہ سماجی سطح پر کہاں کہاں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں اسی بنا پر ان آپ بیتیوں میں سماجی تغیر کی نشاندہی بھی کی گئی۔ اس کے علاوہ ان دونوں آپ بیتیوں میں یہ قدر بھی مشترک ہے کہ دونوں آپ بیتی نگاروں نے عورت کے سماجی مقام کی نمائندگی کی۔ ان دونوں خواتین کے ہاں ہم عصر

نظریات، عقائد و توہمات، افکار و خیالات، آداب، برتاؤ وغیرہ سب پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ انہوں نے سماج کی مجموعی ذہنی و فکری حالت کا پتہ دیتے ہوئے سماجی زندگی کی مجسم تصویر میں خوبصورت تمدنی رنگ بھی بھرے اور اپنے تہذیبی شعور کا ثبوت بھی دیا۔ ان کے ہاں یہ بات بھی مشترک پائی جاتی ہے کہ ان دونوں کے ہاں کل تین طرح کے سماجی منظر نامے پائے جاتے ہیں۔ جن میں ہندوستان کا سماجی منظر نامہ بھی شامل ہے اور پاکستان کے سماجی منظر نامے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سماجی منظر نامہ بھی شامل ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کے ہندو مسلم مشترکہ سماجی نظام کی عکاسی نہایت وضاحت سے کی گئی ہے۔ جس میں دونوں خواتین نے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو اکٹھے اور مل جل کر رہتے دکھایا ان آپ بیتیوں میں سماجی رشتوں کا ایک مکمل جال بچھا نظر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں خواتین نے عصر کے معاشی حالات کی خرابی اور مختلف ذریعہ معاش کو بھی بیان کیا۔ ان کے ہاں ملک کی مذہبی صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے ہندو مسلم مشترکہ نظام، تفرقہ پسندی، راکھی بندھن اور ستی کی رسموں اور شب برات، ہولی، دیوالی جیسے مختلف تہواروں پر روشنی ڈالی۔ تاہم ان دونوں آپ بیتیوں میں یہ فرق واضح ہوتا ہے کہ ادا جعفری کے ہاں مذہب سے لگاؤ ملتا ہے جبکہ کشور ناہید ایک مذہب بیزار خاتون کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ادا جعفری کے ہاں دھیما دھیما جمہوری انداز جبکہ کشور ناہید کے ہاں انقلابی لہجہ اور باغیانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ ادا جعفری کھلم کھلا بغاوت کرنے سے ہچکچاتی ہیں ان کے ہاں دبا دبا احتجاج ملتا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں عصری شعور کا ظہور یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ دونوں آپ بیتیاں اپنے دور کی سیاسی صورتحال سے بھی پردہ اٹھاتی ہیں ان میں ہندوستان کی سیاسی تحریکوں، گاندھی، نہرو جیسے رہنماؤں، تحریکِ آزادی، تقسیمِ ہند، ہجرت اور فسادات پر روشنی ڈالی گئی۔ ان دونوں خواتین نے پاکستان کا سیاسی منظر نامہ تشکیل دیتے ہوئے صدر ایوب خاں، جنرل یحیٰی خاں اور جنرل ضیاء الحق، کے مارشل لاء پر مشتمل دور کی عکاسی کی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سیاست پر بھی روشنی پڑتی ہے جس کے تحت سیاست کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دیگر ممالک میں اب تک کتنی خواتین حکمرانی کے فرائض سرانجام دے چکی ہیں یا کتنے رہنما سیاست کے لیے قتل کیے جا چکے ہیں۔ وہاں کی آزادی اظہار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہاں ہر شخص کو قول و فعل کی مکمل آزادی ہے۔ ادا جعفری تو ایک مثال یہ بھی دیتی ہیں کہ وہاں الیکشن کے زمانے میں بھی آپ کو امیدواروں

کے خلاف بے دھڑک رائے پیش کرتے لوگ دکھائی دیں گے۔ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے ہاں یہ بات بھی مشترک ہے کہ انہوں نے سیاستدانوں کے حقوق و فرائض اور ان سے برتی جانے والی غفلت کا ذکر کرتے ہوئے ان سے پیدا ہونے والی عوامی مسائل کی نشاندہی کی۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق پسند وناپسند اور اظہارِ رائے کا بھی پایا جاتا ہے ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے مزاج اور پسند ناپسند میں واضح فرق پایا جاتا ہے یہ فرق علم، ادب اور زندگی کی ہر سطح پر نمایاں رہا۔یہی فرق سیاست میں بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ سیاست میں ادا جعفری نے یحییٰ خاں کی حکومت کو پاکستان کے لیے سب سے برا وقت قرار دیا۔اس کے برعکس کشور ناہید نے جنرل ضیاء الحق کے دور کو ہر لحاظ سے منفی ثابت کیا۔ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ادا جعفری کی نظر ملک کے مجموعی عروج وزوال پر رہی۔ انہوں نے معیشت کی ترقی کو حکومتِ وقت سے منسوب کرتے ہوئے مختلف حکومتوں کی کامیابی اور ناکامی کا جائزہ لیا جبکہ کشور ناہید نے سیاستدانوں کے رویے، اظہار کی پابندی اور ملکی قوانین کو لے کر ہر دور کا تجزیہ پیش کیا۔ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق اس بات کا بھی ہے کہ ادا جعفری کے ہاں سیاسی صورتحال کا احوال عام عوامی انداز میں بیان ہوا ہے لیکن کشور ناہید کے ہاں سیاسی صورتحال کے بیان میں بھی نسائی تحریک کے واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔

ان دونوں آپ بیتیوں میں ہم عصر ادبی صورتحال کی پیشکش نہایت اہمیت کی حامل ہے جس سے ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ ان کے عصری شعور کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کے ہاں کئی اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ان دونوں نے ہم عصر ادبی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے ایک جیسے ماحول اور ایک جیسے ادبی رویوں کی عکاسی کی۔دونوں خواتین کے ہاں یہ بات مشترک ہے کہ ان دونوں خواتین کا ادبی شعور نہایت ہمہ گیر اور وسیع ہے۔ان دونوں آپ بیتیوں میں عالمگیریت کا ثبوت دیتے قارئین کو عالمی ادب کے مزاج سے بھی روشناس کرایا گیا۔ان دونوں آپ بیتی نگاروں نے کل تین طرح کے ادبی منظر نامے پیش کیے جن میں ہندوستان اور پاکستان کا ادبی منظر نامہ اور بین الاقوامی ادبی منظر نامہ شامل ہیں۔ان میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ ملکی وغیر ملکی شاعروں اور ادیبوں کے تعارف سے مزین یہ دونوں آپ بیتیاں ان خواتین کی

بہترین تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں جو مشہور زمانہ مختلف فن پاروں کی فنی و فکری خصوصیات سے بھی بحث کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان دونوں آپ بیتی نگاروں کے ہاں یہ بات بھی مشترک ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے آپ بیتی کو ادبی سفر کی داستان بنا دیا۔ اس کے علاوہ ہم عصر ادبی رجحانات، اہم اصناف، شاعروں کی چپقلش ایسے اہم موضوعات ہیں جنہیں ان دونوں خواتین نے اپنا موضوع بنایا۔ کشور ناہید اور ادا جعفری دونوں خواتین کے ہاں ادیبوں کے خاکے ملتے ہیں تاہم کشور ناہید نے ایک ایک ادیب کے لیے پورا پورا باب مختص کر رکھا ہے جبکہ ادا جعفری کے ہاں یہ خاکے نہایت مختصر انداز میں کھینچے گئے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خاکے اگرچہ نہایت جاندار اور مکمل ہیں تاہم کشور ناہید کے ہاں کچھ ایسے سوال سر اٹھاتے ہیں جن کے جواب ان کی آپ بیتی میں قاری کو کہیں نہیں ملتے۔ ان دونوں آپ بیتیوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ادا جعفری نے ادبی دنیا کا بھرم قائم رکھا ان کے برعکس کشور ناہید نے ادبی دنیا سے وابستہ تلخ حقائق بھی پیش کیے اور ادبی دنیا کے مثبت و منفی تمام تر رخ پیش کیے۔ بحیثیت مجموعی یہ دونوں آپ بیتیاں اپنے عصر کی سچی اور رنگین تصویر پیش کرتی ہیں اس تصویر میں جھلکتے سیاست، سماج، مذہب اور ادب ان کے عصری شعور کا واضح اور بہترین ثبوت ہیں۔

ب۔ نتائج

ا۔ عصری شعور (Contemporary Consciousness) ایک ادبی اصطلاح ہے جس کے لیے عصری آگہی اور عصری حسیت کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس اصطلاح میں عصر سے مراد عہد یا زمانہ لیا جاتا ہے جبکہ شعور کے معنی جاننے اور سوجھ بوجھ رکھنے کے ہیں۔ عصر اور شعور سے مل کر ترکیب پانے والی اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کا کتنا شعور رکھتا ہے۔ باطن سے پھوٹنے والی ادب کی کرنوں میں خارج کا اثر بھی ہوتا ہے ادب اور عصر کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ کسی بھی دور کے حالات و واقعات ادب کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ یہ عصری شعور ہی کا کمال ہے کہ ادبی سطح پر شہر آشوب جیسی حقیقت پسند صنفِ ادب اور ترقی پسند تحریک جیسی عالمگیر تحریک

وجود میں آئی۔ادب میں عصری شعور کی کارفرمائی کی صورت یہ ہے کہ عصری شعور کے زیرِاثر شاعر اور ادیب شعوری یالاشعوری طور پر اپنے دور کے مختلف حالات وواقعات بھی ادب میں جزب کرتے چلے جاتے ہیں۔یوں ادب میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی حالات کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے اورادب عصری شعور کامرقع بن کر منظرِعام پر ابھرتا ہے۔

۲۔ آپ بیتی ایک ایسی صنف ہے جس میں داخلی دنیا کے سوتے خارجی دنیا سے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ بیتی صرف آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جگ بیتی بھی ہوتی ہے جس میں آپ بیتی نگار کا عہد بھی پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتاہے۔ آپ بیتی لکھنے والا چونکہ ایک ذی روح انسان ہوتا ہے اور انسان ایک ایسا معاشرتی حیوان ہے جو باقی دنیاسے کٹ کے نہیں رہ سکتا۔یوں آپ بیتی نگار جس سماج میں رہتاہے وہاں کے ماحول، مذہب، سیاست اوراسی طرح کے دیگر عوامل کااثر ضرور قبول کرتاہے یوں اس کے داخلی جذبات اور ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ ہم عصر حالات وواقعات بھی آپ بیتی کاحصہ بن کے ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اداجعفری اور کشور ناہید نے اپنی آپ بیتیاں تحریر کرتے ہوئے ہم عصر صورتحال کے بھی کئی زاویے پیش کیے۔ان کے ہاں ان کے دور کی سماجی صورتحال، سیاسی صورتحال اور مذہبی ومعاشی صورتحال کی عکاسی ملتی ہے۔ان دونوں آپ بیتیوں میں بہت سی اقدار مشترک اور بہت سے مختلف ہونے کی بناپر ان کاتقابل کیاجاسکتاہے۔اس مقالے میں بھی ان دونوں خواتین کے عصری شعور کو سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی تناظر میں پیش کرتے ہوئے ان کا آپس میں تقابل پیش کیاگیاہے۔

۴۔ اداجعفری کی آپ بیتی سے ان کی وسعت نظر اور بیدارذہنیت کا پتہ ملتاہے۔ان کی آپ بیتی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اداجعفری نہایت بہترین عصری شعور کی حامل آپ بیتی نگار ہیں جن کی آپ بیتی میں ان کے ہم عصر حالات وواقعات کی مکمل عکاسی ملتی ہے۔

۵۔ کشور ناہید کی آپ بیتی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کشور ناہید کی ہم عصر حالات وواقعات پر گہری نظر رہی اور انہوں نے ان حالات کو بے ساختہ اپنی آپ بیتی کا بھی حصہ بنایا۔ان کا عصری شعور بھی نہایت ہمہ گیر اور وسیع ہے جو اپنے دور کے تمام حالات وواقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۶۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں کے مطالعے اور ان کے تقابل سے یہ در بھی واہو تا ہے کہ عصری شعور کی حامل یہ دونوں آپ بیتیاں نہ صرف کئی اشتراکات کی حامل ہیں بلکہ ان میں کئی افتراقات بھی پائے جاتے ہیں۔

ج۔ سفارشات

۱۔ زیرِ نظر تحقیق میں، ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عصری شعور کا تقابل کیا گیا تاہم ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں نسائی شعور کا تقابل ایک ایسا موضوع ہے جس پر ابھی تحقیق کی گنجائش ہے۔

۲۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کے ہاں سفر نامہ نگاری کے آثار ایک ایسا موضوع ہے جسے موضوعِ تحقیق بنایا جاسکتا ہے۔

۳۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں کا اسلوبیاتی مطالعہ بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

۴۔ چونکہ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں خاکہ نگاری کا خاطر خواہ مواد موجود ہے لہذا ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں خاکہ نگاری کے عناصر کے حوالے سے بھی گنجائش موجود ہے۔

۵۔ جو رہی سو بے خبری رہی اور بری عورت کی کتھا دو ایسی آپ بیتیاں ہیں جن میں شخصیت نگاری کے عناصر دیکھتے ہوئے ان کا تقابل بھی کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

الف۔ بنیادی ماخذ

ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء

کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

ب۔ ثانوی ماخذات

ا۔ آپ بیتیاں

آغا جانی کاشمیری، سحر ہونے تک، امپیریل پریس، دہلی، ۱۹۶۴ء

احمد شجاع، حکیم، خون بہا، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

احسان دانش، جہانِ دانش، القائم آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۷۵ء

اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، گردِ راہ، کراچی المسلم پبلشرز، ۱۹۹۳ء

اختر الایمان، اس آباد خرابے میں، اردو اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

ادا جعفری، ساز سخن بہانہ ہے، غالب پبلشرز، طبع اول، ۱۹۸۲ء

اعجاز حسین، ڈاکٹر، میری دنیا، کارواں پبلشرز، الٰہ آباد، ۱۹۶۵ء

انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء

احمد بشیر، دل بھٹکے گا، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۳ء

بانو قدسیہ، راہِ رواں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

جاوید اقبال، ڈاکٹر، اپنا گریباں چاک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

جعفر تھانیسری، کالا پانی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

جوش ملیح آبادی، یادوں کی بارات، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء

حمیدہ سالم، شورشِ دوراں، ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۱ء

رضیہ بٹ، بچھڑے لمحے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

ساقی فاروقی، آپ بیتی پاپ بیتی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۸ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

ستیہ پال آنند، کتھا چار جنموں کی، کلاسک آرٹ پریس، دہلی، ۲۰۱۳ء

شہر بانو بیگم، بیتی کہانی، القمر انٹر پرائزز لاہور، ۱۹۹۵ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، یادِ عہد رفتہ، ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۸ء

عبد الماجد دریابادی، آپ بیتی، ابو الحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس لکھنو، ۱۹۷۸ء

قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷،

کلیم الدین احمد، ڈاکٹر، اپنی تلاش میں (جلد اول)، کلچرل اکادمی، گیا، ۱۹۷۵ء

گوپال متل، لاہور کا جو ذکر کیا، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۷۱ء

مرزا ادیب، مٹی کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء

۲۔ شاعری

الطاف حسین حالی، دیوان حالی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۳ء

مرزا غالب، دیوان غالب، غالب اکیڈمی نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

۳۔ تنقید

احتشام حسین، پروفیسر، تنقیدی جائزے (مضامین)، احباب پبلشرز لکھنو، طبع سوم، ۱۹۵۱ء

حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۶ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے (مضامین)، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۵۱ء

کشور ناہید، خواتین افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

نرگس بانو، ادا جعفری شاعر و نثر نگار، انجمنِ ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۶ء

وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر، امت پرکاشن، راجستھان، ۱۹۸۱،

۴۔ مقالہ جات

اطہر قسیم،ڈاکٹر،اردوادب کی آپ بیتیاں، تحقیقی و تنقیدی جائزہ،مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز اسلام آباد،۲۰۰۷ء(غیر مطبوعہ)

شبانہ سلیم ،ڈاکٹر،اردو میں خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں؛تجزیاتی مطالعہ ،باب العلم پبلی کیشنز،دہلی، ۲۰۱۵ء(مطبوعہ)

محمد نوشاد عالم،اردو خودنوشت سوانح حیات: آزادی کے بعد، عرشیہ پبلی کیشنز،دہلی ۱۹۹۵ء(مطبوعہ)

وہاج الدین علوی،ڈاکٹر،اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،دہلی،۱۹۸۹ء(مطبوعہ)

۵۔ رسائل وجرائد

آج،کراچی،شمارہ:۵۲،فروری ۲۰۰۵ء

اردوزبان،شمارہ:۱۹۸۷،۱۱،۱۲ء

الزبیر(آپ بیتی نمبر)،بہاولپور،اردواکادمی،۱۹۶۴ء

تکبیر،کراچی،۳۰مارچ ۱۹۹۵ء

خدابخش لائبریری جرنل،پٹنہ،۲۰۰۲ء

علامت،لاہور،شمارہ:۸،اگست ۱۹۹۳ء

نگار،(سالنامہ)اداجعفری نمبر،۱۹۹۸ء

نقوش(آپ بیتی نمبر)،لاہور،شمارہ:۲،ادارہ فروغ اردو،جلداول،۱۹۶۴ء

۶۔ لغات

وارث سرہندی،جامع علمی اردو لغت،سردار محمد پبلشرز،لاہور،۱۹۷۹ء

Oxford English Dictionary, Oxford University Press, United Kingdom, 1970

۴۔ ویب گاہیں(انٹرنیٹ ذرائع)

www.wikipedia.org
www.urdulinks.com
www.avadhnama.com

www.iqbalcyberlibrary.net
www.nawaiwaqt.com.pk
www.zabanoadab.gcuf.edu.pkf